

ہماری کتابیں

(جو اس وقت مل سکتی ہیں)

مولانا	شوکت تھانوی	۳/۸
بازار حیات	احمد ندیم قاسمی	۳/-
صاحب	محمد طفیل	۳/-
امراؤ جان ادا	رسوا	۳/-
اندازے	فراق گورکھپوری	۵/-
منٹو	ابو سعید قریشی	۳/-
اُردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	[illegible]/-
تاملات نیاز	نیاز فتحپوری	۲/۸
اصحاب کہف	نیاز فتحپوری	۱/۱۲
آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
پندرہ آگست	رشید اختر ندوی	۳/-
رخسانہ	حبیب اشعر	۲/-
آبلے	احمد ندیم قاسمی	۳/-
سرکنڈوں کے پیچھے	سعادت حسن منٹو	۳/-
عزیزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/-
جان عالم	شرر لکھنوی	۲/۸
پانچ ناولٹ	مرتبہ وقار عظیم	۳/۳
سانچ کو آنچ	شوکت تھانوی	۳/-۸
سسرال	,,	۲/۳
مضامین شوکت	,,	۲/۸
غزالہ	,,	۶/-
قاضی جی اول، دوم، سوم	,,	۱۰/۸
غالب کے ڈرامے	,,	۲/۸
جوڑ توڑ	,,	۳/[illegible]
بقراط	,,	۲/۸
خدانخواستہ	,,	۲/-
کتیا	,,	
وغیرہ وغیرہ	,,	
کارٹون		۳/۸
مابدولت		۳/-







قاضی عبد الغفار



زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش لاہور

۵۵، ۵۶

مارچ سنہ ۵۶ء

مرتب

محمد طفیل

سالانہ قیمت
۲۰ روپے

قیمت موجودہ پرچہ
دو روپے

ادارۂ فروغِ اُردو، لاہور

ترتیب

مقالات

ادب کے معمار

(۱)

اردو کا پہلا ناول نگار (ڈپٹی نذیر احمد)

یادِ مجاز

نظم

مکاتیب

مطالعہ

نظمیں، غزلیں

افسانے

نئی کتابیں

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر ایڈیٹر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

محمد طفیل

افسانہ نمبر کی ضخامت اور قیمت کو ذہن میں رکھ کر خیال یہ تھا کہ ادب کی خدمت کے شوق میں مارے جائیں گے — بات تھوڑے سے ہیر پھیر کے ساتھ پوری ہوتے ہوتے رہ گئی۔ نقصہ یہ ہوا کہ سجاد ظہیر کے افسانہ "نیند نہیں آتی" میں چند ایسے فقرے چھپ گئے تھے جو واقعی کسی صورت میں بھی نہیں چھپنے چاہئیں تھے۔ سہواً جو کچھ ہوا اس کی صدقِ دل سے معذرت!

اس پر "ہنگامہ" برپا ہو گیا۔ اگر اس "ہنگامے" کی تہ میں صرف حُبِّ رسولؐ اور خدائے قدوس کی محبت ہی شامل ہوتی تو میرے دل میں اپنے دوستوں کی عزت بڑھ جاتی — اب بھی ممنون! — اگر برادرم شورش کاشمیری (ایڈیٹر چٹان)، اور محترم حمید نظامی (ایڈیٹر نوائے وقت) بروقت مدد نہ کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ادب کے اس خادم گنہگار کو ذاتی رنجشوں ہی کی بنا پر ہمیشہ کی نیند سُلا دیا جاتا۔

بفضلِ خدا، آج جبکہ وہ "ہنگامہ" قریب قریب ختم ہو چکا ہے، میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جن "دوستوں" نے میری اس نادانستہ کوتاہی کو اتنی ہوا دی تھی — کیا وہ مجھ سے زیادہ مسلمان ہیں؟ — اور کیا ان کے دل میں مجھ سے زیادہ خدا اور رسولؐ کی محبت ہے؟ — اس کا جواب اس دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ اس کا فیصلہ خدا و رسولؐ ہی کی بارگاہ میں ہو گا۔ جن کا نام لے کر یہ سب کچھ ہوا — یا ہونے والا تھا۔

بعض "دوستوں" نے محض کاروباری رقابت کے شوق میں مجھے گالیاں دے کر، کمیونسٹ کہہ کر، غدارِ وطن بنا کر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لی ؎

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

موجودہ شمارہ

قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ میں اس نمبر کو ویسا نہ بنا سکا جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ کام کے بہت سے دن ذہنی پریشانیوں میں گذر گئے — اس کے باوجود میں نے اس عام نمبر میں بھی یہ التزام رکھا ہے کہ مختلف موضوعات پر مضامین چھاپنے کے بجائے چند مضامین مخصوص موضوع پر ضرور ہوا کریں۔ اس کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد سے ہوئی ہے۔ اس طرح یکے بعد دیگرے اردو کے ہر محسن پر مسلسل دس دس بارہ بارہ مضامین پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ منزل کٹھن، مگر حصول ناممکن نہیں۔ ایسے سلسلہ مضامین میں اختلافات کے بہت سے پہلو نکل سکتے ہیں۔ (سنجیدہ اختلافی مضامین کو بھی نقوش خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کرے گا) ان نزاکتوں کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ کار آمد قسم کا مواد ہم برابر پیش کرتے رہیں۔

پچھلے دنوں اُردو کے کئی نامور لکھنے والے اللہ میاں کو پیارے ہو گئے اور ایسے ایسے قلم کے دھنی چل دیئے جن کی عدم موجودگی ہمیشہ کھَلے گی۔ سعادت حسن منٹو، چراغ حسن حسرت کے بعد — تاثیر، کیفی، خواجہ حسن نظامی، قاضی عبدالغفار، یگانہ اور مجاز۔

افسانہ نمبر کی تکمیل کے شوق میں مجھے پچھلے دنوں ہندوستان بھی جانا پڑا اور ان چل بسنے والوں میں سے قاضی عبدالغفار، یگانہ اور مجاز کی باتیں اب بھی میرے ذہن میں گھوم رہی ہیں۔

قاضی عبدالغفار

سخت بیمار تھے۔ چل چلاؤ والی بات تھی۔ اس پر اخلاق ملاحظہ فرمایئے کہ کارڈ بھیجنے پر بلوا لیا۔ حالانکہ تکیوں کے سہارے پڑے تھے۔ بات تک کرنے میں انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر جب کمرے میں پہنچا ہوں تو قدرے اٹھ کر ہاتھ ملانے کی کوشش کی اور رُک رُک کر باتیں کرتے رہے۔ باتوں کا زیادہ تر موضوع یہ تھا کہ

کام کرنا چاہتا ہوں مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے بے بس ہوں۔ صحت کا جو حال تھا وہ تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بس سانس چل رہی تھی مگر ہمت ملاحظہ ہو کہ اس حالت میں بھی کچھ فائلیں اور کچھ کاغذات ارد گرد رکھے ہوئے تھے۔ بالکل وہی نقشہ ـــ

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بھلا سوچیے تو کہ موت سامنے ناچ رہی ہے اور یہ اس سے آنکھیں چُرا کر کچھ نہ کچھ کیے جا رہے ہیں۔

کہنے لگے کہ میں بستر پر مرنا نہیں چاہتا۔ چاہتا ہوں کہ زندگی کی ریل گاڑی میں جُتا ہوا مروں ـــ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی ـــ جس دن ان کے انتقال کی خبر پہنچی اسی دن مجھے ان کا ایک خط بھی ملا۔

باتوں باتوں میں اس پر بے حد افسوس کرتے رہے کہ اکثر ادیب اور شاعر فکرِ معاش سے مجبور ہو کر فلم کمپنیوں میں جا رہے ہیں اور اپنے جوہروں کو فلم کمپنیوں کی چار دیواریوں میں دفن کر رہے ہیں ـــــ جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کو اکٹھا کر لیں اور اپنے سے کبھی جُدا نہ ہونے دیں ـــ نہ ان کا بس چلا نہ ان کا ارمان پورا ہوا۔

میں نے پوچھا ـــ "قاضی صاحب آج کل کوئی کتاب بھی زیرِ تصنیف ہے؟"

"جی ہاں! طویل بیماری کی وجہ سے میں نے لیٹے ہی لیٹے اپنے ذہن میں تو کئی کتابیں لکھ لی ہیں۔ اگر میرے ہاتھ نے ذہن کا ساتھ دیا تو جلد ہی تین چار کتابیں مکمل ہو جائیں گی۔"

"مجھے آپ کی کتاب "آثارِ جمال الدین افغانی" بڑی عزیز ہے۔"

"مجھے بھی اپنی وہی کتاب پسند ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں میں نے یورپ کا سفر کیا اور ڈاکٹر براؤن نے میری بڑی مدد کی ـــ اتفاق دیکھیے کہ جب لندن پہنچا تو ڈاکٹر براؤن سخت بیمار تھے ـــ میں نے خط لکھ کر اپنا مقصد عرض کیا اور ساتھ ہی ملاقات کی اجازت چاہی، بلوا لیا ـــ ان کی بیگم نے استقبال کیا اور ساتھ ہی مجھے ہدایت کی کہ آدھ گھنٹے سے زیادہ نہ بیٹھئے گا۔

باتیں شروع ہوئیں تو میں معلومات کے ہجوم میں گھِر کے رہ گیا۔ اٹھنا بھی چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے روکا۔ گھنٹوں باتیں ہوئیں ـــ واپس آنے لگا یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک دوسرے کمرے میں میرے کام کی جتنی بھی کتابیں ہو سکتی تھیں وہ سب میز پر پھیلا رکھی تھیں ـــ خوب استفادہ کیا۔ بہت سے دوستوں کے نام ڈاکٹر صاحب نے خط بھی لکھ دیے۔ میں ان سب سے ملا اور ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے سب نے میری بڑی مدد کی۔

اس کے بعد میں مصر پہنچا۔ ڈاکٹر رشید رضا سے ملنے، کیونکہ مفتی محمد عبدہٗ کی بدولت ان سے جمال الدین افغانی پر بڑا مواد مل سکتا تھا۔ انہیں تین چار خط لکھے اور اپنے ہندوستان سے آنے کی غرض بتائی۔ جواب تک نہ دیا۔ خود ملنے گیا تو ملاقات سے انکار کر دیا۔ مجھے بڑا غصّہ آیا اور ایک خط لکھ کر واپس ہندوستان آ گیا۔

میرے ہمسفر حکیم اجمل خاں بھی تھے۔ میں تو پہلے مصر پہنچ گیا تھا وہ بعد میں آئے۔ ان کے رشید رضا سے دوستانہ مراسم تھے۔ جب حکیم صاحب رشید رضا سے ملے تو انہوں نے میری شکایت کی کہ ہندوستان سے عبدالغفار آئے تھے۔ میں ان سے نہیں ملا تو بڑا سخت خط لکھ کر چلے گئے۔"

قاضی صاحب نے اس سارے واقعہ پر یوں بھی تبصرہ کیا "جن کا جمال الدین تھا انہوں نے میری کوئی مدد نہ کی۔ جن کا جانی دشمن تھا انہوں نے میری رہنمائی کی۔"

اس پر میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا "آپ کو اس کتاب کی خاطر بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔"

"جی ہاں مجھے اس ایک واقعہ پر کہ جمال الدین افغانی کو زہر دے دیا گیا یا وہ طبعی موت مرے تھے، کئی مہینے ریسرچ کرنی پڑی۔ جب تک جمال الدین افغانی کے معالج ڈاکٹر سے خود پوچھ گچھ کر کے تسلی نہ کر لی، میں نے قلم کو روکے رکھا۔"

قاضی صاحب کو میں نے بے حد متواضع، خلیق، سادہ اور دھن کا پکّا پایا ـــ اکہرا بدن، قدرے لمبا قد، چھوٹی سی داڑھی، چہرے پہ جھریاں ـــ اور باتوں میں شعر ڈھلتے دیکھے۔

یگانہ چنگیزی

یگانہ اکھڑتی ہوئی سانسوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

ایک کمرے میں بند، چند ٹوٹی پھوٹی اور بے ترتیب سی چیزوں کی موجودگی میں میرزا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اپنے باکمال شاعر کو یوں خستہ حال دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔

ان کو اس حالت تک پہنچانے میں زیادہ تر ان کی اپنی ہی کوششوں کو دخل ہے۔ وہ اس وقت بھی غالب کے بُری طرح رقیب بنے بیٹھے تھے اور غالب کی شاعری کو ذہنی آوارگی کا درجہ دیتے تھے۔ اقبال کو سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔

میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ مدت سے اپنے حالات کے قطعی ناموافق ہونے کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو ہی چکے تھے۔ جبھی وہ کبھی تو خدا پر برستے تھے کبھی غالب کو آوارہ شاعر کہتے تھے اور کبھی اقبال کی عظمت کے منکر بنتے تھے —— ان کمزوریوں کے باوجود، اُردو غزل میں اپنے اسٹائل کے تنہا مالک!

بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگے اور پھر مجھ سے پوچھا "آپ نے میرا جلوس دیکھا تھا؟"

"کیسا جلوس؟"

"اجی وہی جس میں مجھے جوتوں کے ہار پہنائے گئے تھے۔ میرا منہ بھی کالا کیا گیا تھا اور گدھے پر سوار کر کے مجھے شہر بھر میں گھمایا گیا تھا۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ میں نے وہ جلوس نہیں دیکھا۔"

"واہ صاحب واہ! آپ نے تو ایسے اللہ کا شکر ادا کیا ہے جیسے کوئی گھٹیا بات ہو گئی ہو۔ سوچو تو سہی کہ آخر کروڑوں آدمیوں میں سے صرف مجھی کو اپنی شاعری کی وجہ سے اس اعزاز کا کیوں مستحق سمجھا گیا؟ —— جبکہ یہ درجہ غالب تک کو نصیب نہ ہوا۔ میر تک کو نصیب نہ ہوا۔

میں چاہتا تھا کہ میرزا صاحب اس تکلیف دہ قصہ کو یہیں ختم کر دیں۔ مگر وہ مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو اور اس کے بدلے یہ گرانقدر انعام پایا ہو۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فوراً دوغزلہ کے موڈ میں آ گئے۔ "جی ہاں جناب! آپ کے لاہور میں بھی گرفتار ہوئے تھے۔"

"وہ قصہ کیا تھا؟"

"جناب قصہ یہ تھا کہ میرزا یگانہ چنگیزی یہاں سے کراچی کا پاسپورٹ لے کر چلے تھے اور لاہور پہنچ کر اپنے ایک دوست کے ساتھ پنجاب سے نکل کر سرحد پہنچ گئے تھے۔ واپسی پر گرفتار کر لیا گیا (ایکدم جمع سے واحد کے صیغے پہ آ گئے) اکیس ۲۱ روز جیل میں بند رہا۔ ہتھکڑی لگا کر عدالت میں لایا گیا۔ پہلی پیشی پر مجسٹریٹ صاحب نے نام پوچھا۔ میں نے بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بڑی شان سے بتایا۔ "یگانہ!"

ساتھ کھڑے ہوئے ایک وکیل صاحب نے بڑی حیرت سے مجھ سے سوال کیا "یگانہ چنگیزی؟"

"جی ہاں جناب!"

یہ سُنتے ہی مجسٹریٹ صاحب نے (غالباً آفتاب احمد نام بتایا تھا) میری رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔

جب رہا ہو گیا تو جاتا کدھر؟ اور پریشان ہو گیا —— مجسٹریٹ صاحب نے میری پریشانی کو پڑھ لیا۔ میں نے ان سے عرض کیا جناب میرے تمام روپے تو تھانے والوں نے جمع کر لئے تھے۔ اب مجھے وہ دلوا دیجئے تاکہ یہاں سے کراچی جا سکوں۔

انہوں نے کہا۔ درخواست لکھ دیجئے —— میرے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ کاغذ کہاں سے لاتا اور کیسے درخواست لکھتا —— اس پر بہ کمال شفقت مجسٹریٹ صاحب نے مجھے ایک آنہ دیا اور میں نے کاغذ خرید کر درخواست لکھی جس پر مجھے فوراً روپے مل گئے۔ آپ لاہور جائیں تو آفتاب احمد صاحب کے پاس جا کر میرا سلام ضرور عرض کریں —— اور ہاں آپ بھی لاہور جا کر اب یہ کہیں گے کہ یگانہ سے ملے تھے۔ آپ یگانہ سے

کہاں ملے ہیں۔ یگانہ کو گوشت پوست کے ڈھانچہ میں دیکھنا غلط ہے۔ یگانہ کو اس کے شعروں میں دیکھنا ہوگا —— یگانہ کو اس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر دیکھنے کے بجائے اس مسند پر دیکھنا ہوگا جس پر وہ آج سے پچاس برس بعد بٹھایا جائے گا۔"

میں نے میرزا صاحب کو خود سر —— مفروضہ آن کے مالک —— صرف خود کو خدائے سخن ماننے والے —— زمانہ کی ناقدری کے سخت شاکی (جن میں شمع معمّے کے حل پر انعام نہ ملنا بھی شامل ہے) —— اپنے غلط نظریات پر اٹل ایمان رکھنے والے —— خود کو با اصول تصور کرنے والے پایا۔

ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یہ علم تھا کہ میں ایک ایسے صاحبِ فن کی خدمت میں حاضر ہوں جس پر مجھے فخر ہونا چاہیئے۔ کاش زمانہ ان کا ساتھ دیتا اور وہ اپنے ذہن کی غلط روش سے بچ نکلتے۔

اکہرا بدن، چپٹی ناک، کالا رنگ، کلین شیو، بھونڈی شکل و صورت والے کا ایک خوبصورت شعر یہ بھی ہے ؎

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دَیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

اسرارالحق مجاؔز

آل احمد صاحب سرؔور نے کافی ہاؤس چلنے کے لئے کہا، پہنچے، سامنے کی میز پر ایک صاحب کو پہچاننے کی بڑی ناکام سی کوشش کی —— سروؔر صاحب نے پوچھا "مجاؔز سے تعارف ہے؟"

"جی ہاں! کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔"

سروؔر صاحب کے اس سوال پر میں نے ذہن کو کئی جھٹکے دیئے۔ تب جا کر پہچانا کہ سامنے کی میز پر مجاؔز ہی تو ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ خود اٹھ کر ہماری میز پر آئے اور آتے ہی پوچھا "کب آئے ہیں آپ؟"

یہ وہ مجاؔز تھے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑی پیتے تھے۔ ڈوب ڈوب کر پیتے تھے —— وہ مجھ سے زیادہ با ہوش تھے۔ نہ صرف پہچانا بلکہ اخلاق میں بھی (ہماری میز پر آکر) سبقت لے گئے۔

پہلے سے زیادہ دُبلے —— پہلے سے زیادہ خستہ حال —— پہلے سے زیادہ سنجیدہ —— پہلے سے زیادہ چُپ چاپ!

میں نے خیریت پوچھی تو اللہ کے شکر کا اقرار کیا۔ شعر و شاعری کی بات کی تو اپنے بانجھ ہونے کا یقین دلایا۔ وجہ پوچھی تو چُپ ہو گئے —— جیسے کہہ رہے ہوں کہ جناب تو بڑے بے وقوف ہیں۔

اس حالت میں بھی کوئی نہ کوئی بات کر گزرتے تھے جس سے ان کی ذہانت پر ایمان لا کر مسکرانا پڑتا تھا۔ یہ ملاقات بڑی مختصر رہی۔ دوسرے دن کے لئے پھر کافی ہاؤس ہی میں ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے اور یہ بھی کہہ گئے۔ کل خوب باتیں ہوں گی۔

حسبِ وعدہ وہ دوسرے دن موجود تھے۔ میں انہیں دیکھتے ہی ڈر اٹھا کہیئے آج تو خوب باتیں ہوں گی۔ ڈر اس وجہ سے کہ میں اوّل درجہ کا باتونی ہوں۔ یہ اکیلے ہی ایک میز پر براجمان تھے۔ کافی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے میرے حصّہ کی بھی کافی منگوا رکھی تھی۔ خود پی رہے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔

ہماری ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو ملاحظہ ہو جس کی ابتدا میں نے کی۔

"خیریت؟"

"چپ چپ کیوں ہیں؟"

"یونہی!"

اب مجاز صاحب ——— "ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے؟"

"جی ہاں!"

"آپ بولتے کیوں نہیں، کیا بات ہے؟"

"یونہی!"

"اچھا!"

"جی ہاں!"

"لکھنؤ دیکھا؟"

"کچھ کچھ!"

"کافی کیسی ہے؟"

"کڑوی!"

"شربت منگواؤں؟"

"بسم اللہ!"

"اچھا یہ بتائیے اس رفتار سے آپ ڈالنّاس تک کب پہنچیں گے؟"

یہ تھے وہ تمام مکالمے جو کوئی سوا گھنٹہ کی نشست میں ہوئے۔ کبھی میں بات کر کے ڈوب جاتا تھا کبھی وہ۔ آخر ان کے ایک دوست نے آکر ہم دونوں کو بے بسی سے نجات دلائی۔ کوئی پندرہ منٹ اور نشست رہی ہوگی کہ مجاز صاحب نے پھر دوسرے دن گھر پر آنے کی دعوت دی مگر میں جا نہ سکا ——— آج وہ جس گھر میں ہیں وہاں خود کسی کو بلاتے ہوئے ہچکچاتے ہوں گے۔

لمبے قد، کلین شیو، سانولے رنگ، لمبے بال، قدرے خوبصورت خد و خال والے مجاز ہی کا تو یہ شعر ہے ؎

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

نذیر احمد کا ذہنی تجزیہ

ڈاکٹر اعجاز حسین

اردو ادب کی تاریخ پر اگر نظر دوڑائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر انقلاب میں بڑے ادیب پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جب کبھی زندگی کو ہنگامہ خیز واقعات سے وچار ہونا پڑا ہے تو اردو زبان نے بھی اپنا بہترین کارنامہ یا خاص جوہر دنیا میں پیش کیا ہے۔ شاید یہ خصوصیت اس ماحول کا نتیجہ ہو جو اسے ابتدائی زندگی میں لا تھا چونکہ اس کی نشو و نما اور ادبی حیثیت ہلچل اور ہنگاموں کے درمیان ہوئی۔ اس لئے اس کو طوفانوں میں مسکرانے کی عادت پڑ گئی ہے اپنی توانائی و رعنائی ا مظاہرہ یہ زبان اس وقت ہمیشہ سے زیادہ بہتر انداز میں کرتی ہے۔ میرؔ، سوداؔ وغیرہ ایسے ہی حالتوں کی علامتیں ہیں اور جب غدر کا زمانہ آیا اور اس سے سلسلے ں میں ایک ہلچل پیدا ہوئی پرانی قدریں ماضی کے نقاب میں روپوش ہونے لگیں اور نئی قدریں ایک سیلاب کی طرح رونما ہوئیں تو اردو نے بھی متعدد گراں قدر دیب پیدا کیئے سیلاب کے تھمتے ہی سرسیدؔ، نذیر احمد۔ محمد حسین آزادؔ، حالی اور کئی ایک اہل قلم زبردست دل و دماغ لے کر صفحۂ ادب پر چھا گئے حالانکہ ن بزرگوں کو قسمت سے وہ ماحول ملا تھا جو صرف انتشار و پراگندگی کا مرقع تھا مگر ایسے ہی عالم میں جو کچھ ان لوگوں نے ادبی کارنامے پیش کئے وہ ہر ظ سے قابل قدر اور اہم ثابت ہوئے ان ہی ادبی معماروں میں اپنی تعمیری صلاحیتوں کی بدولت نذیر احمد بھی ایک ممتاز جگہ پر کھڑے ہیں جو ماضی اور ل کی قدروں میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کرنے کی صحت مند فکریں کر رہے ہیں۔ نذیر احمد نے کیوں ایک خاص طریقہ سے سوچا اور ایک خاص طریقہ ے لکھا؟ جب ہم اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو پہلا سوال ان کے اس ماحول اور تعلیم کا آتا ہے جو ان کی ذہنی نشو و نما میں کارفرما تھے، سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی فکر، طرز تحریر و تخیل کی ساخت میں کیا کیا خاص عناصر، افراد، ادارہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوئے اس سلسلہ میں سب ے پہلی بات ذہن میں یہ آتی ہے کہ مغلیہ سلطنت اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کی حکومت پوری قوت ے ساتھ ہندوستان بھر میں اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی جس نے سمجھدار طبقہ کو یقین دلایا تھا کہ اب عہد ماضی واپس نہیں آ سکتا۔ نئے دور میں نئے حالات ے دوچار ہونا جس کے لئے عمل کی ضرورت ہے۔ خواب دیکھنے اور تعبیروں کے انتظار میں بیٹھے رہنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر باوجود اس احساس کے ئی تعمیری پروگرام لوگوں کے ذہن میں نہ تھا مادی ترقی کے لئے بھی لوگ مذہب سے چارہ سازی کی امید لگائے ہوئے تھے اسی میں تمام مسائل کا حل تلاش تے تھے اور عہد ماضی کے خواب آور تصور میں جی بہلا کر خوش رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ انگریز تمام ملک پر چھا گئے تھے ا ایک ایسی مرکزی طاقت نہ رہ گئی تھی کہ ان سے لوہا لیتی مگر ذہنی طور پر لوگ ان کی حکومت، ان کی تہذیب و طرز معاشرت سے متنفر تھے اپنے

آباو اجداد کے طریقِ کار کو سراہتے تھے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کو باعثِ فخر خیال کرتے تھے بدلے ہوئے حالات میں بدل جانے کے لئے تیار نہ تھے اور نہ ان میں حالات کو بدل دینے کی صلاحیت تھی نتیجہ یہ تھا کہ سب ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے چونکہ ذہن میں کوئی اپچ نہ تھی اس لئے چار و ناچار وہی سب کچھ کر رہے تھے جو اس مدد سے پہلے ہوتا آیا تھا۔ چنانچہ نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم بھی مکتب ہی میں ہوئی اور ابتدائی نقوش ذہن پر اپنا وہی اثر ڈال رہے تھے جو ایسے مکتبوں میں پیدا کرتے تھے۔

نذیر احمد ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بجنور کا شہر کوئی خاص شہر نہ تھا اور پھر اس کی ایک تحصیل کی ذہنی فضا کا جو عالم اس وقت رہا ہوگا اسے سوچئے اور آخر میں اسی کے ساتھ یہ بھی تصور میں لائیے کہ اس تحصیل کا ایک گاؤں ریہڑ اس زمانہ میں کیسا خطہ رہا ہوگا جہاں نذیر احمد کی ولادت ہوئی تھی ان کے والد سعادت علی کا سلسلہ نسب ایک بڑے بلند پایہ مولوی گھرانے سے ملتا ہے وہ شاہ عبد الغفور اعظم پوری کی اولاد میں سے تھے اور خود بھی ایک خاص علمیت و بزرگی کے مالک تھے یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر ادبا میں ہوتا تھا۔ علمیت اور مولویت اس خاندان میں دو طرف سے آئی تھی دادیہال کے علاوہ نذیر احمد کی ننھیال کا بھی یہی حال تھا اس میں بھی لوگ بڑے پایہ کے گزرے تھے شاہی زمانہ میں قاضی رہ چکے تھے غرض کہ نذیر احمد کا خاندان دونوں طرف سے مولویوں کا خاندان تھا گھر کی پوری فضا مذہبی تھی اس ماحول میں جو بچہ پیدا ہوا ہو ظاہر ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت بھی ویسی ہی ہوئی ہو گی جو وقت کا تقاضا نہیں بلکہ پرانے لوگوں کے ذہن کی کارفرمائی کا نتیجہ رہی ہو گی۔ معلوم نہیں کیا ایسے حالات ہوئے کہ نذیر احمد کے والد کو گاؤں سے شہر میں آنا پڑا اس وقت نذیر احمد کی عمر صرف چار برس کی بتائی جاتی ہے اس سن میں گاؤں کی تنگ و تیرہ فضا سے نکل کر شہر کی فضا میں بچہ کا آجانا قدرتی امداد سمجھی جا سکتی ہے جب تعلیم کا وقت آیا تو کسی قدر بدلے ہوئے ماحول سے نذیر احمد کو سابقہ پڑا۔ ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں ہوئی اور کچھ ان کے والد کے ہاتھوں ہوئی یہ سلسلہ ۹ برس کی عمر تک چلتا رہا۔ نذیر احمد فارسی عربی پڑھتے رہے اس کے بعد ایک ڈپٹی کلکٹر مولوی نصر اللہ خاں سے نحو، منطق، فلسفہ کا درس لیا کئی سال تک اسی ڈپٹی کلکٹر سے پڑھنے کا سلسلہ قائم رہا۔ ظاہر ہے کہ نذیر احمد کے ذہن میں پڑھنے کے ساتھ ہی سرکاری ملازمت کے جاہ و وقار کا بھی اثر پڑا ہو گا۔ ڈپٹی صاحب کے دنیاوی اعزاز کا نقش غیر شعوری طور پر بچے کے دماغ پر ایک مستقل حیثیت سے بن گیا ہو گا۔ بغیر سوچے سمجھے یہ احساس ہوا ہو گا کہ کاش یہ منصب مجھ کو بھی نصیب ہو وہ اپنے گاؤں میں بلکہ شہر میں بھی کہاں ڈپٹی کلکٹروں سے بڑے عہدے داروں کو دیکھتے رہے ہوں گے۔ لامحالہ خیال ہوا ہو گا کہ ایک ڈپٹی کلکٹر دنیا کا سب سے بڑا آدمی نہیں تو کافی بڑا افسر ہوتا ہے۔ چونکہ نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر سے ۵ سال تک فیض حاصل کرتے رہے جس میں علمی اکتساب بھی شامل تھا اس لئے اُستادی و شاگردی کے رشتہ نے اور بھی عقیدت بڑھا دی ہو گی ڈپٹی کلکٹری میں دینی و دنیوی دونوں احترام نظر آئے ہوں گے۔ اس لئے سرکاری ملازمت اور ڈپٹی کلکٹر بننے کا شوق خود بخود پیدا ہو گیا ہو گا اس وقت ہندوستانیوں کے لئے ڈپٹی کلکٹری معراج تھی اس سے بڑا عہدہ انگریزوں کے ہاتھ سے ملنا دشوار تھا یہی وجہ ہے ملازمت کا نقطہ عروج اسی نوکری کو نذیر احمد نے سمجھا ہو تو عجب نہیں۔ غالباً اس احساس و تمنا کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر نذیر احمد نے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی جگہ چھوڑ کر تحصیلدار بننے کو باعثِ افتخار سمجھا۔ علم و تعلیم کا اثر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ زیادہ سے زیادہ اپنا وقت و دماغ محکمہ تعلیم ہی کی نذر کرتے لیکن اس محکمہ میں رہ کر وہ اپنے ان جذبات کو مکمل نہ کر سکتے جو نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کی صحبت میں پیدا ہو گئے تھے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے عُسرت کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی تو ایک احساسِ کمتری بھی بچپن میں ہو گیا ہو گا۔ ڈپٹی صاحب کتنے ہی سادہ مزاج کیوں نہ رہے ہوں۔ مگر کچھ نہ کچھ طمطراق تو دنیا اور کلکٹر کے دکھانے کے لئے کرنا ہی پڑتا رہا ہو گا اور جہاں میں تنخواہ کی رقم جو ملتی رہی ہو گی اس کی آواز نذیر احمد کے کان تک بھی پہنچتی رہی ہو گی اس کو سن کر وہ بھی سوچنے لگتے ہوں گے۔ کہ اتنی بڑی تنخواہ کیا مل سکتی ہے اپنی غریبی کو دور کرنے کے لئے ممکن ہے یہیں سے دولت مند بننے کی خواہش کی بنیاد بھی پڑ گئی ہو ایک بات اور قیاس میں آتی ہے بچپن میں نذیر احمد نے اپنے باپ کو دنیاوی ترقی کے لئے نمونہ سمجھا ہو گا۔ بلکہ نصر اللہ خاں کو ایسے اعزاز کا مرقع تصور کیا ہو گا۔ کیونکہ علم و خاندانی

کی وجہ سے ان کے باپ سعادت علی کی عزت ایک مخصوص طبقہ کرتا رہا ہوگا۔ لیکن یہ عزت زندگی کی آسائش سے بیگانہ تھی۔ تمام عمر ان کے والد
نے غریبی میں بسر کی۔ برخلاف اس کے ڈپٹی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہوتے ہوئے بھی ضروریاتِ زندگی کی فکروں سے مستغنی رہے ہوں گے اس
لئے نذیر احمد کو بھی خیال ہوا ہوگا کہ علم وہی اچھا ہے جو دین و دنیا دونوں میں آدمی کا ساتھ دے ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہوتی رہیں کچھ پیسہ بھی
اس رہے اور لوگ قابلیت سے متاثر بھی ہوتے رہیں۔ یہ ساری باتیں قیاس پر مبنی لیکن قیاس بے بنیاد نہیں جب ہم نذیر احمد کے ماضی و مستقبل
ا رشتہ ملانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ ۹ برس سے ۱۴ برس تک کا سن ایسا ہوتا ہے جب بچہ کی خواہشات ایک شکل اختیار
رنے کی فکر کرتی ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ نذیر احمد ۴ برس کے سن سے ۱۴ برس کی عمر تک بجنور میں رہے اور
برس کے تھے جب براہ راست نصر اللہ خاں سے سابقہ پڑا۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ ان کو دیکھتے رہے ہوں یا ان کے تذکرے سنتے رہے
دں لیکن چونکہ کوئی ثبوت نہیں ملتا اس لئے اس قیاس کو کہ وہ پہلے سے ذہنی طور پر ڈپٹی صاحب سے مرعوب تھے ہم نظر انداز بھی کردیں تو بھی ۵ سال
ی مدت بچے کے ذہن کو متاثر کرنے کے لئے کسی طرح کم نہیں ہوتی، اس لئے ان تمام باتوں کو "وہم" و گمان سے تعبیر کر کے ٹالا نہیں جا سکتا۔

نذیر احمد کی راہِ زندگی میں سب سے اہم موڑ تو وہ تھا جو ان کو دہلی میں ملا۔ ۱۴ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ نذیر احمد دلی چلے آئے ان کے باپ
ونکہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل کا جویا تھا۔ پشتہا پشت سے گھر میں دولتِ علم میراث کی طرح چلی آئی تھی سب کچھ کھو کے بھی وہ علم
سے اپنی اولاد کو محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دلی آئے تو غالباً ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے ہونہار بچے کو علم سے آراستہ کردیں
الباً تنگ دستی کی وجہ سے انہوں نے نذیر احمد کو ایک ایسے مدرسہ میں داخل کرا دیا جو ادھر ادھر سے روٹیاں مانگ کر طالب علموں کا پیٹ بھرتا تھا۔
یسا معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی کو اس سے بہتر کوئی جگہ نذیر احمد کی تعلیم کے لئے نظر نہ آئی۔ کیونکہ بہتر حالات کے لئے مالی امداد کی بھی ضرورت رہی ہوگی
س کا انتظام غریب باپ نہ کر سکتا ہوگا۔ اس لئے چار و ناچار مولوی عبدالخالق کے سپرد کر کے چلے گئے یہاں جس عالم میں نذیر احمد نے اپنی طالب علمی کے
ن پورے کئے وہ خود نذیر احمد کی زبانی سنئے "پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبری ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع
رنے نکلا کسی نے رات کی بچی ہوئی دال دے دی کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھ دی کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں پر ٹرخایا غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو
تا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں ان کے یہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا ادھر میں نے قدم رکھا ادھر ان
لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا
ی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی ...... بہر حال
ا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی"۔

اس واقعہ کو ذہن میں رکھئے اور ایک دوسرا واقعہ جو اسی سے ملتا جلتا ہے اس پر بھی غور کر لیجئے تو نذیر احمد کی ایک مخصوص ذہنیت کی بنیاد و رغبت
سراغ مل جاتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں نذیر احمد کو اپنے استاد مولوی عبدالخالق کے گھر کا کام بھی کرنا پڑتا یہاں تک کہ ان کی خورد سال پوتی کو کھلانا
ی پڑتا۔ اس کو گود میں لے کر ٹہلانا پھرانا بھی ان کے فرائض منصبی میں داخل ہوگیا تھا یہ ستم ظریفی بھی قابلِ دید ہے کہ بعد میں اسی لڑکی سے نذیر احمد کی شادی
ہوئی۔

یہ اور اس قسم کے واقعات اردو کے پہلے ناول نگار کے لئے ادبی ماخذ بن گئے اس کی ذہنیت کے اجزائے ترکیبی کی طرح عمر بھر کار فرما رہے
ں سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں نذیر احمد کو زنانے لٹریچر اور محاورات وغیرہ کا چسکا لگا۔ ۱۴۔ ۱۵ برس کے سن میں ان کا گھروں میں اس طرح جانا کہ معمولی نوکر
ے فرائض انجام دینے پڑیں، ظاہر کرتا ہے کہ وہ عورتوں سے بہت قریب ہوگئے تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ بغیر کسی تکلف کے ان سے کام لیتی تھیں اور
ن میں جو گفتگو کرتی تھیں اس کو اس وقت کا غریب طالب علم اور مستقبل کا مولانا نذیر احمد صاحبِ تصانیف ذہن میں محفوظ رکھتا تھا۔ آمد و رفت اور

بے تکلفی کا سلسلہ شادی کے بعد اور بھی بڑھ گیا تھا۔ علاوہ اس کے کہ نذیر احمد نے اچھی خاصی علمی قابلیت اس عمر تک حاصل کر لی تھی وہ بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے اور قوتِ حافظہ کے لیے بڑے مشہور تھے۔ اس وقت جو گفتگو مستورات کرتی تھیں اس کو یہ بغیر کسی ارادے کے ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے۔ چونکہ مزاج میں شوخی و شرارت بھی کافی تھی اس لئے عورتوں کے اندازِ بیان اور طور و طریقے میں ایک لذت بھی ملی ہوگی۔ بجنور سے آکر یہاں کی زبان میں کافی فرق ملا ہوگا۔ دہلی کی ٹکسالی زبان اور وہ بھی شریف گھرانوں کی شستہ اور بامحاورہ زبان ایک پڑھے لکھے آدمی کے لئے سرمایۂ نشاط بن گئی ہوگی۔ وہ لڑکی جوان سے مصالحہ پسواتی تھی اور اگر ان کا ہاتھ رُک جاتا تھا تو بٹے سے انگلیاں کچل دیتی تھی ان کے ذہن میں ایک خاص کردار بن کر ہمیشہ کے لئے رہ گئی۔ اس کی اس ستم ظریفی اور بے رحمی پر غصہ بھی آ تا رہا ہوگا اور نفرت کی لہریں بھی جذبات میں دوڑ جاتی رہی ہوں گی۔ سوچتے رہے ہوں گے یہ کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکیاں نزاکت و امارت کی وجہ سے خود کام نہیں کرتیں اور جو کام کرتا ہے اس کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کرتی ہیں کہ گویا وہ آدمی نہیں ہوتا۔ نذیر احمد کو محسوس ہوا ہوگا کہ یہ لوگ دولت و امارت کا بے جا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عالمِ انسانیت سے دور ہو جاتی ہیں۔ خود تو انسان رہی نہیں دوسرے غریب لوگوں کو بھی انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی بد دماغی کا کیا ٹھکانہ۔ یہ اور اس قسم کی اور بہت سے خیالات ایک ہونہار اور ذہین طالب علم کے دماغ میں آنا ضروری ہیں وہ اپنے حاصل کردہ علم و اخلاق سے لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہے کردار کو اس پس منظر میں سوچتا ہے جو اس کو اپنے بزرگوں اور ماحول سے ملا ہے نذیر احمد کے گھر کا ماحول جو کچھ رہا ہوگا اس کی تفصیل تو کسی کو نہیں معلوم مگر قیاس کہتا ہے کہ جب ننھیال دادیہال دونوں طرف سے بزرگان دین کی سرپرستی میں یہ گھرانا پروان چڑھا تھا اور نذیر احمد کے والد خود بھی درویش اور متشرع عالم تھے تو لازمی ہے کہ گھر میں انسانیت، تمیز، تہذیب سب ایک مخصوص انداز کی رہی ہوگی اس طالب علم نے یہاں کی عورتوں کا اخلاق دیکھ کر کیا سوچا ہوگا۔ اس پر کیا اثر پڑا ہوگا اس کا صحیح اندازہ تو جب ہی ہو سکتا تھا کہ نذیر احمد کی کوئی خود نوشت سوانح عمری ہوتی اور وہ اپنے محسوسات قلمبند کر گئے ہوتے۔ مگر اس کمی پر بھی آج ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک شریف پڑھے لکھے نوجوان کے ذہن میں ایسے گھروں کے بارے میں اس وقت بھی کیا خیالات ہوئے ہوں گے کیا وہ یہ نہ سوچ سکا ہوگا۔ کہ اگر اس قسم کی لڑکیاں یوں ہی رہیں تو یہ گھرانے اور بھی جلد تباہ ہو جائیں گے اس لئے ضرورت ہے کہ ایسے افراد کی اصلاح کی جائے۔ نذیر احمد چونکہ غریب گھرانے کے تھے اس لئے ان کو یہ بھی خیال ہوا ہوگا کہ یہ فرق کیسا ایک جگہ تو لڑکے بھی لڑکیوں کا کام کرتے ہیں۔ مصالحہ پیستے ہیں، لڑکے کھلاتے ہیں۔ اور دوسری جگہ لڑکیاں شانِ امارت کا مجسمہ بن کر رہ گئی ہیں۔ لڑکوں کی مشقت کی داد بھی نہیں دیتیں اور تکان رفع کرنے کے لئے رُکیئے تو پتھر سے کچل دیتی ہیں۔

شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی ان گھروں میں آنا جانا اور عورتوں سے دوچار ہونا نذیر احمد کے لئے ایک عملی مدرسہ ہو گیا۔ جہاں پڑھنے کی بجائے مطالعہ و مشاہدہ کا درس دیا جاتا ہے۔ تصنیف کا مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ قلم چلانے سے ذہن کی تربیت ایک خاص نہج پر ہوتی ہے۔ اس مدرسہ میں جوہرِ مردانہ پر جلا ہوتی ہے اور خیال کو کسی نتیجہ پر پہنچنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ نذیر احمد نے انہیں گلیوں۔ گھروں۔ مدرسوں کی خاک چھان کر اپنی تصنیفات کو قبولِ عام کا شرف دلوایا تھا اس لئے ان کے پاس تجربات تھے۔ ان کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا تھا اور دماغ نے بہت کچھ سوچا تھا۔ تخیل کی بنیاد خلاء میں نہ تھی بلکہ ایک ٹھوس حقیقت پر قائم تھی جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ ان حالات میں نذیر احمد مولوی عبدالخالق سے تحصیل علوم و فنون کرتے رہے مولوی صاحب طالب علم کی بردباری، ذہانت اور سعادت مندی سے بے حد متاثر تھے یہاں تک کہ آگے چل کر اپنی پوتی سے اس ہونہار شاگرد کا نکاح بھی کر دیا یہ وہی لڑکی تھی جس کو نذیر احمد گود میں کھلایا کرتے تھے عمر کا تفاوت اور ذہنی سطح کی پستی بھی شاگردی و سعادت مندی کی تہ میں ہو گئی نذیر احمد کی سوانح عمری میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے سن و سال اور علمیت کے فرق کا لحاظ کر کے اس شادی کے خلاف کوئی احتجاج کیا ہو بلکہ گیارہ ہزار روپیہ جو دین مہر کا مقرر کیا گیا اس پر بھی راضی ہو گئے حالانکہ ان کی حیثیت اس وقت تک گیارہ سو کی بھی نہ تھی اس واقعہ میں نذیر احمد کے کردار کا ایک ایسا پرتو نظر آتا ہے جو بتاتا ہے کہ ان کی طبیعت میں بغاوت کا مادہ نہ تھا اپنی حیثیت کو بلند کرنے کی فکر زیادہ تھی اور باتوں کو نظر انداز کر جاتے تھے۔ مولوی عبدالخالق کا مرتبہ اس وقت معاشرہ میں کئی لحاظ سے بلند تھا اور نذیر احمد کے محسن و استاد بھی تھے اس لئے اس رشتہ میں نذیر احمد کو فائدہ بھی

زیادہ نظر آیا ہوگا نقصان کم۔ ان کی زندگی سے ہم کو اور بھی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذاتی فائدے و عروج کا ہر بات سے زیادہ خیال کرتے تھے اور اگر بغاوت کا عنصر بھولے بھٹکے ان کے یہاں کبھی نظر بھی آتا ہے تو اسی وقت جب ان کے ذاتی فائدے اور واقعات و خیالات میں تصادم ہو۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کی ابتدائی کامیابیوں میں عورت کا ہاتھ زیادہ رہا ہے۔ شادی سے جو ان کا وقار کم ہوگیا ہوگا اس کا اندازہ قطعی طور پر نہیں کیا جاسکتا لیکن غدر میں ایک میم کی جان بچانے کے عوض میں جو صلہ ملا وہ تو تاریخی واقعہ ہے اس کے باور کرنے میں کسی کو شک نہ ہونا چاہئے غدر کے بعد اس خدمت کو سرکار نے سراہا اور ان کو ڈپٹی انسپکٹر مدارس الٰہ آباد مقرر کردیا گیا۔ اس واقعہ اور الٰہ آباد کے قیام نے نذیر احمد کے ذہن و ترقی کے لئے ایک نیا راستہ سجھا دیا گورنمنٹ کی نظروں میں نذیر احمد کا جو وقار بڑھا وہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر ذہنی طور پر وہ انگریزوں سے قریب ہوگئے۔ اس قربت کا ثبوت یہ ہے کہ الٰہ آباد میں انہوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی اور چونکہ فارسی و عربی زبانوں کی گرامر اور ان کے حسن و قبح سے پوری واقفیت تھی اس لئے انگریزی زبان سے بھی واقفیت بہت جلد حاصل ہوگئی کیونکہ ایک زبان کے جاننے والے کو دوسری زبان جان لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا چنانچہ نذیر احمد نے انگریزی میں بھی اچھی خاصی قابلیت حاصل کرلی۔ قابلیت سے زیادہ انگریزی زبان کی لذت نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ موقع ہو یا نہ ہو وہ لکھتے یا بولتے وقت انگریزی الفاظ اردو زبان میں ٹھونس دیتے تھے اپنے انگریزی پڑھنے کے سلسلہ میں ایک لکچر میں کہتے ہیں:۔

"میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہرچند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار۔ صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔" باپ کا نذیر احمد بے حد احترام کرتے تھے ان کے اس زبردست جذبہ کا بھی ان کو خیال تھا چنانچہ والد کی زندگی میں انہوں نے انگریزی کی طرف رخ نہیں کیا ان کے انتقال کے کئی سال بعد تک اس وضعداری کو نباہتے رہے ملازمت میں الٰہ آباد آنے کے بعد انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ باپ کی ممانعت ترک اولیٰ نظر بظاہر اس اقدام میں ایک طرح کی بغاوت ہے لیکن یہاں بھی ذاتی فائدے کا خیال پیش پیش ہے۔ اور غالباً وہی فائدہ اس بغاوت کا سبب بھی تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ بغیر انگریزی جانے ہوئے انگریزوں کی حکومت میں ترقی کرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ لہٰذا اس زبان کا بھی مطالعہ شروع کردیا جو ان کے بڑے کام آیا۔ تعزیرات ہند کے ترجمہ سے خوش ہوکر گورنمنٹ نے ان کو تحصیلداری عطا کی اور پھر جلد ہی ڈپٹی کلکٹر بنادیا۔

علم ہیئت کی ایک کتاب کا ترجمہ ان کی مزید ترقی کا باعث ہوا وہ حیدرآباد بلائے گئے اور وہاں پہنچ کر رفتہ رفتہ بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے۔ سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگئی ایک اور مثال ایسی ملتی ہے جس سے ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ ذاتی فائدے کے لئے مذہب سے بھی بغاوت کرسکتے تھے۔ سود لینا اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے مگر نذیر احمد اس کے جواز پر اتنا مصر تھے کہ برابر سود لیتے رہے اور شرح بھی مقرر کرلی تھی ایک روپیہ سینکڑہ سود علانیہ لیتے تھے اپنی تصنیف الحقوق و الفرائض میں سود کے جائز ہونے پر بحث کرکے مختلف دلائل و تاویلات سے اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے یہ سب باتیں ان کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ نذیر احمد کے دل و دماغ پر عورتوں کے برتاؤ طرز معاشرت کا غیرمعمولی اثر پڑا تھا ان کی صورت و سیرت نے دہلی کی ابتدائی تعلیم و قیام کے زمانے میں ذہن پر نقوش پیدا کئے تھے وہی سب سے پہلے ان کی تصنیفات کا مرکز بنے چنانچہ مراۃ العروس، بنات النعش سب سے پہلے وجود میں آئیں۔ ان کتابوں سے نذیر احمد کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے سب مستورات کے بارے میں، عورتوں کی زبان ان کے لب و لہجہ میں نشست و برخاست کا مکمل نقشہ ان کی جیتی جاگتی تصویر اگر دیکھنا ہو تو ان کتابوں میں سب کچھ مل جائے گا اس کے پس پشت یہ راز بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گھریلو زندگی اور عورتوں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی خوبی و خرابی کو ناقد کی طرح دیکھا اور مصلح کی طرح سوچا تھا ان کو ان باتوں میں اتنی لذت ملتی تھی کہ کتاب پر کتاب لکھے جاتے ہیں اور سیری نہیں ہوتی۔ اس انہماک کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کا مطالعہ گھروں اور گھروالیوں کے بارے میں وسیع تھا ان کی

بول چال میں نذیر احمد کی ادبی پیاس سیراب ہوتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ دہلی کی زبان ٹکسالی تھی۔ دہلی والے ہی اہل زبان سمجھے جاتے تھے۔ نذیر احمد دہلی کے نہ تھے اس لئے احساسِ کمتری تھا وہ دہلی والوں کی صف میں آکر اہل زبان میں شمار ہونے کا جذبہ حاوی ہوگیا تھا۔ اس لئے بھی وہ زیادہ سے زیادہ محاورات ضرب الامثال اور روزمرہ اپنی عبارتوں میں پیش کرنے لگے۔ تاکہ یہ سب کو اندازہ ہو جائے کہ مجھے بھی دہلی کی زبان پر اتنا ہی عبور ہے جتنا کسی اور کو ہو سکتا ہے۔ اس احساس کو انہوں نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کا سیلاب ان کے ذہن کو بہائے لئے جاتا ہے اور وہ بعض وقت مجبور ہو کر اس میں بہے چلے جاتے ہیں۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سنبھل نہیں سکتے ابتذال و رکاکت کلام میں آجاتی ہے مگر ان پر محاورات اور روزمرہ کا ایسا نشہ سوار ہے کہ وہ بے خبر سے معلوم ہوتے ہیں۔ حامد حسن صاحب قادری نے جو اس سلسلے میں مثالیں پیش کی ہیں وہ اس دعویٰ کی بیّن دلیل ہیں ان ہی کو ہم یہاں بطور نمونہ پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں مثلاً الاجتہادین تذکرہ ہجرت میں لکھتے ہیں۔

خدا کا کرنا پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہوگیا۔ اندھیرے میں چپکے سے سٹک گئے۔ اسی کتاب میں پھر لکھتے ہیں:۔

"اب تم ان حالات حقہ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کسی مفاد کی توقع کر سکتے تھے اسی دعوے نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی کہ ؎

جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی	گالی کبھو نہ دی تھی سواب بات ہو گئی
باقی ہے مار کھانی تو سن لو گے ایک دن	اس کی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اس دعویٰ نے ان کو شہر بدر کرایا۔ (الاجتہاد ص۸۳)

امہات الامہ میں اخلاق نبی کریم اور اسباب نکاح کے تذکرے میں ہجرت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"تقویت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے بھروسہ پر پیغمبر تیرہ برس دشمنوں کے نرغے میں پڑے چھاتی پر مونگ دلوایا کئے۔ یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات جگہ سے اکھڑ گیا اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی۔"

ان مثالوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ متانت و سنجیدگی کا خون نہیں ہوا۔ چپکے سے سٹک گئے ان کی یہ گت بنوائی۔ چھاتی پر مونگ دلوایا کئے۔ پائے ثبات اکھڑ گئے، بھاگ کر۔ یہ فقرے یا محاورے اس عظیم المرتبت ہستی کی شان میں ہیں جس کا نظیر صفحۂ ہستی پر پیدا نہیں ہوا یہ صرف عام مسلمانوں کا عقیدہ نہیں خود نذیر احمد بھی رسالت مآب کا دل سے اتنا ہی احترام کرتے تھے مگر زبان دانی کا غرّہ اور محاورات کا چسکا سادی ذات پر بھوت کی طرح سوار ہوگیا تھا نہ حفظ مراتب کا خیال اس کو دبا سکتا تھا اور نہ موقع شناسی اس کو اتار سکتی تھی یہ ضرور ہے کہ ان کا دل دھڑکا ہوگا احترام کے جذبہ نے قلم کو روکا ہوگا کہ کس کی شان میں یہ الفاظ استعمال ہو رہے ہیں کس موقع پر ان فقروں اور محاوروں کا صرف ہو رہا ہے مگر زبان دانی کے جوش اور الفاظ کے استعمال کرنے کا نشہ اس بے اعتدالی سے نہ روک سکا اور اس حد تک مدہوش کر دیا کہ نثری عبارت ناکافی معلوم ہوئی تو چار مصرعے بھی چسپاں کر دیئے حالانکہ اس موقع کے لئے یہ مصرعے نہایت نامناسب تھے اسی بے تکے پن کی وجہ سے اکثر ان کی طرزِ تحریر مجروح ہو جاتی ہے۔ کلام میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات بلا وجہ بڑھائی جا رہی ہے۔ یہ سب اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو الفاظ سے عموماً کھیلنے کا ہوتا ہے۔ سب کچھ کہہ جانے پر بھی خیال ہوتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا گیا اس لئے کہ مخصوص اندازِ بیان کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے اور موضوع ختم ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد ایسے دور میں تھے جب انگریزی تمدن کے اثر سے نئی قدریں متشکل ہو رہی تھیں لوگوں کو ان پر اعتماد ہو چلا تھا انگریز اور یورپ

---

[1] داستان تاریخ اردو ص۱۰-۹-۵)

کی ترقی کے راز کو سمجھنے کی کوشش ہندوستان میں ہو رہی تھی ایک خاص طبقہ انگریزی تعلیم یا انگریزی اثر سے متاثر ہو کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سائنس کی نئی تحقیقات و معلومات کا مطالعہ کیا جائے ان سے پرانی ذہنیت کو بدلا جائے۔ مذہب کو عقل کی عینک سے دیکھا جائے توہمات سے کنارہ کیا جائے اور ایسی رسمیں جو مذہب کے نام پر جاری ہیں مگر حقیقتاً خیال خام کی پیداوار ہیں وہ قوم و ملک کے لئے زہر ہیں ان سے اجتناب کیا جائے انگریزوں کی ترقی کا ایک بڑا راز تجارت میں مضمر سمجھا گیا اصلاح کے لئے تقریروں اور تحریروں دونوں سے کام لیا جانے لگا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ نذیر احمد کا دور نئی تخلیقات و تحقیقات سے اثر لے کر اپنی قوم میں بھی ترقی کی روح پھونکنا چاہتا تھا اسی کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے معلومات کا ذخیرہ مغرب کے خزانہ سے لے کر عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حالی۔ سر سیّد۔ محمد حسین آزاد اور ان کے مقلّد و ہم خیال ایسے ہی اصلاح کے علمبردار تھے جس کو جو طبقہ مناسب معلوم ہوا اسی میں تبلیغ کرنے لگا۔ نذیر احمد نے پہلے پہل اس کام کے لئے طبقہ اناث کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا انہوں نے اس کار خیر کے لئے نئے آلۂ کار کا انتخاب کیا۔ ناول اردو ادب کے لئے نئی چیز تھی اس کا نیا پن بھی لذیذ معلوم ہوتا ہوگا اور پیامات کی تازگی بھی چاہتی تھی کہ پرانے قصے کہانی کو چھوڑ نئی صنف میں باتیں پیش کی جائیں اس لئے نذیر احمد کا یہ اقدام یعنی ناول میں اصلاحی مقصد کو پیش کرنے کا خیال بڑی نکتہ رسی پر مبنی تھا بہرحال انہوں نے اصلاحی فریضہ ناول سے شروع کیا۔ اور لوگوں کی طرح نذیر احمد کے پاس بھی کوئی معاشرتی پروگرام ایسا نہ تھا کہ ان کی تخلیق سے تعبیر کیا جائے۔ درحقیقت ان کا ذہنی سرمایہ مغربی تمدّن کا پرتو تھا جس میں تقلید زیادہ تھی خلّاقی کم۔ بہرحال جو کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں اس کو قوم کی بہبود میں صرف کرنا انہوں نے ضروری سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس اقدام میں خلوص تھا وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ مسلمان ترقی کریں۔ مادّی ترقی کے لئے ان کے نزدیک ضروری تھا کہ شعور میں بھی بلندی آئے قدامت پرستی کے تنگ دائرے سے نکل کر نئے علوم سے متعارف و مانوس ہوں تاکہ نئے راستے اور ان کی قدر و قیمت سمجھ میں آئے۔ مختلف وجوہ سے نذیر احمد نے عورتوں کو زیادہ کمزور پایا اور مناسب سمجھا کہ ان کو پہلے مضبوط بنایا جائے۔ اس لئے ان کی ناولیں مرأۃ العروس اور بنات النعش وجود میں آئیں جن میں علاوہ اور باتوں کے ذہن کی بالیدگی کے لئے سائنس کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی گئی مثلاً بنات النعش میں زمین کی کشش، وزن مخصوص، ہوا کا داب، کشش اتصال، مقناطیس، زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے اور اس قسم کے اور بہت سے عنوانات ہیں۔ جن سے صاف ظاہر ہے کہ ان مسائل کو اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ شعور میں عقلی عنصر غالب ہو جائے، زندگی کے رشتے منطقی طور پر سمجھ میں آ جائیں۔ مفروضات سے ہٹ کر عورتیں حقیقت کی روشنی میں چلنے پھرنے لگیں اور نئی نسل عقل کی توانائی کے ساتھ آگے بڑھے۔ نذیر احمد نے اپنی ذہنیت پر ایک جگہ خود تبصرہ کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا،" گو وہ مولوی خاندان کے تھے مگر مولویت سے متبرا تھے۔ اسی لئے مولوی کو انہوں نے بہت بُری نظر سے دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اقبال کی طرح سمجھ لیا کہ دین کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے۔ اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام۔ ان کے نزدیک قوم کی رہبری کے لئے اب وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جو ترقی یافتہ دنیا کے حالات و تغیرات سے بخوبی واقف ہو مذہب کا اصل منشا بھی جانتا ہو اپنے پر بھی تنقیدی نظر ڈال سکتا ہو۔ تعصب و تنگ نظری کا شکار نہ ہو۔ مختصر یہ کہ ایسے کردار کا مالک ہو جو زندگی اور مذہب کی اصل حقیقت سے واقف ہو انسان کو انسان سمجھتا ہو۔

ان مختصر الفاظ میں نذیر احمد نے اپنے دور کے ممتاز لوگوں کی ذہنیت کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ حسن اتفاق سے اس وقت جو سربرآوردہ لوگ قوم کی رہنمائی ادبی لحاظ سے کر رہے تھے ان سب کے مزاج و مذاق کی تصویر اس اصول کے آئینہ میں نظر آتی ہے۔ سر سیّد، حالی، آزاد اور نذیر احمد

سب اسی نظریہ کے ساتھ راہِ قیادت میں گامزن تھے ۔ کبھی کسی سے لغزش ہوگئی ہو تو اسے اتفاق پر محمول کیا جا سکتا ہے ۔ ورنہ عموماً ان بزرگوں کے سامنے مسلک تھا ۔ نذیر احمد کو اصلاح کے سلسلہ میں اتنا شغف تھا کہ وہ سچ مچ ناصحِ مشفق معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ ناولوں میں کردار کی حرکات و سکنات بیان کرتے کرتے خود بیچ میں بول اٹھتے ہیں اور اس شد و مد کے ساتھ بولتے جاتے ہیں کہ پورا لکچر دے ڈالتے ہیں نہ ناول کے ٹکنیک کے مجروح ہونے کا خیال رہ جاتا ہے نہ باتوں کے تناسب و توازن کا لحاظ باقی رہتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات سے ان کا دم گھٹ رہا ہے بغیر بولے ہوئے ان کی حالت غیر ہو جائے گی ۔ لکچروں کا یہ مظاہرہ اور بھی بے تکا ہو جاتا ہے اس رویہ کے پس پشت نمائش و خود نمائی کا جذبہ نمایاں ہے اور یہی جذبہ ان کی تمام ادبی کاوش میں ابل پڑتا ہے ضرب الامثال و محاورات کی بھرمار اور انگریزی الفاظ کا بے ضرورت و بے محل استعمال ان کی اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے جو خود نمائی کے ذوق پر محمول ہے ۔

نذیر احمد کے ذہنی پس منظر میں سیاست کا زیادہ دخل نہیں مگر معاشرت اور سیاست میں جو فطری لگاؤ ہے وہ کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے سیاسی مسائل پر بھی ان کے خیالات ملتے ہیں گو دبے دبے ہیں مگر ہیں ضرور ۔ ان خیالات کی تہ میں اتنی معقولیت و خود داری ہے کہ حیرت ہوتی ہے نہ اس زمانہ میں لوگوں کا سیاسی شعور اتنا بلند تھا جتنا آج ہے ۔ نہ آزادیٔ فکر و گفتار آج کے ایسی حاصل تھی ۔ مگر پھر بھی انہوں نے مختلف صورتوں سے حاکم و محکوم کے رشتہ پر جو نظر ڈالی ہے وہ اس وقت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے ایک جگہ ابن الوقت کی زبان سے غدر کے بعد انگریزوں کے مجمع میں کہلاتے ہیں :-

"انگریزی سلطنت رعایائے ہندوستان کے حق میں ایک پہیلی ہے جس کو اس وقت تک اکثر عوام الناس نہیں بوجھ سکتے ، تبدیلِ سلطنت یوں بھی کچھ آسان بات نہیں اور پھر ایسا تبدل کہ حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں نہ وطن ایک نہ زبان ایک نہ مذہب ایک پس ہندوستانیوں کے حق میں سلطنت کیا بدلی گویا ساری خدائی بدل گئی ۔ اگلے تمام ذریعے معطل ، ساری لیاقتیں بیکار ، کل تدبیریں بے اثر ......

اب ہر ایک منصف مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے کہ اس گروہ کو انگریزی عملداری سے ناخوش ہونے اور رہنے کی وجہ معقول تھی یا نہیں ۔"

اس سلسلہ کی ایک کڑی اور ملاحظہ ہو ، بنات النعش میں ایک جگہ بادشاہ اور رعایا کے تعلقات پر کچھ عورتوں میں بحث ہو جاتی ہے ۔ استانی جی آخر میں رائے دیتی ہیں :- " جتنے بادشاہ ہیں سب لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں جب دنیا میں بہت آدمی ہو گئے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہونے لگا .... تجویز یہ ٹھہری کہ آپس میں کسی شخص کو سردار بنا لیں ۔ سب اس کا حکم مانیں اور اس کی اطاعت کریں اور اس سردار کا کام یہ ہو کہ وہ لوگوں کے جھگڑے طے کر دیا کرے ۔ رعایا کی جان و مال و آبرو کا نگہبان رہے ۔ اسی کا نام بادشاہ ہوا لوگوں کا کام ہے اس کی اطاعت کرنا اور بادشاہ کا کام ہے رعایا کو آرام دینا "

اگر یہ مان لیا جائے کہ ان اقتباسات کے پس پردہ مصنف خود بول رہا ہے تو نذیر احمد کا سیاسی نظریہ واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے ۔ پہلے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں اور فرنگیوں میں مختلف وجوہ سے بڑا بُعد پاتے تھے اور اس نتیجہ پہنچے کہ ہندوستانی اور انگریز کبھی شیر و شکر نہیں ہو سکتے ۔ اتنے بنیادی اختلافات ہیں کہ ہندوستانیوں کا انگریزی عملداری میں خوش رہنا ناممکن ہے کیونکہ حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں ۔ انگریزوں کے آجانے سے ہندوستانیوں کو محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا سب کچھ کھو گیا اور وہ بیک جنبشِ قلم انگریزوں کی بدولت عضوِ معطل ہو گئے ۔ نذیر احمد سیاسی آدمی نہ تھے مگر ان خیالات میں انہوں نے نفسی تحلیل پیش کی ہے وہ ان کے نکتہ رسی کا پورا ثبوت ہے ۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کس طرح ملک و حالات اور واقعات کا مطالعہ کیا تھا اور حقیقت کو کتنی پختگی کے ساتھ محسوس کر لیا تھا ۔ دوسرا اقتباس بھی ان کے خیال کی بلندی اور آزادیٔ فکر کی بین دلیل ہے حالانکہ انگریزی شہنشاہیت اس وقت شباب پر تھی ۔ غدر کے بعد ایک مدت تک انگریزوں کی سخت گیری زبان بندی کا کام کر رہی تھی اور یہ کتاب (بنات النعش) غدر کے صرف ۱۵ سال بعد شائع ہوئی اس میں عوام کی قوت و حقوق کو اس طرح بیان کرنا

کہ بادشاہ لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں بڑی دیدہ دلیری کا کام تھا گویا عوام کو یہ سمجھانا تھا کہ تمہاری اجتماعی قوت بادشاہ کی قوت سے زیادہ ہے اور نیز یہ کہ بادشاہ کا فرض اوّلین ہے کہ رعایا کی جان و مال و آبرو کی نگہبانی کرے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے کو بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ نہ حکومت سے ڈرتے تھے نہ مذہب والوں سے۔ جو کچھ سوچتے تھے اس پر پختگی کی مہر لگا دیتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی اور بات ناقابل قبول ہے۔ ان کی اصابت رائے میں شک ہو سکتا ہے ان کے نظریئے سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی بے باکی پر دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

نذیر احمد کی ذہنیت میں ایک بڑے مزے کا تضاد ملتا ہے جس قدر وہ روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں کنجوس تھے اتنا ہی الفاظ کا ذخیرہ لٹانے میں فیاض تھے بخل کی وجہ تو یہ تھی کہ وہ غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے مفلسی اور ناداری کے نشتروں سے دل پوری طرح واقف تھا۔ اس کو اب اپنے سے دور رکھنے کے لئے پائی پائی پر نظر تھی مٹھی ہمیشہ بند رہی لیکن الفاظ کے صرف میں ان کا رویہ بالکل برعکس تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی جزرسی کی تلافی روپے سے نہیں بلکہ الفاظ سے کرنا چاہتے تھے۔ جس سے روپیہ جمع کرنے میں ان کو لذت ملتی تھی۔ ویسے ہی الفاظ ضرب المثال محاورات کے لٹانے میں مزا ملتا تھا اور یہ مزا اس حد تک غلبہ پا گیا تھا کہ کسی قیمت پر اس کے ترک کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ گئے ان کی ایک کتاب امہات الامۃ نے ان کی ساری شہرت و نیک نامی میں آگ لگا دی۔ ازواج رسولؐ کے بارے میں لکھتے لکھتے الفاظ و محاورات کی بے اعتدالی اور اس مزے نے جو ان کو ملتا تھا غضب ڈھا دیا۔ کچھ ایسے نامناسب فقرے لکھ گئے جو ہر لحاظ سے قابل اعتراض تھے۔ ان کو پڑھ کر عام بے چینی پیدا ہوئی مسلمانوں کے جذبات نذیر احمدؒ کے خلاف اتنے مشتعل ہوئے کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ علماء کا اجتماع ہوا اور ان کی کتاب امہات الامۃ کا جتنا بھی ذخیرہ مل سکا سب کو یکجا کر کے تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ اس واقعہ کا نذیر احمد پر بڑا سخت اثر پڑا اس لئے کہ فطرتاً وہ رسولؐ اور ازواج مطہرات سے بڑی عقیدتمندی رکھتے تھے۔ نہ معلوم کتنا ریاض ان بزرگوں کے اخلاق و سیرت کی اشاعت پر کیا تھا۔ اور آج ان ہی کو ان بزرگوں کا مخالف سمجھا جا رہا تھا۔ ان کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے بعد نہ کچھ لکھ سکے نہ زیادہ دن تک جی سکے۔ یہ حادثہ ۱۹۱۱ء میں اور ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔

نذیر احمدؒ کی ذہنیت کی تشکیل میں مذہب کا عنصر جزو غالب ہے وہ بغیر اس کے لقمہ نہیں اٹھاتے۔ ہر اخلاقی تعلیم میں مذہب کی چاشنی موجود ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب و اخلاق کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا نا عاقبت اندیشی بلکہ حماقت ہے توبۃ النصوح کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔ "نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا بُو کو گل سے یا نور کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو گوشت سے علٰحدہ یا منفک کرنے کا قصد کرے۔" گویا ان کے نزدیک مذہب سے الگ ہو کر زندگی اخلاق کے دائرے میں نہیں رہ سکتی دوسرے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے خیال میں اخلاق کا شیرازہ بغیر مذہب کے قائم نہیں رہ سکتا۔ دنیا کا اور کوئی قانون اس کو راہ راست پر نہیں رکھ سکتا۔ ان کا ذہنی ارتقاء رسوم و قیود کا سہارا لئے ہوئے ہے۔ جو کچھ دیکھتے یا سنتے چلے آئے ہیں اسی پر اپنی تخیّل کا محل تعمیر کرتے ہیں اس سے الگ یا آزاد ہو کر کوئی نیا نظریہ یا نقطۂ نظر ان کے ذہن میں نہیں۔ چنانچہ نصوح کو جب حشر کے میدان میں لے جاتے ہیں اور وہاں کی روداد بیان کرتے ہیں تو خدا کو مجسٹریٹ اور اس کی جملہ کارروائیوں کو دنیا کی معمولی عدالتوں کا چربہ سمجھتے ہیں، خدا کے یہاں بھی حوالات دکھاتے ہیں۔ مجرم کے لئے فرد جرم تیار کراتے ہیں۔ گواہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوال و جواب کا سلسلہ پیدا کرتے ہیں اور آخر میں عدالتی فیصلے کی طرح خدا بھی اپنا حکم مجرم کو سناتا ہے۔ گویا خداوند عالم کی جملہ کارروائیاں ویسی ہی ہوں گی جیسے یہاں کچہریوں میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جدت و اختراع کا مادہ نہیں البتہ مذہب کی روح کو کما حقہٗ سمجھ لیا تھا۔ اور جو کچھ سوچا یا سمجھا تھا۔ اس پر سختی کے ساتھ کاربند تھے۔ اسی کو مشعل ہدایت بنا کر تمام دنیا کی تاریکیوں کو دور کرنے کی فکر تمام عمر کرتے رہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نذیر احمد کی انفرادیّت

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

یوں تو سرسیّد کے رفقا میں سے ہر ایک شخص غیر معمولی قابلیتوں کا مالک تھا اور اپنے اپنے خاص شعبوں میں ان میں سے کسی کی نظیر آج بھی موجود نہیں مگر مولوی نذیر احمد ——— جنھیں بعض لوگ ڈپٹی نذیر احمد کہنا پسند کرتے ہیں ——— ایک ایسے مصنّف تھے جن کی شخصیّت اور جن کا رنگِ تصنیف دوسروں سے منفرد تھا۔ یہ انفرادیت ان کے اکثر کارناموں کی اس رُوح میں مضمر ہے کہ انھوں نے سرسیّد کے بعد شاید سب سے زیادہ عام زندگی اور عام مسائل سے رابطہ رکھا۔ شبلی ایک عالمانہ شان رکھتے تھے اور بڑوں بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ادب میں بھی ان کا مذاق (اگر سوءِ ادب نہ ہو تو عرض کروں کہ) "لارڈ وائی" ہی سا تھا۔ شان اور تجمّل، نفاست و لطافت، "شرفائے ادب" کے سے ٹھاٹھ۔ غزل کدۂ بمبئی میں ہوں یا تربیت گاہِ ندوہ میں ——— وہ ہر جگہ ایک اشرافی شان سے نمودار ہوتے ہیں۔ مولانا حالی ——— خوش صفات حالی ——— ان کی سلامتِ مزاج تو ہر جگہ ثالثی اور مصالحت ہی کی قائل تھی ——— وہ ایک نرم رو ادیب تھے۔ نرم زبان اور شریفانہ لب و لہجہ، ان کا امتیازِ خاص تھا۔ اشرافیت سے دب کر چلنا ان کی وضع تھی ——— سرسیّد اپنے اشرافی پلیٹ فارم سے اُتر کر عوامی اپیل تک ضرور آئے مگر ذہناً جمہوری اشرافیت ہی کے دل دادہ تھے ——— ان میں سب سے زیادہ جس شخص کو ہم عام لوگوں کے قریب پاتے ہیں وہ نذیر احمد تھے جن کی اپنی زندگی عوام ہی کے ماحول سے اُبھری تھی اور ان تجربات سے مالامال تھی جن سے زندگی کی معرفتیں پا کر انھوں نے جمہور کی زندگی کو سنوارنے کے لئے ادب پیدا کیا جتنا اس دَور کے کسی اور شخص نے پیدا نہ کیا۔

نذیر احمد کے ضمن میں میں نے عوامی، اشرافی، لارڈ وائی وغیرہ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، ان سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے نذیر احمد کو تو ان اصطلاحوں کا ادراک ہی نہ ہوگا ——— مگر ان کی تصنیفی روح کا تجزیہ یہی کہتا ہے کہ وہ تھے عوام دوست شخص کیونکہ ان کی تصانیف کی غالب رُوح اس ہمدردی اور غمگساری کے جذبے سے لبریز ہے جو انھیں عام لوگوں کی زندگی کو سمجھنے اور ان کے لئے مناسب دستور العمل تیار کرنے پر مجبور کرتی رہی ——— اور یہی نہیں سرسیّد کے بعد شاید وہی بڑے مصنّف تھے

جن کی زبان بھی عام لوگوں کی زبان کے قریب تھی ——— یہ صحیح ہے کہ اس میں ایک مخصوص عالمانہ طبقاتی محاورہ ضرور پایا جاتا ہے مگر نذیر احمد کی گفتگو کی عمومی سطح عام ہی ہے۔

——— نذیر احمد نے بچوں کے لئے بھی کتابیں لکھیں اور قانونی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔

مگر ان کی تصانیف کے اہم موضوع دو ہیں۔ اوّل ان کی دینی تصانیف دوّم ان کے قصے۔ ان دونوں اصناف میں وہ اپنے رفقا سے منفرد ہی ہیں۔ یوں کہنے کو تو سر سیّد اور ان کے سارے رفقا نیچری کہلاتے تھے اور اس لحاظ سے نذیر احمد بھی "نیچری" ہی سمجھے جاتے تھے مگر نذیر احمد کی نیچریت بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ وہ مذہب کے معاملے میں آزاد اور تحقیق پسند آدمی تھے۔ وہ جس زمانے میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اس زمانے میں وہابی حنفی اختلاف بڑے زوروں پر تھا۔ اس میں بھی وہ آزاد اور غیر جانبدار رہے بعد میں سر سید کی رفاقت میں جو دینی جھگڑے برپا ہوئے اُن میں بھی ان کی راہ اپنی ہی تھی ——— وہ نہ تو سر سید کے اندھے مقلد تھے نہ سر سید کے مخالفوں کے پورے ہم نوا تھے۔ سر سید سے ان کا اشتراک صرف چند مسائل میں تھا۔ وہ سر سید کی طرح آزادیٔ رائے اور عقل کی اہمیت پر خاص زور دیتے تھے۔ تقدیر، توکل خیر و شر وغیرہ کے متعلق ان کا نظریہ وہی تھا جو سیّد کا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مذہب عین فطرت ہے اور سائنس اور دین کا آپس میں کوئی تعارض نہیں اور ترک دنیا کا خیال ایک غیر اسلامی خیال ہے۔ مسئلہ تقدیر میں بھی وہ سر سید کے ہم نوا تھے اور تعلیم جدید کے معاملات و مسائل میں بھی ان کے ہم آواز تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ سر سید کے خیالات سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔

وہ معجزات کے انکار میں ان سے متفق نہ تھے، وہ مغربی معاشرت کے معاملے میں سر سیّد کی سب باتوں کو صحیح نہ سمجھتے تھے اور بزرگان سلف کے اجتہادات کے متعلق ان کو وہ بدظنی نہ تھی جو عام طور پر سر سیّد کی تصانیف سے مترشح ہوتی ہے۔ حقوق و الفرائض میں انھوں نے ایک معتدل شریعت کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لچک اور سہولت پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد کی یہ دینی تصانیف اپنی جگہ خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اُردو کے مشہور ادیب مہدی الافادی نے ان کے تبحر کو اس درجہ اہمیّت دی تھی کہ رفقائے سر سیّد میں وہ سب سے زیادہ انہی کو اس کا استحقاق دیتے تھے کہ وہ اُردو میں ایک "قاموس اسلامی" مرتب کریں ——— اور حق یہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کو یہ فضیلت ضرور حاصل تھی کہ وہ اُردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی تدوین کی ذمّہ داری لے سکتے ——— مگر نذیر احمد کا مزاج، ان کا ذہن، اور ان کی طرز انشا یہ کہتی ہے کہ وہ قاموس کی علمی اور فنّی شان کو برقرار رکھنے کی طبعی صلاحیت نہ رکھتے تھے ——— وہ تو ہر چیز کو ایک عوامی سطح اور عوامی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور تھے اور اسی سے انھوں نے ہر چیز کو دیکھا ——— وہ تو قرآن مجید کے ترجمے میں بھی عامی یا عوامی زبان استعمال کرنے سے باز نہ رہ سکے ——— اور یہ ایک واقعہ ہے کہ انھیں اپنی عوامیت کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ تاہم نذیر احمد کے دینی تبحّر سے انکار ناممکن ہے۔

نذیر احمد کی قابلیتیں دینی تصانیف سے زیادہ ناول میں ظاہر ہوئیں۔ انھوں نے دین کی خدمت میں ناولوں سے بڑا کام لیا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی دینی تصانیف کو وہ درجہ نہ دلوا سکے جو ان کے ممتاز معاصر شبلؔی کی علمی کتابوں کو حاصل ہوا مگر انھوں نے عوام میں دین کی تبلیغ شبلؔی سے کہیں زیادہ کی۔ اس سے ان کو بھی شہرت حاصل ہوئی اور ان کی تصانیف کو بھی قبولِ عام نصیب ہوا، غرض زبان، مزاج، لب و لہجہ، اندازِ فکر ——— ان سب چیزوں میں نذیر احمد اپنے دوسرے رفقا سے الگ اور منفرد شخص تھے، وہ اوروں سے الگ طرز پر سوچتے تھے اور ان سے الگ طریق سے بات بھی کر جاتے تھے۔

نذیر احمد نے بہت سے قصّے لکھے، مراۃ العروس، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، توبۃ النصوح، ایامیٰ، رویائے صادقہ۔

ان سب میں نذیر احمد بہت اچھے ناول نگار نہ سہی ایک منفرد مبلغ اور بعض جمہوری معاشری مشکلات و مسائل کے اچھے ترجمان اور نباض ضرور ثابت ہوئے ہیں۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ وہ قصہ نویس سے زیادہ واعظ تھے کیونکہ انھوں نے اپنے قصوں سے دینداری، خدا پرستی اور اصلاح معاشرت کا کام لیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں قصہ نویسی کے فن پر عبور نہ تھا۔ ان کے پلاٹ کمزور ہوتے ہیں اور کردار کی تعمیر میں بھی انھیں کوئی خاص دستی حاصل نہیں۔ یہ سب درست ہے مگر نذیر احمد اردو کے اوّلین ناول نگار تھے جو واعظ بھی تھے ——— اسی لئے انھیں طنزاً یا حقیقتاً واعظ ناول نگار یا ناول نگار واعظ بھی کہا گیا ہے ——— مگر وہ فن کے پرستار نہ تھے نہ فن کار ہونا ان کے لئے کوئی بڑی کشش کی چیز تھی ——— وہ تو مصلح اور رفاہ عام ہی میں ہی اپنی عزت سمجھتے تھے ——— اور اس اعزاز کے لئے انھوں نے وعظ اور ناول دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعے انھوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ انھوں نے اپنی پُر زور خطابت سے اپنے سامعین کو جس طرح گرمایا اسی طرح اپنے موعظتی ناولوں سے اپنے قارئین کو تڑپایا ——— دونوں میدانوں میں شئے "ایک ہی کام کر رہی تھی ——— بات ایک تھی موقعے دو، بقول غالب ؎

دہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

بہرحال ان کو اگر کوئی ناول نگار نہیں کہتا نہ کہے مگر ناول کی کوئی تاریخ ان کے ذکر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی ——— ان کے ناولوں کو ناول نہ کہئے قصہ کہہ دیجئے کہانی کہہ دیجئے کچھ کہہ دیجئے انھوں نے اپنے زمانے کے عام لوگوں کی (جن میں متوسط درجے کے لوگ بھی شامل ہیں) زندگی سے اعتنا کیا ہے ——— یہ اور بات ہے کہ وہ ناول کے اصول کے مطابق بات نہیں کر سکے ——— مگر ان کے اوّلین ناول نگار ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے نزدیک وعظ اور ناول کے درمیانی فاصلے کچھ زیادہ نہ تھے ——— مگر انھوں نے پریوں اور جنّوں کی کہانیاں نہیں لکھیں انھوں نے انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ انھوں نے میر امّن کی طرح کوئی باغ و بہار بھی نہیں لکھی نہ چار درویشوں کو سیر کرائی۔ وہ تو اپنے زمانے کے "درویشوں" کی سیر کا مطالعہ کرتے رہے اور ان کی سیر کے مرقعے تیار کرتے رہے جن کے سچّے واقعات اور حقیقی زندگی صرف تفریح کے خیال سے نہیں عبرت و اصلاح کے خیال سے بھی داستانوں سے ہزار درجے زیادہ دلچسپ اور دلکش تھی ——— نذیر احمد بات کرنے کے ڈھنگ سے بے خبر سہی مگر باتیں ان کے اپنے ہی دَور اور سوسائٹی کی تھیں ——— ناول کی طرح بات کرنے یا بات بنانے یا کہانی گھڑنے کا فن تو بڑی مدّت کے بعد بھی ہمارے ملک میں لوگوں کو نہیں آیا مثلاً شرؔر کو دیکھئے وہ تو سامنے کی عام زندگی سے صاف بچ کر تاریخی ناول میں جا نمودار ہوئے (ان کے معاشرتی ناول بھی واقعیت سے کنّی کتراتے رہے ——— اپنے زمانے کی باتیں کہنے کو آسان ہیں مگر لکھنے کے لئے بڑی ہمّت درکار ہوتی ہے)۔ سرشار نے کچھ ہمّت کی مگر زندگی کے مصوّر ہونے پر بھی وہ کالزوروی کے CETHRU کی طرح "بدی کے کوچے میں چراغ لے کر" صرف گھومتے گھامتے رہے۔ سرگشتگانِ وادیٔ غفلت کو کوئی روشن راہ تو نہ دکھا سکے ——— ہاں نذیر احمد نے اس کوچے میں قدم رکھا اور مردانہ وار رکھا اور ان کے CETHRU نے تو "چراغ سرِ راہ" کی مدد سے لوگوں کو روشنی بھی دکھائی۔

ہمارے نقادوں نے نذیر احمد کے ناولوں کو موعظتی کہہ کر فنّی لحاظ سے ان کی تنقیص کی ہے ——— اور خالص فن کے نقطۂ نظر

ہے ان میں نقائص ہیں بھی ——— مگر میں اب تک اس نظریے سے مانوس نہ ہو سکا کہ ادب میں اخلاق و موعظت کا کوئی عنصر آ ہی نہیں سکتا ——— سوال تو صرف اتنا ہی ہے کہ ادب میں اخلاقی عنصر کا پیوند اس طرح نہیں لگانا چاہیئے کہ کہانی کا "امکانِ وقوع" برباد ہو جائے اور خلافِ عقل و قیاس پہلو پیدا ہو جائیں ——— یہ عیب تو نذیر احمد کے ناولوں میں موجود ہیں ——— مگر اخلاقی عنصر کا موجود ہونا تو کوئی عیب نہیں۔

نذیر احمد کے ناول اُردو کے اوّلین ناول تھے۔ اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی سب خوبیوں کی تلاش بے کار ہے۔ ان میں ہندوستانی مسلمانوں کے اہم دَور کی معاشرت کی تصویریں ملتی ہیں۔ اس عہد کی ذہنیت، سماجی تصوّرات، معاشرتی نظریات کے بہترین مرقعے ——— جتنے نذیر احمد کے ناولوں میں ہیں اور کہاں دستیاب ہوں گے۔ ان کی وہی قدر و قیمت ہے جو ۱۸ ویں ۱۹ ویں صدی کے بعض انگریزی قصّوں کی ہے جن میں ڈکنز، تھیکرے اور ہارڈی کے احتجاجی قصّے اور EVANGELICAL NOVELS شامل ہیں ——— جس طرح انگریزی ناول کا یہ حصّہ اپنے نقائص کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہنے کے قابل ہے ——— اسی طرح نذیر احمد کے قصّے بھی زندہ ہی رہیں گے۔

اب آیئے نذیر احمد کے اہم قصّوں پر الگ الگ نظر ڈال لی جائے۔ سب سے پہلے ابن الوقت کو لیجئے۔ بعض مبصرین کے خیال میں ابن الوقت نذیر احمد کی ناکام ترین تصنیف ہے ——— ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ اس زمانے کے جدید تعلیم یافتہ گروہ کی کھوکھلی معاشرت اور ثقافتی کو اس سے زیادہ کس ناول نگار نے (اپنے کس ناول میں) پیش کیا ہے ——— فنی نقائص تو نذیر احمد کیا، اس دَور کے ہر دوسرے ناول نگار کے ہر ناول میں بھی موجود ہیں۔ نذیر احمد کے ناول مقصدی اور موعظتی بھی ہیں۔ اس سے بھی کسی کو انکار نہیں، پھر ناول کا رکنِ اعظم۔ جذبۂ محبت۔ نہ ان کے اس ناول میں ہے نہ کسی اور ناول میں۔ مگر ابن الوقت میں اس عبوری دَور کی ذہنیت کی جو مرقع نگاری کی ہے۔ اس کی مثالیں تو بعد کے ناول نگاروں کی کتابوں میں بھی کم ہی ملیں گے۔ ابن الوقت اس عہد کے عام افکار اور تشکک و اوہام کا ایک پیکرِ مجسّم ہے۔ ابن الوقت میں اس زمانے کی سیاسی فضا کے مناظر بھی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ معرضِ تحریر میں آ گئے ہیں۔ انگریزوں کے خیالات، رعایا کے احساسات، سیاست و مذہب کی آویزش و مصالحت ——— اس کے زیرِ اثر ہندوستانی سوسائٹی کے تدریجی تغیرّات ——— یہ سب باتیں نذیر احمد کے ناول سے باہر اور کہاں ملیں گی؟

ابن الوقت ایک ایسے شریف زادے کی خیالی سرگذشت ہے جو پرانی معاشرت کو چھوڑ چھاڑ کر مغربی وضع اختیار کر لیتا ہے اور انگریزوں کی تقلید میں انگریزی طور طریقوں کو اپنا لیتا ہے مگر اس کے باوجود انگریز حاکم حکمرانی کے غرور میں اس کے طرزِ عمل کو ناپسند ہی کرتا ہے کیونکہ اس کے اس تملّق میں مغرور حاکم کو برابری کا ادّعا نظر آتا ہے ——— اور یہ وہ جرم ہے جو اس زمانے کے انگریز کو کسی طرح گوارا نہیں تھا ——— نتیجہ یہ کہ ابن الوقت بچارا از ایں سو رانده و ازاں سو درمانده رہتا ہے ——— اس خیالی تصویر کا واقعاتی اور تاریخی رُخ اگر دیکھنا ہو تو کیری کی کتاب GOOD OLD DAYS OF JHON COMPANY میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

خیال کیا گیا ہے کہ ابن الوقت کے لباس میں نذیر احمد نے سر سیّد پر چوٹ کی ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ نذیر احمد نے سر سیّد کے عروج اور قبولِ عام کے خلاف کسی پوشیدہ جذبۂ رقابت سے مغلوب ہو کر یہ کتاب لکھی ہے اور اس طرح دل کی بھڑاس نکالی ہے۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سب قیاس ہی قیاس ہے اور وہ بھی خاصا دُور از کار ——— یہ کتاب مولوی شبلی کی ہوتی تو ہم تسلیم بھی کر لیتے کیونکہ شبلی تو آخری دَور میں صاف صاف سر سیّد کے خلاف طنز و تعریض کر دیتے تھے مگر غریب نذیر احمد پر تو یہ الزام تو محض اتہام ہے ——— اس لئے کہ نذیر احمد تو آخری عمر تک سر سیّد مرحوم کے مشن کے لئے تبلیغی اور واعظانہ دَورے کرتے رہے۔ ایسی صورت میں

ابن الوقت کو خواہ مخواہ سرسید کی تصویر قرار دینا خود سید صاحب کی ذات ستودہ صفات پر ناروا حملہ ہے۔ ابن الوقت میں تو داخلی طور پر کئی باتیں ایسی بھی بیان کی گئی ہیں جو سرسید میں موجود ہی نہ تھیں۔ نذیر احمد تو درکنار شبلی بھی سید صاحب کو اتنا گرا ہوا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کو انگریزوں کا خوشامدی سمجھتے ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ سرسید نے تو ملازمت کے باوجود بڑی غیورانہ زندگی بسر کی مگر ابن الوقت تو وہ شخص تھا جو اعلیٰ قابلیت کے باوجود بعض اوقات بہت گر جاتا تھا۔ یہ بات سرسید میں کہاں تھی؟ اس کے علاوہ سید صاحب کا سا تدین ابن الوقت میں کہاں پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ابن الوقت سرسید کی تصویر نہیں بلکہ انیسویں صدی کے آخری نصف کے عام انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان کی تصویر ہے جو انگریزوں کے وضع و اطوار کی نقالی میں اپنے اوپر اور اپنی تہذیب پر ہنسا کرتا تھا اور بعض اوقات اپنی غیرت و حمیت کو بھی چھوڑ بیٹھتا تھا۔

اس سلسلے میں یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ سرسید سے ان کے رفقا کی کش مکش کے افسانے اس بے جا عقیدت کا نتیجہ ہیں جو عموماً کسی محبوب شخصیت سے پیدا ہو جایا کرتی ہے اور جس کے ماتحت کسی کا معمولی اور دیانت دارانہ اختلاف بھی عقیدت مندوں کو گوارا نہیں ہوا کرتا ——— ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کے تہذیبی عقائد سے ان کے تقریباً ہر رفیق نے جزوی اختلاف کیا۔ نواب محسن الملک سے زیادہ سرسید کا ہمدرد اور دوست کون ہو سکتا ہے! یہ وہی محسن الملک ہیں جن کو سرسید "لمک ٹمی و ڈنک ڈمی" (تمہارا گوشت میرا گوشت ہے اور تمہارا خون میرا خون ہے) کہا کرتے تھے پھر کیا محسن الملک کے سرسید سے نظریاتی اختلافات کو ذاتی حسد و رقابت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مولوی حالی سے زیادہ شریف مزاج کون ہوگا مگر انھوں نے بھی حیاتِ جاوید میں کئی مسائل میں سید صاحب سے اختلاف کیا ہے۔ یہ سب دیانت دارانہ اختلافات تھے ——— اور نذیر احمد تو اس اختلاف میں بھی اوروں سے کچھ دھیمے ہی تھے۔ ابن الوقت سرسید پر چوٹ ہو یا نہ ہو اس کھوکھلی معاشرت پر یقیناً ایک کاری حملہ ہے جس کو قومی اور ملکی روایات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا ——— اور جس کا اختیار کرنا خود انگریز کی نظر میں ایک مضحکہ خیز فعل تھا کیونکہ اس میں بلا ضرورت خوشامد کا رنگ غالب تھا ——— اور قاعدہ ہے کہ خوشامدی خود اپنے ممدوح کی نظر میں بھی ذلیل ہو جایا کرتا ہے!

نذیر احمد کی تصنیف ابن الوقت ایک لحاظ سے "قبل از وقت" تصنیف تھی ——— یہ دراصل ایک احتجاج تھا اس بڑھتی ہوئی مغرب زدگی کے خلاف جس کا بھرپور اظہار جنگِ عظیم اوّل کے بعد کی تصانیف اور تحریکوں میں ہوا ——— ابن الوقت نذیر احمد کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ حجۃ الاسلام جو نذیر احمد کا ہیرو ہے باتیں تو لمبی لمبی کرتا ہے مگر پلّہ ہر جگہ ابن الوقت کا ہی بھاری رہتا ہے کیونکہ وہ قابل بھی ہے اور ذہین بھی۔!

یہ عجیب بات ہے کہ نذیر احمد کے بعض کردار ان کے محبوب کردار نہ ہونے کے باوجود ان کے بہترین کردار ہیں۔ مردانہ کرداروں میں ابن الوقت اور توبۃ النصوح کا کلیم اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کرداروں کی تعمیر سے انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں فنی صلاحیت بھی موجود تھی اور اگر وہ چاہتے تو اپنے ناولوں کو (اپنے زمانے کے معیار سے بھی) بلند تر سطح پر لے جا سکتے تھے۔

کلیم ایک رند لاابالی شخص ہے مگر اس کے ساتھ بڑا با مذاق اور فن پرست بھی ہے۔ کلیم دین و مذہب سے بیگانہ سہی مگر علم و فن سے بیگانہ نہیں۔ اس کے پاس ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے جس میں آرٹ اور ادب کے گرانمایہ جواہر نظر آتے ہیں اگرچہ نصوح کو ان انمول موتیوں سے محبت نہیں مگر اس کا "چشم و چراغ" انھی چیزوں سے محبت رکھتا ہے۔ کلیم میں وہ خودنگری بھی پائی جاتی ہے جو اکثر اہلِ کمال میں ہوا کرتی ہے۔ وہ طبعاً آزاد اور وسیع المشرب ہے مگر میاں نصوح کے نزدیک یہ سب کچھ ہیچ ہے۔ نذیر احمد نے کلیم کی تخلیق میں اپنی ہنروری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بہرحال کلیم نذیر احمد کا لافانی کردار ہے! اور ظاہر دار بیگ بھی اردو ادب کا ایک زندہ رہنے والا لفنگا دوست ہے۔ اس کی ظاہرداری اور سخن سازی اور مہذب ریاکاری بھی ہر

طرح سچائی اور حقیقت کے قریب ہے۔

مراۃ العروس کی اصغری اکبری میں بھی نذیر احمد نے بڑی احتیاط اور دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے مگر ان دو نسوانی کرداروں میں سچائی نہیں پیدا ہو سکی ـــــ سر سید نے مراۃ العروس کے متعلق یہ اعتراض کیا تھا کہ نذیر احمد نے مراۃ العروس لکھ کر زنانہ سوسائٹی پر ایک اتہام باندھا ہے ـــــ ممکن ہے یہ درست ہو اور سچ مچ نذیر احمد کے زمانے میں خواتین کی شائستگی بلند معیار کی ہو ـــــ مگر مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مراۃ العروس کے مردانہ کردار زنانہ کرداروں سے زیادہ عیب دار ہیں۔ عورتوں میں اور نہیں کم از کم اصغری سگھڑ اور باشعور تو ہے۔ مردوں میں تو میاں کامل ہو یا میاں عاقل یا کوئی اور سب بے شعور سے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مراۃ العروس اور بنات النعش اپنے رنگ کی اوّلین دلچسپ کتابوں کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئیں ـــــ مگر یہ کتابیں ابن الوقت، توبۃ النصوح اور فسانۂ مبتلا کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

فسانۂ مبتلا نذیر احمد کا شاید کامیاب ترین قصہ ہے۔ اس کے تین لاجواب کردار مبتلا، غیرت بیگم اور ہریالی مصنف کی کردار نگاری کے کامیاب نمونوں کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں ـــــ ناول تو یہ بھی مقصدی ہے مگر فن کے اسرار و رموز سے جو واقفیت اس قصے میں نظر آتی ہے ان کے کسی دوسرے ناول میں موجود نہیں۔ اس میں پلاٹ کی تعمیر مناسب، مربوط اور معقول ہے۔ اس میں گفتگوؤں کا طول کم اور مکالموں کی ہیئت فطری ہے اور مقصد فن کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اعتراض کی گنجائش بہت کم نکلتی ہے۔

ایامیٰ اور رویائے صادقہ بھی ان کے قصے ہیں۔ ایامیٰ میں آزادی بیگم کے کردار میں خاصی سچائی ہے۔ اگرچہ اس قصے کے کردار بھی مکالموں میں باتوں کی بجائے لمبی تقریریں کرتے ہیں مگر ایامیٰ میں نذیر احمد نے نفسیاتی تجزیے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رویائے صادقہ میں دیانتداری، خدا پرستی، اوہام باطلہ کی تردید، تعلیم جدید کی خرابیاں اور علی گڑھ کالج میں تعلیم و تربیت کا حال اور اس کے نقائص بیان کیے گئے ہیں مگر رویائے صادقہ میں نذیر احمد کی واعظانہ حیثیت سب سے زیادہ ظاہر ہوئی ہے۔

نذیر احمد کے فن پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے ہیں مگر بڑے اعتراض دو ہیں؛ اوّل ان کے ناولوں کا واعظانہ انداز، دوم ناول کی ہیئت کے متعلق بے شعوری۔ وہ فارم (ہیئت) سے زیادہ بیانات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انھیں یہ اشتیاق رہتا ہے کہ جو کچھ کہنا ہے سب کچھ (ساری جزئیات سمیت) فی الفور کہہ دیا جائے۔ محل مقام کی ہیئتی کا خیال وہ بہت کم رکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تو ماننا ہی پڑیگا کہ نذیر احمد کی قوتِ مشاہدہ تیز تھی اور انھیں جزئیات پر بڑا عبور تھا ـــــ ان کے قصوں کی کمزوری کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں اپنے نقطۂ نظر کو زور سے (خطابی اور ہیجانی انداز میں) ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کی عقل پسندی کے بڑے نمائندے ہیں مگر اس عقل پسندی کے باوصف ان کی تکنیک میں عقلیت اور منطقیت کم ہے ـــــ ناول بھی "تناسب، معقولیت، حدِ مناسب کا تقاضا کرتا ہے اور یہ سب چیزیں وہ ہیں جن میں نذیر احمد کی عقل پسندی دب سی گئی ہے۔ وہ نظریاتی لحاظ سے عقل پسند ہیں ورنہ یوں سراسر جذباتی ہی معلوم ہوتے ہیں ـــــ اور ناول میں مقصد سے عشق کا اگر کوئی نقصان ہے تو یہی ہے کہ اس میں ناول نگار اپنی معقولیت کو فراموش کر دیتا ہے۔

گزشتہ مباحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ نذیر احمد کی قلم کاری کا نصب العین محض چند مخصوص سماجی اور معاشرتی تصورات کی اشاعت تھا ورنہ شاید قصہ نویسی کا فن ان کا منتہائے مقصود تھا ہی نہیں، وہ سر سید کے ایک ہم کار اور رفیق اور اس دور کے ایک مذہبی اور مجلسی مصلح تھے ـــــ اور ان کے حق میں یہ کلمات ان کی شان اور ان کی اہمیت کی تنقیص کے مقصد سے استعمال نہیں ہوئے بلکہ فی الحقیقت خود ان کا اپنا مقصد اور نصب العین بالارادہ بھی یہی تھا، اس لئے فن کی بحث کو چھوڑ کر اب ہم ان افکار و تصورات

کی اجمالی فہرست پیش کرتے ہیں جن کی اشاعت کی خاطر نذیر احمد نے قصہ نویسی اختیار کی۔

نذیر احمد کے رجحانات اور تصورات تقریباً وہی تھے جو سرسید کے رفقا کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اصل جذبۂ محرک تھا قوم کی اصلاح و ترقی کا خیال اور نئے حالات میں مجلسی و دینی افکار کی جدید تعبیر و توجیہہ ـــــــ سرسید کے سب رفقا کی طرح نذیر احمد کا مقصد بھی یہی تھا جس کو انھوں نے اپنی دینی کتابوں کے علاوہ اپنے قصوں میں بھی پیش نظر رکھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے انھوں نے مذہب کی طرح خود تمدنی اور مجلسی امور میں عقل کی کارفرمائی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ سرسید کے رفقا میں اگر شبلی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے اسلامی تاریخ کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر تاریخ کا ایک معقول تصور ہمارے سامنے رکھا تو نذیر احمد کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے مجلسی زندگی کا ایک مثالی مگر معقول نمونہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ بہر حال معقولیت ان کے تصورات کا بنیادی وصف ہے۔ اس میں نذیر احمد کی خاص خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ان "معقولی" صلاحیتوں کو گھروں کی آبادی اور خانگی زندگی میں خوشحالی اور مسرت پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا ـــــــ اور یہ اس معنی میں بہت بڑا کارنامہ ہے کہ خانگی مسرت قومی ترقی میں بہت بڑی حد تک ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ اس غرض کے لئے انھوں نے عورتوں کو منزلی زندگی کا سنگ بنیاد قرار دیا کیونکہ اچھی عورتیں ہی کارکن مردوں کو کارہائے نمایاں انجام دینے کے قابل بنا سکتی ہیں۔ جن گھروں میں عورتیں مردوں کے لئے ذہنی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں وہاں کے مرد زندگی میں کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کا سارا وقت اپنی عورتوں کے مسائل حل کرنے میں گذر جاتا ہے۔ نذیر احمد منزلی زندگی کے اس راز سے اچھی طرح باخبر تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ قومی ترقی کے لئے عورتوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کی بے حد ضرورت ہے اس کے لئے انھوں نے اصغری، حمادہ اور آزادی بیگم کے مثالی کردار ہمارے سامنے پیش کیا۔

نذیر احمد کے ان تصورات پر دو اعتراض کئے جاتے ہیں:- اوّل یہ کہ انھوں نے اپنے طبقے (متوسط طبقے کے نچلے درجے کے لوگوں) کے کردار پیش کئے ہیں اور قصہ نویسی سے مقصد بھی انہی کی اصلاح تھی۔ دوم یہ کہ ان کے نسوانی کردار جدید معاشرت میں زندہ رہنے کے مستحق نہیں ـــــــ ہمارے نزدیک یہ دونوں اعتراض بے جا ہیں ـــــــ نذیر احمد کے قصے عام مسلمانی معاشرت کے لئے آج بھی مفید اور نفع بخش ہیں۔ ان کے نسوانی کردار بلاشبہ جدید نہیں مگر ہماری معاشرت میں منزلی زندگی کو پُر اطمینان بنانے کے لئے "جدید سیرتوں" سے زیادہ نذیر احمد کی مثالی صورتیں آج بھی زیادہ کامیاب ہو سکتی ہیں ـــــــ اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغربی تصورات میں پلی ہوئی "بخود مشغول" اور "خود نگر" خواتین مردوں کی مشکلات میں اس طرح تعاون نہیں کر سکتیں جس طرح وہ خواتین جن کے نقشے نذیر احمد نے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ ہماری سوسائٹی کو آج پھر اصغری کی ضرورت ہے۔

نذیر احمد نے توبۃ النصوح میں کلیم کو ایک فن دوست اور نصوح کو ایک فن دشمن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نصوح کی زبان سے فن اور ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ نذیر احمد آرٹ اور ادب کے مخالف تھے اور محض "مولوی" تھے۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ قوم کے تعلیم یافتہ لوگ آرٹ اور ادب میں دلچسپی لیں۔ مگر یہ نذیر احمد کے ساتھ زیادتی ہے۔ نذیر احمد آرٹ اور ادب کے مخالف نہ تھے۔ وہ ایک مقصدی دور کے ادیب تھے اور ادب کی افادیت کے قائل تھے۔ ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آرٹ اپنی ذات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا جو آرٹ برائے آرٹ اور جو ادب برائے ادب ہے وہ بے بنیاد بلکہ مضر ہے۔ آرٹ اور ادب کو زندگی کے لئے مفید ہونا چاہیئے ـــــــ اخلاق اور ادب کے سوال پر بھی ان کا نقطۂ نظر یہی ہے۔ فحاشی اور عریانی سحر البیان میں ہو یا گلستان میں، ان کے نزدیک مضر اور مہلک ہے ـــــــ بس یہی نذیر احمد کے خیالات ہیں اور یہ وہ خیالات ہیں جن پر بعد کے افادیت پسندوں نے خصوصاً اقبال نے ـــــــ مہر تصدیق ثبت کر دی ہے ـــــــ نذیر احمد قومی تعمیر کے

اوّلین دَور کے رہنماؤں میں سے تھے اس لئے انھوں نے ادب اور خصوصاً رائج الوقت یا روایتی ادب کے متعلق جس نظریئے کا اظہار کیا وہ قابلِ اعتراض معلوم نہیں ہوتا ــــ اور اس سے ان کی کسی "مولویت" کا ترشّح نہیں ہوتا ــــــ اور اگر اس کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد کو کوئی شخص مولوی نذیر احمد کہہ دے تو ان کی یہ مولویت بھی نہایت مستحسن مولویت ہے۔

نذیر احمد کا دین کیا ہے؟ اصلاحِ معاش اور فکرِ معاد! ان کے نزدیک ایک مکمّل دین دار وہ ہے "ــــــ جو غصّے کو پی جائے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، حریص وطامع نہ ہو، جابر اور سخت گیر نہ ہو، مُمسک اور بخیل۔ نہ ہو، مغرور اور متکبّر نہ ہو وغیرہ وغیرہ"ــــــ غرض اس میں ایک اعلیٰ درجے کے انسان کی تمام صفات موجود ہوں۔ اس مکمّل انسان کی صحیح تصویر وہ ہے جو نذیر احمد نے حجۃ الاسلام کی زبان سے ابن الوقت میں کھینچی ہے۔

نذیر احمد کا دیندار کوئی تارکِ دُنیا عابد وزاہد نہیں بلکہ دنیاوی فہم وفراست سے بھی آراستہ ہے ــــــ وہ سخت کوش بھی ہے اور نیک عمل بھی ــــ اس کی خدا پرستی اس کو دُنیا داری سے نہیں روکتی بلکہ ایک کامیاب دُنیا دار بناتی ہے۔

نذیر احمد کی دُنیا داری میں کفایت شعاری اور جزرسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ در اصل ان کے ان تجربات کی وجہ سے ہے جو انھیں اپنی زندگی میں حاصل ہوئے۔ انھوں نے زندگی میں غربت وافلاس کی تکلیفیں اُٹھائیں اس لئے انھیں روپے کی قدر وقیمت کا بڑا احساس تھا بنا بریں وہ یہ چاہتے تھے کہ قوم کے سب افراد اس کی اہمیت کو پہچانیں خصوصاً غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے۔ کہ وہ روپے کا صحیح مصرف پہچانیں اور اپنا روپیہ فضول اور بیکار ضائع نہ کریں۔

اس عہد کے مخصوص سیاسی تعلیمی اور معاشرتی تصوّرات میں نذیر احمد کبھی سرسیّد کے ہم خیال نظر آتے ہیں کبھی مخالف۔ ابن الوقت کے بھیس میں انگریزی لباس پر چوٹ دے کی ہے یا سیّد صادق کے خطوں میں علی گڑھ کالج کے غیر اسلامی ماحول کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ جدید انتہا پسندی اور غلوّ کے خلاف ایک ردِّ عمل ہے مگر سیاسیات میں نذیر احمد سیّد صاحب سے پُورے پُورے متفق معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ مجلسی اور معاشرتی اُمور میں وہ اُن سے بہت مختلف تھے۔

نذیر احمد کے خیالات کے اس جائزے سے یہ بات اچھی طرح روشن ہے کہ وہ اس دَور کے صحیح نمائندہ وترجمان تھے ــــ انھوں نے اپنے دُوسرے رفقا کی طرح ذہن کو بدلنے کے لئے بہت سا ادب پیدا کیا ــــ اور یہ ادب ایسا ادب تھا جس کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا۔ اور اس لحاظ سے (جیسا کہ پہلے بیان ہوا) نذیر احمد کو سرسیّد کے رُفقا میں سب سے زیادہ "عوامی" کہا جا سکتا ہے (عوامی مزدور کارکن کا فنکار کے معنی میں نہیں جمہور کے معنی میں)

شبلی کے علمی کارنامے اور حالی کے فنّی شاہکار سب اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں (جیسا کہ تذکرہ ہو چکا ہے) مگر نذیر احمد کا دائرہ خطاب ان سب سے زیادہ وسیع اور اپنے زمانے کے نثر نگاروں میں ان کی مقبولیت سب سے زیادہ تھی کیونکہ ان کی کتابوں کو خاص اور عام، مرد اور عورت، امیر اور غریب، دیندار اور دُنیا دار سبھی پڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ ان کی کتابوں کی علمی سطح اتنی بلند نہیں جتنی ان کے دُوسرے رفقا کی کتابوں کی ہے۔ ہم ان کو اُردو کے بہت بڑے مصنّفوں اور انشا پردازوں میں شمار کرتے ہیں ــــ اور ہر چند کہ فنّی لحاظ سے ان کے ناولوں پر اور علمی لحاظ سے ان کی دینی کتابوں پر اعتراض وارد کئے گئے ہیں مگر ناولوں میں ابن الوقت، فسانۂ مبتلا اور توبۃ النصوح اور علمی کتابوں میں الحقوق والفرائض اُردو ادب کے ساتھ دوامی عمر پائے گی۔ ڈاکٹر جانسن کے بقول ادبی مذاق کے بدل جانے کے باوجود "فیلڈنگ کی TOM JONES ابھی متروک نہیں ہوئی" ہمارے نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود ابن الوقت اور فسانۂ مبتلا ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

نذیر احمد کا اسلوبِ بیان بھی ان کے فن کی طرح منفرد ہے ——— ان کے اسلوب کے خصائص ان کے رفقا کے اسلوب میں کہیں نہیں ملتے۔ وہ ایک خاص قسم کی زبان لکھتے ہیں جو علمی بھی ہے اور عوامی بھی ——— مولوی سعید انصاری نے اپنے رسالہ شبلی میں ان کی زبان کو سوقیانہ اور عامیانہ کہا ہے ——— مگر اس کے لئے صحیح لفظ شاید عوامی ہوگا۔ ان کی زبان عامیانہ نہ تھی۔ عوامی تھی اور عوامی وہ زبان نہیں جو درجہ ادب سے گری ہوئی ہو بلکہ وہ زبان ہوتی ہے جس کو عوام اور خواص دونوں طبقے سمجھتے ہوں اور زندگی کے عام استعمال میں لاتے ہوں۔ یہ زبان صرف مخصوص اشرافیوں کی زبان نہیں ہوتی۔ نہ یہ زبان ایسی ہوتی ہے جس کو اشرافی منہ لگانا ہی پسند نہ کریں ——— یہ تو ایک عام استعمال کی زبان ہوتی ہے جو بات چیت، بحث و مباحثہ، اور معاملہ و استدلال کے ہر موضوع میں استعمال ہو جاتی ہے۔

نذیر احمد کی زبان بھی اسی قسم کی ہے۔ اس میں ایک طرف وہ محاورات و کنایات ہیں جو قومی ذہانتوں اور معاشرتی لطافتوں کے آئینہ دار ہیں خصوصاً وہ جو گھروں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور دوسرے طرف وہ علمی محاورہ جو اس زمانے کے عام تعلیم یافتہ طبقے میں (بلکہ عام لوگوں میں بھی) مانوس و مقبول تھا ——— بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ نذیر احمد کی یہ دو رنگی زبان دو مختلف مزاجوں کی نمائندگی کرتی ہے جن سے نذیر احمد کا اپنا مزاج مرکّب تھا ——— چلئے یہ بھی سہی مگر اس دو رنگی زبان میں نذیر احمد نے جو یک رنگی پیدا کی ہے اس پر بد رنگی کا داغ نہیں لگا ——— مجموعی لحاظ سے ان کی زبان خوش رنگ ہی رہتی ہے۔ عربی فارسی کے مقولے اور اصطلاحات نذیر احمد کے لئے روزمرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان ثقیل عناصر کو اپنی رواں عبارتوں میں اس مزے سے کھپایا ہے کہ ساری عبارتیں پُرخروش نغمہ بن گئی ہیں ——— کیونکہ یہی تو وہ بڑا نصب العین ہے جو نذیر احمد کے لئے ایک ذہنی غایت کا درجہ رکھتا ہے ——— تند و تیز لہجہ اور پرشور آہنگ ان کی اس خطابت کی یاد دلاتا ہے جس کی گونج آج تک بھی کچھ بڑی عمر کے لوگوں کے سامعہ میں خروش پیدا کر رہی ہے ——— پھر کیا اس پُرخروش آہنگ کے لئے لفظوں اور ترکیبوں کے خروش کی ضرورت نہ تھی؟ یقیناً تھی! ثقیل حروف اور ثقیل و غریب الفاظ نذیر احمد کی تحریروں میں بڑی قیمت پاتے ہیں ——— دنیا جس متاع کو رد کر دیتی ہے نذیر احمد اسی سے اپنی دکان سجاتے ہیں ——— نذیر احمد نرم الفاظ کے خریدار ہوں تب بھی ان کی انشا کی اصل سج دھج ثقیل اور کرخت الفاظ سے ہی بنتی ہے ———!

——— اور پھر یہ بھی ہے کہ نذیر احمد کی انشا میں اصل قوت بھی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے قلم میں غم و غصہ اور زجر و قہر کے جذبات موّاج ہو رہے ہوں ——— نذیر احمد کی پیاری تحریریں بھی شاید وہی ہوں گی جو سب سے تعصبی باتوں کی قائم مقامی کر رہی ہیں ——— ان موقعوں پر طنز و تعریض، اشارہ و احتجاج، قہر و عتاب، عربی کی ضرب الامثال، مصرعے اور مقولے، زنانہ اور طبقاتی محاورات، مسلسل اور مفرد تراکیب سب ایک ایسے آہنگ سے منظم ہو کر ایسے خوبصورت پیرایۂ بیان میں متشکل ہو جاتی ہیں کہ ان کا اثر قبول کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

نذیر احمد اپنے بیان میں جزئیات کو جس طرح لپیٹتے آتے ہیں اس سے ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ کی تشبیہ سوجھتی ہے، جس کی لپیٹ میں ہر چیز سما جاتی ہے۔ کوئی چیز ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ سے باہر نہیں رہ سکتی۔ نذیر احمد کے بیان کی اسی وسعت طلبی سے متاثر ہو کر مہدی الافادی پکار اُٹھتے تھے کہ اس شخص کی وسعتِ نظر تو یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ یہ اسلام کی قاموس لکھے ——— یہ تو وسیع بازوؤں والا ادیب اور عالم ہے اور ایک لحاظ سے یہ توقع غلط بھی نہ تھی اگرچہ قاموس کی ہمہ گیری تفصیلِ بیان کی نہیں اعجازِ بیان کی متقاضی ہوتی ہے اور نذیر احمد کو اس اعجازِ بیان پر قدرت ہی نہیں تھی ——— یہ تو شبلی کا حصہ تھا کہ وہ وسیع مضامین کو چند لفظوں میں ادا کر سکتے تھے نذیر احمد اس میدان کے مرد نہ تھے وہ تو وہاں کام کے آدمی ثابت ہوتے تھے جہاں بازوؤں کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی تھی

— نذیر احمد ناموس کے لیئے نہیں عوامی خطابت کے لئے موزوں تھے ——— ان کی خطابت اور انشا کو قید نہیں کیا جا سکتا تھا ——— وہ قید بھی ہوئے تو شاید ترجموں میں قید ہو سکے جہاں اصل کی پابندی قدم قدم پر انھیں ٹوکتی جاتی تھی کہ دیکھئے صاحب زیادہ باز و پھیلا نہ دیجئے گا ——— اور یہاں بھی بسا اوقات ایسا ہوا کہ نذیر احمد تھک کر انگڑائیاں لینے لگے اور کچھ پابندیاں جو زور سے عائد کر رکھی تھیں وہ خود ہی توڑ ڈالیں ——— ان کے قانونی تراجم بلا شبہ زیادہ مقید اور پابند ہیں کیونکہ ان میں قطعی اور معیّن حدوں میں چلے بغیر چارہ نہیں تھا ——— مگر باقی ہر جگہ پھیلاؤ ہی ان کی طبیعت کا رنگ اصلی ہے۔

نذیر احمد ہی اُردو کے وہ انشا پرداز ہیں جن کی باتیں زور دار ہوتی ہیں۔ حالی کی آواز دھیمی لہجہ مسکینوں جیسا، شبلی تیکھی مگر مختصر بات کہنے والے، آزاد میٹھی میٹھی رکبھی لمبی کبھی مختصر، کہانیاں کہنے والے۔ ان میں صرف نذیر احمد ہی وہ انشا پرداز ہے جو پُر زور انداز میں بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے لہجے میں بھی قوت، کرختگی اور صلابت ہے اور ان کے الفاظ میں بھی رُعب اور طنطنہ ہے ——— نذیر احمد لمبے فقروں اور طویل پیراگرافوں کے مطلق العنان حاکم تھے ——— سرسیّد بھی فقرے لمبے لکھتے تھے مگر جہاں سرسیّد کے فقروں سے یقین کا ملکہ پیدا ہوتا ہے وہاں نذیر احمد کے طویل پیراگرافوں سے خوف اور دہشت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ——— گھن گرج ——— کچھ جوش ملیح آبادی کی نظم کی طرح ——— بجلیوں کی چمک مگر رعد کی آواز ——— کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ——— مگر نذیر احمد کا منفرد اسلوب بیان دلوں پر اپنا سکہ جماتا چلا جاتا ہے ——— یہ خاص رنگ رفقائے سرسیّد میں سے کسی کو حاصل نہ ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مذہبی افکار

غلام جیلانی برق

ڈپٹی نذیر احمد کا زمانہ جو ۱۸۳۱ء سے ۱۹۱۲ء تک پھیلا ہوا تھا عجیب زمانہ تھا۔ ایک طرف ہندوستان بھر میں انگریز کا طوطی بول رہا تھا اور دوسری طرف دہلی میں مغلوں کا علم بھی لہرا رہا تھا۔ ایک طرف سیاسی طور پر مسلمان اسفل السافلین میں پہنچ چکا تھا اور دوسری طرف ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی کے لئے بھی تیاریاں کر رہا تھا۔ مذہبی لحاظ سے اگر ایک طرف وہ اوہام و خرافات اور تعصب و تنگ نظری میں چوٹی تک ڈوب چکا تھا تو دوسری طرف اس میں ایک ایسا انقلابی مفکر بھی پیدا ہو چکا تھا جس کے انوکھے افکار و نظریات کا ساتھ دینے کے لئے نہ زمانہ اس وقت تیار تھا اور نہ اب اور وہ تھا سرسید احمد خان۔

فکری لحاظ سے اسلام پر مختلف دور آئے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا زمانہ خالص قرآنی تعلیم کا زمانہ تھا۔ سیدھی سادی اور فطری تعلیم، نہ تصوف و طریقت کے جھگڑے۔ نہ فلسفہ و منطق کی موشگافیاں، خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوتے ہی فرقہ بازی کی وبا پھوٹ پڑی اور ساتھ ہی وضع احادیث کا طوفان چل پڑا۔ احادیث کی تعداد بڑھتے بڑھتے چودہ لاکھ تک پہنچ گئی۔ دورِ عباسیہ میں دل و دماغ پہ یونانی فلسفہ چھا گیا۔ زوالِ بغداد کے بعد طریقت نے زور پکڑا اور ہُو حق کے نعروں سے اسلامی دنیا گونجنے لگی۔ حالات اسی نہج پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ محمد صلعم کا لایا ہوا اسلام جب فلسفہ و طریقت، جعلی روایات و احادیث کی پریشاں راہگذاروں میں بارہ سو برس تک بھٹکنے کے بعد، انیسویں صدی میں داخل ہوا تو اسے کوئی بھی نہ پہچان سکا کہ یہ چیز کیا ہے۔ آخر پہچانتے بھی تو کیسے کہ اس اسلام کے پاس باقی تو سب کچھ موجود تھا یعنی خرقہ و تسبیح، حال و قال، شفاعت کا نشہ، جنت کا خمار، تقدس کا گھمنڈ، جہلم اور جمعرات کا حلوہ، عبا و قبا کی نمائش، دعا و تعویذ کا زور، اور صلوات و درود کا شور لیکن نہیں تھی تو ایک چیز یعنی قرآن۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان رسماً و اسماً تو مسلمان تھا لیکن درحقیقت اسلام سے بمراحل دور۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ یہ خانہ ساز عقائد میں از سرتا پا ڈوبا ہوا تھا۔ یہ جنت کو عمل کا نہیں بلکہ چند اوراد کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ اس کے پاس چند دعائیں ایسی بھی تھیں جن کے پڑھنے سے تمام گناہ معاف ہو جاتے تھے۔ اس کی تمام طاقت چند سطحیات مثلاً ریش و عبا وغیرہ کے نبھانے میں صرف ہو رہی تھی۔ اس کے قلب و دماغ کے کسی گوشے تک میں یہ تصور موجود نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ کہ مسرت و الم خیر و شر کے لازمی نتائج ہیں ـــــ لہٰذا

قرآن[1] خیر وشر کا مکمل ضابطہ ہے۔ اس کی کج فطری کا یہ عالم کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا تو اس بنا پر نہ صرف انہیں کافر و ملحد قرار دیا بلکہ ملاؤں کی ایک فوج نے انہیں مسجد میں جوتوں سے پیٹ ڈالا۔ بعد میں یہی "گناہ" جب ڈپٹی نذیر احمد نے کیا تو انہیں بھی خارج از اسلام قرار دیا گیا۔

مولانا حالی نے سرسید کی داستانِ زندگی یعنی "حیاتِ جاوید" میں ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے یہ حقیقت کہ اس وقت مسلمانوں کے دل و دماغ کی کیفیت کیا تھی، واشگاف ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ واقعہ انہی کے الفاظ میں حاضر ہے:

"سرسید کہتے ہیں کہ بجنور[2] فتح ہو جانے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے، رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اُترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا: "چائے پیو گے؟" میں نے کہا: "یہاں چائے کہاں؟" انہوں نے کہا "ہمارے ساتھ ہی ہماری بوتل میں موجود ہے۔" میں نے کہا: "بہت بہتر۔" غرض کہ ہم نے چائے پی اور ایک آدھ توس کھایا۔ وہاں سے چل کر نگینے میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے، میں بھی جا کر جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار سے جو جماعت میں شریک تھے پوچھا کہ صدر امین (سرسید) نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں۔ پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے ......

ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھالو اور خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے کہ آج ایک مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا، ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی (پامر کے اشارے کو) نہ سمجھا۔"

(حیاتِ جاوید)

قرآن میں نہایت وضاحت سے یہ درج ہے:

وطعام اھلِ الکتاب حِلٌّ لکم

(کہ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال[3] ہے)

لیکن جس قوم کے بیشتر تصورات غیر قرآنی ہو چکے تھے اس سے چھوت چھات کا مظاہرہ بھی غیر متوقع نہ تھا۔ چھوت چھات کے علاوہ مسلمان انگریزی کو کفر، علومِ طبیعی کی تحصیل کو الحاد، کاہلی کو توکل اور اپنی جہالت، ادبار اور بدحالی کو تقدیر الٰہی سمجھتے تھے۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں سرسید پیدا ہوئے اور ساتھ ہی مولانا نذیر احمد بھی۔ سرسید نے کیا کہا، ہمارے بحث سے خارج ہے۔ نذیر احمد نے کیا کہا، ملاحظہ فرمائیے:

وحدتِ مذاہب ۔ ہم چند سطور پہلے عرض کر چکے ہیں کہ انیسویں صدی میں مسلمانوں کے عقائد عجیب رنگ اختیار کر چکے تھے۔ قرآن

---

1 اس موضوع پر میری تازہ کتاب "اللہ کی عادت" کتاب منزل کشمیری بازار نے چند روز ہوئے شائع کی ہے۔

2 ۱۸۵۷ء کے جہاد میں بجنور انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا جسے انہوں نے دوبارہ فتح کیا۔ (برق)

3 بشرطیکہ اس کھانے میں وہ اشیاء شامل نہ ہوں جنہیں قرآن نے حرام قرار دیا ہے مثلاً شراب، سؤر وغیرہ۔

کے علاوہ حدیث، فقہ، اجماع، قیاس اور اقوالِ ائمہ وصوفیا مدارِ ایمان بن چکے تھے۔ اس صدی کے آخر میں سرسید نے ایک انوکھی صدا بلند کی کہ تورات و انجیل غیر محرف ہیں، کہ تمام آسمانی ادیان کی تعلیم ایک ہے، کہ ایک ایک عیسائی رحمت و مغفرت کا مستحق ہے۔ سرسید نے "تبیین الکلام" کے عنوان سے تورات و انجیل کی تفسیر بھی لکھنا شروع کر دی تھی جو مکمل نہ ہو سکی۔ اسی زمانے میں مصر کے ایک عیسائی جرنلسٹ مسٹر کرسٹوفر جبارہ نے قرآن و بائیبل کی وحدتِ تعلیم پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالی۔ جس کا نام تھا " وحدۃ الادیان و وحدۃ فی التوراۃ والانجیل والقرآن " ساتھ ہی ایک فرانسیسی بیرسٹر نے مصر سے ایک اخبار " الاتحاد الاسلامی " کے نام سے جاری کیا جس کا مقصد اسلام و عیسائیت میں وحدت پیدا کرنا تھا۔ تیس برس بعد ۱۹۲۳ء میں علامہ مشرقی کی انقلاب انگیز "تذکرہ" نکلی۔ گو علامہ بائیبل کی صحتِ متن کے قائل نہیں تھے لیکن "اسلام" کے مفہوم میں اس قدر وسعت پیدا کر دی کہ جہان بھر کے لوگ اس وسعت میں سما گئے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام نیکی اور بلند اعمال کا نام ہے، خالی عقیدوں کا نام نہیں۔ نیکی جہاں ہوگی، اسلام وہیں ہوگا۔ خواہ ایسا آدمی اسلام کے رسمی عقائد کا قائل ہو یا نہ ہو۔ مثلاً "حیا" کے متعلق ایک حدیث ہے "الحیاءُ نصفُ الایمان" کہ حیا آدھا اسلام ہے، یہ حیا عیسائی میں ہو یا یہودی میں، گبر میں ہو یا ہندو میں، وہ نصف مسلم سمجھا جائے گا۔

تذکرہ کے چار پانچ برس بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ مولانا نے "مالکِ یومِ الدین" کے تحت واضح کیا کہ اللہ نے اعمال کے ساتھ ان کے نتائج باندھ دئے ہیں اور یہ نتائج مرتب ہو کر رہیں گے۔ خواہ عامل مسلم ہو یا غیر مسلم، اور رسمی عقائد نتائج کو اعمال سے جدا نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل وہی بات تھی جو پانچ برس پہلے علامہ مشرقی کہہ چکے تھے۔ ان بزرگوں کی تحریرات کا اثر تھا یا فکرِ انسانی کی آخری منزل ہی وحدتِ انسان ہے۔ وجہ کچھ ہو، مغرب کے چند مفکرین نے بھی وحدتِ آدم پر کچھ کتابیں لکھیں۔ حکیم مشرق کا مسلک بھی یہی تھا، فرماتے ہیں:

تفریقِ مِلل حکمتِ افرنگ کا مقصود   اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام   جمعیتِ اقوام ؟ کہ جمعیتِ آدم ؟

آج وحدتِ آدم کی صدا زیادہ بلند ہو گئی ہے۔ اس موضوع پر میر ولایت علی صاحب حیدر آباد دکن سے کئی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ایک کتاب حال ہی میں سرگودھا کے ایک متمول زمیندار نے لکھی ہے۔ میرے ایک دوست یہ کتاب مطالعہ کے لئے لے گئے ہیں اور میرے حافظہ کی یہ کیفیت ہے کہ نہ کتاب کا نام یاد رہا اور نہ مصنف کا۔ میری اپنی تحریر "ایک اسلام" کا موضوع بھی یہی ہے۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ وحدتِ آدم کا نعرہ ہند کے مسلمانوں میں سب سے پہلے سرسید نے بلند کیا تھا۔ چونکہ مولانا نذیر احمد سرسید کے بڑے مدّاح تھے اور ان کی بہت سی باتوں سے متاثر ہو چکے تھے۔ دوسری طرف مولویوں سے بھی خائف تھے۔ اس لئے آپ نے اس مسئلے میں نہ تو سرسید کی ہاں میں ہاں ملائی اور نہ تردید کی۔ بلکہ کچھ بین بین سے رہے۔ مثلاً:

"جتنے مذہب دنیا میں ہیں وقت اور مقام کے لحاظ سے سب کے سب آدمی کی
اصلاح اور اس کے فائدے کے لئے چلے ہیں اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ فائدے اور
صداقت اور نیکی کا انش موجود ہے"

(لکچروں کا مجموعہ ص۱۵۴
ج دوم)

آج یہ فلسفہ اُبھر کر سامنے آگیا ہے کہ نسلِ آدم ایک کنبہ ہے۔ سب کے سب آدم کی اولاد۔ تمام مذاہب خدا کی طرف سے تھے۔ اور ان کا مقصد تکمیلِ آدمیت تھا۔ یوں کہئے کہ مذہب اور انسانیت مترادف الفاظ ہیں۔

"اسلام آدمیت، انسانیت ہے اور مسلمان آدمی اور انسان۔ اگر لفظ "مسلمان" کا ترجمہ بندۂ خدا بھی کرو۔ پھر بھی میں "بندۂ خدا" "آدمی" اور "انسان" کو مترادف یک دیگر سمجھتا ہوں۔"

(لکچروں کا مجموعہ)
ج۔ دوم

مولانا آزاد اور علامہ مشرقی کے ہاں اسلام بلند اخلاق اور نیک عمل کا نام ہے۔ نیکی کے لئے کئی الفاظ رائج ہیں۔ مثلاً تقوےٰ، اطاعت، انقیاد، تسلیم وغیرہ۔ نذیر احمد اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں:

"ہم مسلمان کہلائے اطاعت و انقیاد سے۔ جب یہ نہیں تو ہم مسلمان کہاں کے"

(لکچروں کا مجموعہ صفحہ ۱۸۹)
ج۔ دوم

دل میں جو بات ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی رنگ میں باہر آ ہی جاتی ہے۔ مولانا کے ایک استاد تھے رام چندر۔ دہلی کالج میں حساب کے پروفیسر تھے اور اپنے فن میں استاد زمانہ شمار ہوتے تھے۔ مولانا کو ان کی ذات سے عشق سا تھا۔ وہ فوت ہوئے تو حمایتِ اسلام لاہور کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

"ہمارے ہی دہلی کالج میں جناب ماسٹر رام چند رصاحب مرحوم دہلی ہی کے رہنے والے کا مشتقہ ریاضی کے پروفیسر تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ماسٹر رام چندر صاحب کو مرحوم اس لئے کہا کہ وہ میرے استاد اور اپنے فن میں فخرِ ہندوستان تھے۔ اور اگرچہ وہ عیسائی ہو گئے تھے اور اس اعتبار سے وہ اہلِ کتاب تھے لیکن اگر وہ ہندو بھی مرے ہوتے تو بھی میں ان کو مرحوم کہتا اور ان کی مغفرت کی دعا مانگتا۔ کیونکہ بہ تعیینِ شخص کسی پر کفر کا اطلاق منع ہے۔"

(لکچروں کا مجموعہ صفحہ ۹)
ج۔ دوم

دیکھا آپ نے کہ ایک غیر مسلم کو مرحوم کہا۔ اس کے لئے دعائے مغفرت مانگی۔ نیز فتوےٰ دیا کہ کسی غیر مسلم کو بھی علی الاطلاق کافر کہنا منع ہے۔ مولانا کی یہی وہ وسعتِ قلب و نگاہ تھی جسے اس وقت کا مُلّا تو برداشت نہ کر سکا لیکن اسی وسعت کی بنا پر مستقبل کا مورخ انہیں "وحدتِ آدم" کے بانیانِ اوّل میں شمار کرے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس "وسعتِ قلب و نظر" کا کوئی جواز قرآن و سنت سے بھی ملتا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ یقیناً ملتا ہے۔ مکمل تفصیل تو میری کتاب "ایک اسلام" میں دیکھئے۔ مجملاً یہ کہ قرآن نے نیک عیسائیوں کو جنت و مغفرت کی بشارات دیں۔ یہاں تک کہ کفارِ مکہ کے نیک اعمال کو بھی مستحقِ اجر ٹھہرایا۔ جب بعض مسلمانانِ مکہ حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے تیار ہوئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اِنّ بہا ملکاً صالحاً لا یظلم الخ (حدیث)

(کہ وہاں ایک صالح بادشاہ موجود ہے جو کسی پر ظلم نہیں کرتا)

حبشہ کے عیسائی بادشاہ نجاشی کو حضورؐ نے صالح قرار دیا اور جب نجاشی کی وفات ہوگئی تو آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے فرمایا:

الصّلوٰۃ علیٰ صالح القوم (بخاری)

(کہ آؤ اور اس نیک انسان پہ نماز جنازہ پڑھیں)

اور آپ نے غائبانہ نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ اسی لاتعصبی اور ہمہ گیر وسعت دل ودماغ کا مظاہرہ جب نذیر احمد نے کیا کہ رام چندر کے لئے دعائے مغفرت مانگی اور ملکہ وکٹوریا کو ملکۂ صالحہ[1] کہا تو مُلّا نے آپ کو کافر و زندیق بنا ڈالا۔

انبیاء اور ان کی تعلیم:- انبیاء کے متعلق عام اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ حضورؐ کے سوا باقی انبیاء چھوٹے چھوٹے انسانی گروہوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ان کی تعلیمات ہنگامی و وقتی تھیں جو قرآن کے آنے سے منسوخ ہوگئیں ہمارے حضورؐ فضیلت کے لحاظ سے خیر الانبیاء تھے اور باقی انبیاء ان سے کمتر درجے کے تھے اور قیامت میں شفاعت کی اجازت صرف ہمارے حضورؐ کو ملے گی۔

یہ عقائد کئی طرح سے محلِ نظر ہیں۔

اوّل اس لئے کہ قرآن نے جہاں ہمیں تمام انبیاء پہ ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔ وہاں یہ تعلیم بھی دی ہے کہ لا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِنْھُم —— (کہ ہم ان میں فرقِ مراتب نہیں کرتے) تفریق کے مفہوم دو ہیں۔ اول فرقِ مراتب، دوم کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا۔ اللہ نے ان دونوں قسم کی تفاریق سے روک دیا ہے۔ وجہ یہ کہ اسلام کا مقصد دنیا میں قیامِ امن تھا اور یہ امن قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ہم بعض انبیاء کو بعض دیگر سے کمتر درجے کا کہیں۔ یا ان کی تعلیمات سے انکار کریں۔ اگر ہم حضرت عیسےؑ کو چھوٹا کہیں گے تو ستر کروڑ عیسائی حضور علیہ السلام کو چھوٹا سمجھیں گے۔ اگر ہم انجیل کو محرّف، منسوخ یا غلط قرار دیں گے تو یہی سلوک یہ لوگ ہمارے قرآن سے کریں گے اگر دل آزاری کا یہ سلسلہ جاری رہے تو امنِ عالم اور وحدتِ آدم کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس میں کلام نہیں کہ اللہ کے ہاں انبیاء کے مراتب چھوٹے بڑے ہوں گے لیکن ہمیں جو حکم ملا ہے۔ وہ اتنا ہی ہے کہ سب پر بلا تفریق ایمان لاؤ۔

دوم۔ قرآن نے تورات و انجیل کو منسوخ نہیں کیا۔ بلکہ ان کی تصدیق و تائید کی ہے[2]۔

سوم۔ جب قرآن نے اس تورات و انجیل کی تصدیق کی ہے جو[3] نزولِ قرآن کے وقت یہود و نصاریٰ کے پاس موجود تھی تو ان کی تحریف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا نذیر احمد کے عقائد انبیاء کے متعلق بالکل وہی تھے جو اس وقت رائج تھے۔ وہ صحائفِ سابقہ کو منسوخ و منحرف سمجھتے تھے۔ البتہ انبیاء میں فرقِ مراتب کے قائل نہیں تھے۔

> "بہرکیف پیغمبروں کے ساتھ ایمان لانے کی یہ شکل ہے کہ جو معلوم ہیں اور جو نہیں معلوم۔ وہ سب خدا کے بھیجے ہوئے اور روادار رسالت میں سچے ہیں۔ ان کے مدارج خدا ہی کو معلوم ہیں۔ ہم اپنی طرف سے کسی کو فاضل یا مفضول نہیں کہہ سکتے۔" (الحقوق و الفرائض ج۔۱ صلا۔۱۲)

---

[1] لکچروں کا مجموعہ ص۲۰ ج۔ دوم

[2] تفصیل کے لئے "ایک اسلام" دیکھیے۔

[3] مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (قرآن)

(قرآن اس تورات و انجیل کی تصدیق کر رہا ہے جو اس وقت تمہارے پاس ہیں)

حدیث :- حدیث کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے :

۱- کہ حدیث وحیِ خفی ہے۔

۲- کہ صحاح ستہ کی تمام احادیث صحیح اور قابلِ اعتماد ہیں۔

۳- کہ احادیث میں روایت باللفظ ہے۔

لیکن دنیائے اسلام کے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ احادیث حضور علیہ السلام کے بشری اقوال ہیں۔ ان کا وحی سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ کی تمام وحی قرآن میں محفوظ ہے۔ اگر حدیث بھی وحی ہوتی تو قرآن میں شامل ہوتی۔ کہ صحاحِ ستہ کی تمام احادیث صحیح نہیں اور حدیث کی حیثیت محض تاریخ کی ہے۔

مولانا نذیر احمد کا عقیدہ بھی وہی تھا جو عام علما کا تھا۔ آپ صحاح کی تمام احادیث کو صحیح سمجھتے تھے۔ آیا وہ حدیث کو وحیِ خفی سمجھتے تھے یا نہیں، اس کے متعلق ان کا کوئی واضح قول نہیں مل سکا۔ البتہ آپ روایت بالمعنیٰ کے قائل تھے۔ (لکچروں کا مجموعہ ج-۲ ص۳۴۲) اور ایک مقام پر سرسید کی تقلید میں حدیث کو تاریخ کہا اور ساتھ ہی تدوینِ حدیث میں جن دقتوں کا سامنا تھا انہیں گنا۔ لیکن یہ کہنے کی ہمت نہ کرسکے کہ احادیث کا ذخیرہ بڑی حد تک ظنی ہے۔

"حدیث بھی اگر سچ پوچھو تو تاریخ ہے۔ ...... لیکن اس کے جمع کرنے میں ایک بڑی مشکل یہ ہے
کہ زبانی باتوں کو ان کی حد تک پہنچانا پڑتا ہے ..... پھر سب سے بڑی مشکل جو تدوینِ حدیث
میں پیش آئی یہ تھی کہ اس کے جمع کرنے کا سب سے پہلا خیال پیغمبر صاحب کی وفات کے ڈیڑھ سو
برس بعد پیدا ہوا۔ یعنی ڈیڑھ سو برس بعد سے اس کی تحقیقات شروع ہوئی کہ پیغمبر صاحب نے
یہ فرمایا، یہ کیا تھا۔ پھر مشکل اندر مشکل است و مشکل اندر مشکل است ......"

ان مشکلات کو شمار کرنے کے بعد ائمۂ حدیث کی تگ و دو اور تلاش و جستجو کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ڈیڑھ سو برس بعد لاکھوں راویوں کے مکمل مستند اور صحیح حالات تذکرہ نگاروں کو کیسے اور کہاں سے مل گئے تھے۔ خصوصاً جبکہ ان راویوں کے متعلق ایک لفظ تک کہیں لکھا ہوا موجود نہیں تھا اور کئی لاکھ راویوں کو فوت ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں۔ اس دوران میں بڑے بڑے سیاسی حادثے بھی ہو چکے تھے مثلاً حضرت عثمانؓ کی شہادت مسلمانوں کے ہاتھوں۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کی جنگ جس میں پچاس ہزار صحابہؓ شہید ہوئے تھے۔ پھر امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کا ٹکراؤ۔ اس کے بعد واقعۂ کربلا۔ پھر دورِ امیہ میں منبر سے حضرت علیؓ کی شان میں گستاخی اور وضع احادیث کی وبائے عام۔ جو احادیث کہ کروڑوں زبانوں، ان پُرفتن زمانوں اور ہنگاموں سے ہو کر گزری تھیں۔ انہیں یقینی اور قطعی سمجھنے کے لئے قطعی دلائل اور یقین انگیز شہادتوں کی ضرورت ہے جو مولانا نے پیش نہیں کیں اور پیش کرتے بھی کہاں سے۔ کہ ایسی قطعی اور یقینی شہادت موجود ہی نہیں۔

زُہد :- زہد کا عام مفہوم نفس کشی، ریاضت اور دنیا کی تمام لذائذ و نعم سے کنارہ کشی بن چکا تھا۔ اس موضوع پر مولانا کی تصریحات بہت بصیرت افروز ہیں۔ فرماتے ہیں :

"ہمارے مذہبی پیشواؤں میں سے بھی ایک بڑا گروہ زُہد کی تعلیم فرماتا ہے۔ ایک طرف یہ لوگ ہیں جو
دنیا سے نفرت کرنا سکھاتے ہیں اور دوسری طرف خدا ہے جس نے آدمی کے لئے دنیا میں عیش و عشرت
کے سامان مہیا کئے ...... اور حکم دیا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (کھاؤ پیو لیکن حد سے آگے
مت بڑھو) قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ [illegible]

(کہو کہ اللہ نے جو زینت کی اشیاء اور رزق کی پاکیزہ چیزیں بندوں کے لئے پیدا کی ہیں انہیں کس نے حرام کیا) ..... غرض ہر طرح کے ساز و سامان کی اور منافع زندگی کی منت رکھی جاتی ہے (یعنی انسان پر اللہ اپنے احسان جتلاتا ہے، نعمت کی) اور نعمت تبھی نعمت ہو سکتی ہے کہ ہم اس سے متمتع ہوں۔ اور زہد ہوا تو کیسا تمتع اور کیسی نعمت۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۴۴-۴۵)

ان تصریحات کا جو آگے بھی چلتی ہیں ملخص یہ ہے کہ اللہ نے بار بار انسان پر یہ احسان جتلایا ہے کہ میں نے تمہارے لئے باغات جنات اور اسباب زینت و آرائش پیدا کئے ہیں۔ نیز حکم دیا ہے کہ ان سے فائدہ اٹھاؤ لیکن اسراف سے بچو۔ مولانا اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ طیبات ارضی سے فائدہ اٹھانا زہد میں داخل ہے اور جو چیز زہد سے خارج ہے وہ صرف اسراف ہے۔

نسوانی پردہ:۔ پردے کی حد کیا ہے؟ اس کے متعلق علماء کی آراء میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ پردے سے مراد سنگار اور زیب و زینت کو چھپانا، نیز مرد سامنے آجائے تو آنکھیں جھکا لینا ہے۔ ایک عورت منہ اور دست و پا کو بے حجاب رکھ سکتی ہے لیکن اکثریت دست و رُو کو بھی چھپانا ضروری سمجھتی ہے۔ پہلا گروہ اس آیت سے استدلال کرتا ہے:

"اے رسول مومنین اور مومنات سے کہو کہ وہ آنکھیں نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔"

(قرآن)

اور کہتا ہے کہ اگر عورت کا منہ ڈھکا ہوا ہو تو آنکھیں نیچی رکھنے کی ہدایت مہمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہدایت مطلب خیز تبھی بنتی ہے کہ عورت کا منہ پردے سے باہر ہو۔ چونکہ مولانا نذیر احمد پر رائے عامہ یا مُلا کا خوف بھوت کی طرح سوار تھا۔ اس لئے وہ اس موضوع پر کوئی واضح بات نہ کہہ سکے اور اتنا ہی کہہ کر رہ گئے:

"عورت جم کر گھر میں بیٹھی رہی۔ خانہ نشینی نے پردے کی صورت اختیار کر لی۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۱۱)

کیا گول مول رائے ہے کہ خانہ نشینی نے پردے کی صورت اختیار کر لی اور اس مسئلے کی شرعی صورت کیا ہے؟ ازواج مطہرات اور صحابیات مردوں کے ساتھ مل کر جہاد میں کیسے جاتی تھیں اور مسجد نبوی میں خواتین بے پردہ آتی تھیں یا با پردہ؟ ان مسائل پر کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ ذرا آگے چل کر صحیح بات کہنے کی کوشش تو کی۔ لیکن اتنا ہی کہہ کر رہ گئے:

"میں نے تو پردے کی آیتوں سے جو قرآن میں ہیں۔ یہ سمجھا ہے کہ پردے کا مقصود اصلی عفت کی حفاظت ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی فواحش کی گندگی سے پاک صاف رہے۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۱۱)

اور پردے کی حدود کو پھر بلا تعیین چھوڑ گئے۔ ممکن ہے کسی اور تحریر میں ان کی واضح رائے اس مسئلہ پر درج ہو لیکن میری نگاہ سے ایسی فیصلہ کن تحریر نہیں گذری۔

نیم مُلا۔ نیم حکیم:۔ مولانا آدھے مُلا تھے اور آدھے فلسفی۔ ان معنوں میں کہ وہ نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر جا بجا پھبتیاں بھی کستے ہیں اور ساتھ ہی نئے علوم و فنون کی افادیت کے بھی قائل ہیں۔ یہاں تک اقبال کی طرح ؎

نائب حق در جہاں بودن خوش است ——— بر عناصر حکمراں بودن خوش است

آپ بھی نیابتِ الٰہی کے لئے تسخیرِ کائنات اور تصرّف فی الآفاق کو ضروری قرار دیتے ہیں:

"انسان کے تصرّفات محدود ہیں۔ وہ ایک ذرّے کے پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ ہاں ایک حد تک مخلوقات میں تصرّف کرتا یا تصرّف نہیں کرتا تو ان سے اپنا کام نکالتا ہے اور اسی سے وہ خلیفۃ اللہ کہلاتا ہے۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۳۳)

انگریزوں کی ترقی پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اچھا میں ان کی ترقی کا اصلی گُر بتاؤں۔ سائنس۔ سائنس کہو، فلسفہ کہو، علم کہو، ایک ہی بات ہے ..... مگر بس کہ ہم علم سمجھتے ہیں وہ علم نہیں ...... ہمارے ہاں تو علم لفاظی اور خیالی مفروضات کا نام تھا۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۱۶)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"انسان کو خلیفۃ اللہ کہا جاتا ہے۔ اس خلافت کے یہی معنی ہیں کہ خدا نے انسان کو عقل دی ہے جس کی مدد سے وہ مخلوقات کے خواص، ان کی تاثیرات اور علت و معلول کے تعلقات کو دریافت کرے۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۱۲۳)

قرآن نے مطالعۂ کائنات کی طرف ۷۵۶ مرتبہ دعوت دی ہے۔ ہندوستان میں مطالعۂ کائنات کی اہمیت کو سب سے پہلے سرسیّد نے محسوس کیا اور یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی پڑھنا کفر تھا اور سائنس پڑھنا کفرِ عظیم۔ اس ماحول میں مولانا نذیر احمد کا سائنس کے حق میں صدا بلند کرنا تکفیر و تفسیق کے طوفانوں کو دعوت دینا تھا لیکن مولانا نرے مولانا ہی نہ تھے ان کی نظر بعض حقائق پر بھی تھی جنہیں وہ نہایت محتاط انداز میں بعض اوقات بیان کر دیا کرتے تھے۔ آپ کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی نئی بات کہتے تھے تو معذرتوں کا انبار لگا دیتے تھے کہ کہیں ملائے عام مشتعل نہ ہو جائے۔ رائے عامہ سے یہ خوف عموماً مُلّا کو ہوا کرتا ہے اور حقائق پر نظر فلسفی کی ہوتی ہے اس لئے آپ نیم مُلّا و نیم فلسفی (حکیم) کا ایک دلچسپ امتزاج تھے۔

تقدیر:- تقدیر کا عام تخیل احادیث سے ماخوذ ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ انسان ماں کے پیٹ ہی سے شقی یا سعید پیدا ہوتا ہے اور اسے علم، تربیت اور تبلیغ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس تخیل پر دو بڑے بڑے اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جب اللہ ماں کے پیٹ میں ایک شخص کو شقی بنا دیتا ہے تو پھر اسے عذاب کیوں دیتا ہے۔ کیا یہ صریحاً ظلم نہیں کہ اللہ بلاوجہ ایک شخص کو پہلے شقی بنائے اور بعد ازاں اسے نارِ جہنّم میں پھینک دے۔

دوم۔ جب ہر انسان کی سعادت و شقاوت کا فیصلہ بطن الاُمّ ہی میں ہو جاتا ہے تو پھر انبیاء بھیجنے اور صحائف نازل کرنے کا مطلب؟

چونکہ ہمارے عام علماء حدیث پر بھی ایمان رکھتے تھے اور تقدیر کے اس تخیل کو بھی نامعقول سمجھتے تھے اس لئے مختلف حضرات نے مختلف تاویلات کیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ تقدیر سے مراد علمِ الٰہی ہے۔ چونکہ ہر شخص کی ساری زندگی اللہ کے سامنے ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ اپنے علم کی بنا پر ایک آدمی کو پہلے ہی سعید و شقی لکھ دیتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی منجم دس دن پہلے خسوف یا کسوف کی پیشگوئی کر دے اور وہ صحیح نکلے۔ جس طرح یہ منجم کسوف یا خسوف کا ذمہ دار نہیں۔ اسی طرح اللہ کسی کی شقاوت و سعادت کا ذمہ دار نہیں۔ انسان فاعل مختار ہے۔

اور سعادت وشقاوت اس کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ دوسرے گروہ نے جن میں مولانا رومی اور اقبالؒ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں کہا کہ تقدیر کے لفظی معنی ہیں ماپنا، تولنا اور معین کرنا یعنی اللہ نے ہر عمل کو ماپ تول کر ایک نتیجہ اس کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ انسان انتخابِ افعال میں آزاد ہے۔ لیکن ان کے نتائج بھگتنے پر مجبور ہے۔ اعمال کو ان کے صلوں سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً محنت کا نتیجہ کامیابی اور کاہلی کا ناکامی ہوا کرتا ہے۔ یہ محال ہے کہ کوئی کاہل طالب علم امتحان میں کامیاب ہو جائے اور ایک محنتی ناکام رہے۔ اقبالؒ و رومی کی یہ تشریح عقل اور قرآن کے عین مطابق ہے اور حدیث والے مفہوم کے بالکل اُلٹ۔ اس مسئلہ پر مولانا نذیر احمد نے بھی بہت کچھ کہا اور لکھا ہے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"ہم بھی تقدیر کو مانتے ہیں۔ مگر پہلے تدبیر بعد تقدیر۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صـ۱۲۹)

"معمار تعمیر سے پہلے مکان کا نقشہ بناتا ہے۔ بڑھئی چوکی کے لئے لکڑی کی تراش کا اندازہ کرتا ہے۔ یہ سب تقدیر ہے۔ اسی طرح خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی۔ یہی اس چیز کی تقدیر ہوئی۔ ۔ ۔ (مشہور عقیدہ یہ ہے) کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی عقیدے نے مسلمانوں کی دنیا کو تباہ اور برباد کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب اس لئے کہ مسلمان تقدیر پر بھروسہ کر کے حسبِ اقتضائے وقت اپنے تئیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ عقیدۂ تقدیر نے ان کو مایوس، اپاہج اور از کار رفتہ کر دیا ہے۔"

(الحقوق ج۔۱ صـ۲۲-۲۳)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ مولانا حدیث والی تقدیر کے قائل نہیں تھے۔ لیکن رائے عامہ کو بھی ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے کچھ ایسی باتیں بھی کہہ گئے جو کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں:

"اگلے مسلمان جو معراج الکمال ترقی پر پہنچ گئے تھے وہ بھی تقدیر کے قائل تھے۔ مگر کوشش کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کامیابی ان کی تقدیر میں ہے اور تقدیر ہی ان سے کوشش کرا رہی ہے۔"

(الحقوق ج۔۱ صـ۲۳)

کیا سمجھے؟ اور ملاحظہ فرمائیے:

"آدمی ارادے کا اختیار رکھتا ہے۔ ارادے کا نافذ کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ نتیجہ جو وہ چاہتا ہے۔ ہو بھی اور نہ بھی ہو۔ مثلاً آدمی نے چوری کی نیت سے ایک گھر کو تاکا۔ آلاتِ سرقہ لے کر چلا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ لوگ جاگ رہے ہیں۔ ناکام واپس آیا۔ حاکم ظاہر اس کو سزا نہیں دے سکتا کیونکہ چوری نہیں ہوئی۔ مگر وہ چوری کا ارادہ کرنے سے عنداللہ چور ٹھہرا۔"

(الحقوق ج۔۱ صـ۲۳-۲۴)

اس تحریر سے مولانا کا مقصد تقدیر کی تشریح نہیں بلکہ حدیث والے تخیل اور اپنے تخیل میں تطبیق کی کوشش فرما رہے ہیں۔ چونکہ کوئی کوشش کامیاب ہو ہی نہیں سکتی اس لئے آپ دور از کار تاویلات میں پڑ کر مطلب سے دور جا پڑے ہیں۔ چند صفحات بعد اپنے موقف کی طرف پھر واپس آتے ہیں اور نہایت واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

"ہم تقدیر کو جس کے معنی جبر کے ہیں۔ آدمی کے ان افعال میں تسلیم کرتے ہیں جو اس کے اختیار سے خارج ہیں۔ مثلاً ایک شخص ایک وقتِ خاص میں اور ایک خاص ملک میں ایک خاص خاندان میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے اختیار سے خارج ہے اور اسی کو ہم تقدیر سمجھتے ہیں اور جو امور آدمی کے اختیار میں ہیں ان کو تقدیر الٰہی سے کچھ تعلق نہیں۔"

(الحقوق ج۔ ۱ ص۸۶)

ایک مقام پر تقدیر کا وہ مفہوم بھی لیا ہے جو ہم کسوف و خسوف والی مثال سے واضح کر چکے ہیں۔

دُعا:- بعض مسائل پر مولانا کی تصریحات بڑی دلکش اور بصیرت افروز ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ دعا ہے اور دوسرا عقیدۂ توکل۔ دُعا کے متعلق لکھتے ہیں:

"اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوئی سا کام بھی ہو۔ چھوٹا یا بڑا اور اس کے سرانجام پانے کے کچھ بھی اسباب ہوں۔ اس کے حصول کا پہلا سبب ہے آدمی کا ارادہ۔ مثلاً ایک مکان بنانا ہے۔ بے شک اس کی تعمیر کے اسباب میں سے معمار ہے، بڑھئی ہے، مصالحہ ہے ..... مگر کسی کا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ سببِ اوّل مالکِ مکان کا ارادہ ہے۔"

(الحقوق ج۔ ۱ ص۸۳)

مولانا کا مطلب یہ ہے کہ امورِ انسانی میں چند ظاہری اسباب کے علاوہ ایک مخفی سبب بھی موجود ہے اور وہ ہے اللہ کا ارادہ یا مرضی جب تک خدا ایک چیز کو پسند نہ کرے تمام اسبابِ تکمیل ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لئے کسی کام کو شروع کرتے وقت اللہ سے یہ التماس ضروری ہے کہ اے اللہ ہمارے اس کام کو تکمیل تک پہنچا۔ کوئی نادیدہ رکاوٹ نہ آ جائے۔ بڑھئی بیمار نہ ہو جائے یا بارش ڈھانچے کو بہا نہ لیجائے اور اسی التماس کا دوسرا نام دُعا ہے۔

توکّل:- توکل کا عام تخیل یہ ہے کہ کام کوئی نہ کرو۔ اپاہج بن کر بیٹھ جاؤ اور امید یہ رکھو کہ اللہ تعالےٰ (ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر) سب کچھ بھیج دے گا۔

"لوگوں نے اس کو کاہلی کا ایک حیلہ بنا رکھا ہے۔ انہوں نے توکل کے یہ معنی سمجھے ہیں کہ دست و پا شکستہ ہو کر خود کچھ کام نہ کریں۔ ..... دینی پیشواؤں میں ... بہت سے مدعیٔ توکل ہوتے ہیں اور انہوں نے عوام کالانعام کو بڑے مغالطہ میں ڈال رکھا ہے اور قومی دولت کو ان کی وجہ سے بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔"

(الحقوق ج۔ ۱ ص۶۱-۶۲)

مولانا توکل کا نہایت عمدہ مفہوم پیش فرماتے ہیں اور غالباً اسلام کی طویل تاریخ میں یہ انوکھی تشریح صرف آپ ہی کو سوجھی ہے جس کا خلاصہ ... کہ جب ہم کوئی کام کرنے لگتے ہیں تو اسباب کا کچھ سلسلہ ہم فراہم کرتے ہیں اور کچھ خدا۔ مثلاً کاشتکاری کو لیجئے۔ اس کے لئے ہل، ... ل، پانی، زمین، ہوا، روشنی درکار ہے۔ ہل ہم بناتے ہیں اور وہ بھی اللہ کی پیدا کردہ لکڑی سے، اور باقی سب کچھ خدا کا ہوتا ہے۔ بیل ... کے، بادل اس کے، زمین اس کی، سورج اس کا، غلہ اس کا، ہوائیں اس کی، فضائیں اس کی، ہم صرف اتنا کرتے ہیں کہ خدا کا غلہ ... ہم سے نکال کر خدا کی زمین میں اس اعتماد پہ ڈال دیتے ہیں کہ خدا بارش برسائے گا، فصل اُگے گی اور وہ فصل کو طوفانوں، بجلیوں،

ادنوں اور ضرر رساں حشرات وطیور سے بچائے گا۔ اسی اعتماد کا نام توکل ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے حصے کا کام پہلے کریں اور خدا پر توکل بعد میں کریں۔

"اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ دنیا میں خدا اور آدمی دونوں مل جل کر کام کر رہے ہیں ...... توکل کے معنی ہیں بھروسا کرنا ...... ہم ایک کام کرنا چاہتے ہیں، خدا کا ہاتھ اس میں ضرور ہوگا ..... اگر ہم خدا پر بھروسا کریں کہ وہ اپنے کرنے کا کام کرے۔ تو وہ کرتا ہے اور ضرور کرتا ہے ..... ایسا بھروسا بجا اور روا بھی بھروسا ہے ..... خدا پر اس قسم کا بھروسا آدمی کا فعلِ اضطراری ہے کہ چار و ناچار کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے کہ سب کام خدا کے اختیار اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ آدمی کی محدود قدرت برائے نام ہے۔ یہ ہے توکل کی اصل حقیقت ...... مگر لوگوں نے توکل کے معنی غلط سمجھ رکھے ہیں۔ ان کے ہاں توکل کے یہ معنی ہیں کہ آدمی اپنے کرنے کا کام بھی نہ کرے اور چاہے کہ بے بوئے، بے جوتے، بے پیسے پکائے بے ہاتھ ہلائے بے منہ چلائے خدا اس کا پیٹ بھر دیا کرے۔"

(الحقوق والفرائض ج۔۳ ص۸)

انگریز اور مولانا:۔ اسے ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی کا ردِ عمل کہئے یا مصلحتِ وقت کا تقاضا کہ انیسویں صدی میں جو رہبر بھی ہندوستان میں اٹھا۔ اس نے اطاعتِ فرنگ کو مذہبی فرض بنا دیا اور جہاد کے خلاف پوری قوت سے آواز بلند کی۔ علما کی ایک کافی تعداد انگریز کو "اولوالامر" سمجھتی اور اس کی اطاعت کو مذہبی فرض قرار دیتی تھی۔ اس معاملے میں مولانا نذیر احمد بھی کسی سے کم نہ تھے اور کم کیسے ہوتے کہ حکومت نے پرائمری سکول کنجاہ ضلع گجرات (پنجاب) کی مدرسی سے اٹھا کر پہلے ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنایا، پھر تحصیلداری عطا کی، پھر ڈپٹی کلکٹری کے منصب پر فائز کیا اور بالآخر آپ کی خدمات ریاست حیدر آباد دکن کے حوالے کر دیں۔ جہاں آپ ڈپٹی کمشنر ہو گئے۔ تنخواہ دو سو سے آٹھ سو ہو گئی اور ریٹائر ہوتے وقت آپ کی تنخواہ سترہ سو روپے ماہوار تھی۔

مولویوں میں یہ کمزوری عموماً پائی جاتی ہے کہ ایک مرغا کھلا کر یا دو چار روپے کا نذرانہ گذار کر جس قسم کا فتویٰ چاہو لے لو۔ بھلے دینی کتب خانے میں چودہ لاکھ رنگ برنگی احادیث۔ فقہ کے دفاتر اور ائمہ و مجتہدین کے لاتعداد اقوال موجود ہیں جن سے ہر قسم کا فتویٰ نکالا جا سکتا ہے اور اگر نہ بھی نکلے پھر بھی تاویل کا میدان اتنا وسیع ہے کہ جس آیت کو چاہو کھینچ تان کر اپنے ڈھب کی بات نکال لو۔

مولانا نذیر احمد نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے اطاعتِ فرنگ کو کچھ ایسے ہی دلائل کی بنا پر مذہبی فرض بنا دیا تھا۔

"لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں اطاعتِ نصاریٰ کا کوئی حکم ہی نہیں۔ حالانکہ یہ خیال محض غلط ہے۔ اطاعتِ نصاریٰ کے لئے استدلال کرنا چاہئے ..... اوفوا بالعقود ..... (عہدوں کو پورا کرو۔ قرآن) سے ..... اپنے پرائے سب سمجھ لیں کہ حکامِ وقت کی اطاعت مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے اور اس بارے میں بہت سی نصوص نازل ہیں۔ ہم اس اطاعت کو مبنی کرتے ہیں صرف اس بات پر کہ ہم مسلمانوں میں اور نصاریٰ حکامِ وقت میں امن کا عہد ہے۔ یعنی جب انگریزوں نے یہ ملک لیا۔ خواہ دھوکا دے کر لیا۔ خوشامد سے لیا۔ رشوت

دے کر لیا ...... بزورِ شمشیر لیا۔ غرض لیا اور ہم نے گو زبان سے نہ کہا اور کوئی دستاویز لکھ کر نہ بھی دی۔ تاہم ان کے ملک میں ان کی رعایا بن کر رہنا قبول کیا تو یہ شرعاً عہد ہو گیا، اور ایفائے عہد کے بارے میں جیسی کچھ تاکید قرآن میں ہے سب کو معلوم ہے۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۲۱۶)

دیکھا آپ نے کہ مولانا نے اطاعتِ فرنگ کو مذہبی فرض بنانے کے لئے کیا کیا جتن کئے۔ انگریزوں نے اس ملک کو حاصل کرنے کے لئے کتنے تخت اُلٹے، کتنی لوٹ مار اور خوں ریزی کی۔ کن کن ذلیل اور پست ریشہ دوانیوں سے کام لیا۔ ان تمام امور کو تو مولانا نے رکھ دیا ایک طرف اور استدلال کی بنیاد اس مفروضے پر ڈال دی کہ "ہم نے ان کے ملک میں رعایا بن کر رہنا قبول کر لیا تھا۔" یعنی آپ ہندوستان کو ان نصاریٰ کا ملک سمجھتے تھے اور مسلمانوں کی بے بسی کو "شرعی عہد" اور "قبولیت" قرار دیتے تھے۔ اگر مولانا زوالِ بغداد کے وقت موجود ہوتے تو ہلاکو خان کی اطاعت کو بھی بالکل اسی استدلال سے "مذہبی فرض" بنا دیتے۔

قرآن میں بے شک اولی الامر کی اطاعت کا حکم موجود ہے۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ:

یاایُّھا الّذینَ آمنُوا اَطِیعُوا اللہ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ وَ اُولِی الاَمرِ مِنکُم (قرآن)

(اے ایمان والو! خدا اور رسول کی اطاعت کرو۔ نیز اس امیر (اولی الامر) کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہو)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نصاریٰ مسلمانوں میں سے تھے۔ اگر نہیں تو پھر ان کی اطاعت مذہبی فرض کیسے بن گئی؟ ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اور تیسری بات یہ ہے کہ ان کی حکومت حکومتِ صالحہ ہے۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۲۲۲)

شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا انگریز موجود ہو جو شراب نہ پیتا ہو اور سؤر نہ کھاتا ہو۔ چلیئے ان باتوں کو چھوڑیئے اور صرف یہ دیکھئے کہ کیا انگریز نے مسلمانوں سے کبھی بھی انصاف کیا؟ کیا آبادی کے مطابق انہیں حکومت میں کبھی بھی حصہ دیا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ صرف چند برس کے عرصے میں انگریز نے مسلمانوں سے جاگیریں، زمینیں اور دیگر وسائلِ رزق چھین کر انہیں بھکاری بنا دیا تھا۔ ان کے شہزادوں کو محلوں سے اٹھا کر گلیوں میں پھینک دیا تھا۔ تمام دفاتر اور عدالتیں مسلمانوں سے خالی ہو گئی تھیں۔ ہندوستان کے پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن انگریز نے ڈیڑھ سو برس کے دورِ حکومت میں ایک دن کے لئے بھی مسلمانوں کو کسی صوبے میں ایک نشست کی اکثریت بھی حاصل نہ کرنے دی۔ ہماری زبانوں کو مٹایا۔ ہمارے علوم و فنون کو موت کی نیند سلا دیا اور سب سے بڑا ستم یہ کیا کہ یہاں سے جاتے وقت ہمارا کشمیر بھی نہرو کے حوالے کر گئے اور تقسیمِ ہند کے وقت جو کچھ مشرقی پنجاب، دہلی اور یوپی میں ہوا اس سے سارا جہان آگاہ ہے۔ کیا ایسے لوگوں کی حکومت، حکومتِ صالحہ ہو سکتی ہے؟

لیکن مولانا نذیر احمد کا فتوےٰ یہی ہے کہ:

"انگریزوں کی اطاعت اور خیر خواہی ہمارا فرضِ مذہبی ہے۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج۔۲ صفحہ ۲۲۴)

اس فقرے کے علاوہ آپ نے ایک پیشگوئی بھی کی تھی۔ انہی کے الفاظ میں سنئے،

"ہندوستان کے حق میں یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے اور یہ اس کے لئے فالِ نیک بھی ہے کہ
ہندوستان ہمیشہ کے لئے فادیرز کا محکوم رہے گا اور وہ فاریرز..... انشاء اللہ ہمارے
شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم، ان کے بیٹے، پوتے، پڑ دتے ہوں گے۔"

(لکچروں کا مجموعہ ج ۲ ص ۴۲۱)

اگر یہ پیشگوئی ایڈورڈ ہفتم کے صرف پوتوں پر پہنچ کر ختم ہوگئی ہے اور پڑپوتوں کی نوبت نہیں آئی تو حیرت کا کوئی مقام نہیں۔ اس لئے کہ نذیر احمد تو صرف مولانا تھے۔ اس وقت کے "پیغمبروں" کی پیشگوئیاں بھی اتنی ہی "صحیح" نکلا کرتی تھیں۔

مولانا نذیر احمد کی کتاب "الحقوق والفرائض" بڑی مفید اور اہم کتاب ہے۔ اس میں آپ نے قرآن و حدیث کے تمام احکام کو مختلف عنوانات (مثلاً صدق، عفو، حلم، تواضع، مساوات، دعا، صلوٰۃ، حج، توکل وغیرہ وغیرہ) کے نیچے درج کر کے اس مضمون کی چند آیات و احادیث بھی وہاں نقل کر دی ہیں۔ لیکن جہاد کے متعلق کوئی باب نہیں باندھا۔ اس کی وجہ خود مولانا سے سنئے:

"جس طرح احکامِ زکوٰۃ مفلس سے، جو مالکِ نصاب نہ ہو اور احکامِ حج نامستطیع سے متعلق نہیں۔ اسی طرح احکامِ جہاد مسلمانانِ ہند سے متعلق نہیں۔ اس لئے کہ جہاد نام ہے مذہبی لڑائی کا اور مذہبی لڑائی نام ہے اس کا کہ دوسرے مذہب والے ہم کو ترکِ اسلام پر مجبور کریں۔ سو اس قسم کی مجبوری تو مسلمانانِ ہند کو انگریزی عملداری میں نہ پیش آئی نہ پیش آئے گی ...... بہرکیف احکامِ جہاد مسلمانانِ ہند سے متعلق نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم "حقوق و فرائض" کو جمع کرنے بیٹھے تو جہاد کا باب تک قائم نہ کیا۔ (اور خطرہ ملاحظہ ہو۔ برق) کہ کہیں عوام کالانعام کے لئے "سرو دبستاں یاد دہانیدن" نہ ہو جائے۔"

(الحقوق والفرائض ج ۳ ص ۱۵)

مطلب یہ کہ کہیں اس کتاب میں "عوام کالانعام" بابِ جہاد پڑھ کر مولانا کے آقاؤں اور محسنوں پر حملہ ہی نہ کر دیں۔

ان سطور میں مولانا نے اسلامی جہاد کی نوعیت اور مقاصد سے جس لاعلمی کا اظہار کیا ہے وہ از حد افسوسناک ہے۔ اگر اسلامی جہاد "ترکِ اسلام پر مجبور کرنے" کے وقت ہی ہو سکتا ہے تو بتائیے کہ حضور علیہ السلام نے عسّان کے خلاف افواج کیوں بھیجی تھیں؟ صدیق و فاروق رضی اللہ عنہم نے قیصر و کسریٰ پر کیوں حملہ کیا تھا؟ کیا کسریٰ یا قیصر نے مسلمانانِ مدینہ کو ترکِ اسلام پر مجبور کیا تھا؟ اسلامی تلوار ہمیشہ دو ہی موقعوں پر بے نیام ہوتی رہی۔ اوّل، مدافعت۔ دوم، مظلوموں کی حمایت۔

بدر و اُحد اور حنین و خندق کی جنگیں دفاعی تھیں اور شام و ایران کے حملے مظلوموں کی مدد کے لئے تھے۔ اس لئے کہ وہاں عیّاش، شکم پرست، مستبد، خائن اور ظالم فرمانرواؤں کی حکومت تھی جو رعایا کو لوٹ کر عیش کر رہے تھے اور پامال و مقہور خدائی کے خدا بنے بیٹھے تھے۔ خلقِ خدا کو ان عیّاش حکمرانوں کے پنجے سے چھڑانا نوعِ انسانی کی بہت بڑی خدمت تھی جسے اسلامی تلوار نے سرانجام دیا۔

انگریز نے ڈیڑھ سو سالہ عہدِ حکومت میں مسلمانوں سے کیا سلوک کیا، یہ ایک طویل اور دردناک کہانی ہے۔ شاید ہی کوئی ستم ایسا ہو جو انگریز نے مسلمانوں پر نہ توڑا ہو۔[۱]

---

[۱] ان مظالم کی جزوی تفصیل میری کتاب "حرفِ محرمانہ" میں "مسیح اور قتلِ دجال" کے تحت دیکھئے۔

حیرت ہے کہ مولانا کو یہ مظالم کیوں نظر نہ آئے۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء کا معرکہ بھی ان کے سامنے ہوا تھا۔ اگر ان واقعات میں سے دس فی صد بھی صحیح ہیں جن سے اوراقِ تاریخ لبریز ہیں تو پھر مولانا کے فتوئے "امتناعِ جہاد" کی کوئی اور تاویل بغیر اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ مولانا کا اسلام بھی انگریز کے ہاں گرو ہو چکا تھا۔

خود مولانا:- مضمون کو ختم کرنے سے پہلے نامناسب نہ ہوگا اگر مولانا کا تعارف بھی کرا دیا جائے۔ آپ بجنور کی ایک بستی میں ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کی ایک مسجد میں حاصل کی۔ بعد ازاں اتفاقاً انہیں دہلی کالج میں داخلہ مل گیا اور وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ ان دنوں کالجوں کا نصاب بالکل مختلف تھا۔ انگریزی لازمی مضمون نہیں تھا اور عربی و فارسی کا نصاب بھی کافی وزنی تھا چنانچہ مولانا نے صرف عربی علوم و فنون تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا اور انگریزی بہت بعد نوکری کے زمانے میں سیکھی۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ آپ سب سے پہلے کنجاہ ضلع گجرات کے پرائمری سکول میں بیس روپے کے مدرس مقرر ہوئے۔ دو برس بعد کان پور میں اسی روپے کے ڈپٹی انسپکٹر ہو کر چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہیں تحصیلداری مل گئی۔ پھر ڈپٹی کلکٹر بن گئے اور کچھ مدت کے بعد آپ کی خدمات نظام کے حوالے کر دی گئیں جہاں آپ کو آٹھ سو روپے ماہوار پر ڈپٹی کمشنر لگا دیا گیا اور جب آپ ریٹائر ہوئے تو آپ کی تنخواہ سترہ سو روپے تھی۔ ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب پایا۔ ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے علمی خدمات کے صلے میں ال۔ ال۔ ڈی کی ڈگری عطا کی اور ۱۹۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ال کی ڈگری سے نوازا۔

مسجد سے اٹھ کر علم و جاہ کی ان بلندیوں پر پہنچ جانا کوئی کھیل نہیں۔ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مولانا نے اگر ایک طرف اپنی ذہانت، جودت، محنت اور عقل و تدبر کے بل پر علمی بلندیوں کو سر کر لیا تھا تو دوسری طرف حکمران طبقہ کے دل و دماغ میں بھی جگہ بنا لی تھی۔

حلیہ:- رنگ سانولا مگر روکھا۔ قد اونچا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دُہرا بدن۔ موٹاپے کی طرف مائل۔ کمر کا گھیر ضرورت سے زیادہ۔ سر منڈا ہوا، آنکھیں چھوٹی اور ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں۔ بھویں گھنی، آنکھوں میں غضب کی چمک، منہ بڑا، آواز میں لوچ اور گرج۔ ناک چھوٹی، نتھنے بھاری اور ڈاڑھی چھدری۔ ان کے گھر اور باہر کے لباس میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا سفید صافہ باندھ کر نکلتے۔ گرمیوں میں سفید اور جاڑے میں کشمیرے کی اچکن پہنتے۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتا ہوتا۔ گھر میں بوٹوں کے دو جوڑے بھی تھے جنہیں پالش کرنے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ گھر میں ہوتے تو صرف تہمد میں گذارہ کرتے۔ پاس ایک نہایت غلیظ سا حقہ پڑا رہتا جس کا نیچہ شاید ہی کبھی بدلا ہو۔ جاڑے میں سر پر کنٹوپ، جسم پر روئی کی غلیظ اور میلی مرزئی۔ ہر چیز بے طرح بکھری ہوتی۔ بستر، تکیہ، رضائی سب کے سب میلے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بیگم فوت ہو چکی تھیں اور بیگم کے بغیر گھر میں سلیقہ و قرینہ آ ہی نہیں سکتا۔

کردار:- مولانا وقت کے بے حد پابند تھے۔ طبیعت میں ظرافت زیادہ تھی۔ جہاں بیٹھتے محفل کو ادبی چٹکلوں اور لطیفوں سے زعفران زار بنا دیتے تھے۔ روپے کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ نے تقریباً دو تین لاکھ روپیہ دکانداروں کو سود اور منافع پر دے رکھا تھا۔ بعض کی تجارت میں خود بھی شریک تھے۔ ہر شام ان دکانداروں کے پاس جا کر پائی پائی کا حساب چکاتے اور اپنا حصہ لے کر چلتے بنتے۔ سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے، اور اگر کوئی حجت کرتا تو اس کا ناطقہ بند کر دیتے تھے ——

---

[1] یہ معلومات "مضامین فرحت اللہ بیگ" حصہ اول سے حاصل کی گئی ہیں۔

مرزا فرحت اللہ لکھتے ہیں کہ ایک دن میں نے کچھ روپیہ بطور قرض مانگا تو جھٹ کہنے لگے۔ سُود کیا دوگے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ مولانا! آپ اور سود؟ کہنے لگے۔ اس میں حرج کیا ہے؟ مجھے نہیں دوگے تو کسی لالے کو دوگے۔ مجھے دوگے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ آخر میں تمہارا استاد بھی ہوں۔

حُبِ زر کے علاوہ بے حد کنجوس بھی تھے اور لین دین کی عام اشیاء عاریتاً بھی کسی کو نہیں دیتے تھے۔

تصانیف:۔ مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ محصنات۔ ایامیٰ۔ رویائے صادقہ۔ ابن الوقت۔ موعظۂ حسنہ، منتخب الحکایات۔ چند پند۔ صرفِ صغیر۔ نصابِ خسرو۔ رسم الخط۔ مبادی الحکمۃ۔ مالغنیک فی الصرف۔ لکچروں کا مجموعہ دو جلد۔ نظمِ بے نظیر۔ امہات الامہ۔ ترجمۂ قرآن شریف۔ افسانۂ غدر۔ تفسیر۔ کتاب النجوم۔ ترجمۂ تعزیراتِ ہند۔ مطالب القرآن۔ شاہ سورہ۔ اجتہاد۔ الحقوق والفرائض۔ میزان = ۲۷

ان کے علاوہ بھی ایک دو کتابوں کا ذکر بعض مقالات میں دیکھا گیا ہے۔ مثلاً آیاتِ قرآنی اور شرفِ ساغر۔ لیکن کسی مستند ماخذ سے توثیق نہیں ہو سکی اور نہ "شرفِ ساغر" کا کوئی مفہوم سمجھ میں آسکا۔ اس لئے ان کتابوں کو فہرستِ بالا میں شامل نہ کیا۔

تو یہ تھے مولانا نذیر احمد جن کی تحریرات نے لاکھوں دلوں کو گرمایا اور جن کی تقریروں کی گونج فضائے ہند میں ابھی تک باقی ہے ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور مولانا میں بھی تھیں۔ لیکن یہ خامیاں ان کی خوبیوں کے مقابلے میں ذرّہ بہ صحرا سے بھی کمتر تھیں۔ کون گن سکتا ہے کہ مولانا کی تحریروں اور تقریروں سے کتنے گم کردہ راہ، راستے پر پڑ گئے۔ کتنے تاریک دل نورِ ایماں سے جگمگا اٹھے اور کتنے واماندہ راہیوں نے منزل کو جالیا۔ کامیاب زندگی وہی ہے جو دوسروں کے لئے ستونِ نور کا کام دے۔

مولانا ۱۹۱۲ء میں اپنے آقائے حقیقی سے جاملے۔ یہاں کسے رہنا ہے؟ وہ چلے گئے اور ہم آمادۂ سفر ہیں۔ رہے نام اللہ کا!

مولوی نذیر احمدؒ کی مذہبی تصانیف

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

سرسید۔ حالی۔ شبلی۔ آزاد اور نذیر احمد جدید اردو لٹریچر میں ادب کے عناصر خمسہ مانے جاتے ہیں۔ اِن پانچوں نے اپنے اپنے رنگ میں ادب اور زبان کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں اور اُردو دُنیا میں ہمیشہ کے لئے اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ ہمارا ادب اور ہماری زبان خواہ کتنی بھی ترقی کر جائے مگر ان پانچوں معمارانِ ادب سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ہمارے موجودہ ادیبوں اور ہمارے مصنفوں کو نئی نئی راہیں دکھائیں اور ادب و علم کا ایسا جدید اور ہموار راستہ تعمیر کیا۔ جس پر بعد کے ہر انشاء پرداز نے اپنے اشہبِ قلم کو سرپٹ دوڑایا۔

اِن پانچوں میں سے ہر ایک ادیب کی کچھ خصوصیات تھیں۔ جن میں وہ اپنے دوسرے معاصرین کی نسبت نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ سرسید اصلاحی مضامین بیان کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ نیک نفس حالیؔ قوم کے تنزل کے غم میں اور ان کے اخلاق کے نقدان میں ساری عمر نوحہ خوانی کرتے رہے خود کہتے ہیں:۔

سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

شبلیؔ تاریخ کے مرد میدان تھے۔ اور اس باغ میں انہوں نے بڑے بڑے خوشنما گل بوٹے اگائے ہیں۔ آزاد ادب العالیہ اور انشائے لطیف کے شہنشاہ ہیں۔ اُن کے الفاظ میں جادو ہوتا ہے اور اُن کے قلم میں سحر۔ نذیر احمدؒ اپنی مذہبی تصانیف کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔

آج کے مضمون میں ہم مؤخر الذکر مولانا کی اس خصوصیت کی کچھ تفصیلات بیان کریں گے۔ اور اس ضمن میں مولانا کے کردار۔ اُن کی شخصیت اور اُن کی مذہبی حیثیت پر بھی ہلکا سا تبصرہ کریں گے۔ اس کے بعد اگر خدا نے چاہا تو باقی کے چاروں انشا پردازوں کی خصوصیات بھی اسی طرح ایک ایک مضمون میں حوالۂ قلم کی جائیں گی۔

مولانا نذیر احمدؒ نے اپنی ساری عمر میں بہت کچھ لکھا ہے اور بہت کچھ کہا ہے۔ مگر اُن کی خالص مذہبی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

ترجمہ قرآن کریم[1] ۔ غرائب القرآن[2] ۔ ادعیۃ القرآن[3] ۔ ہفت سورہ[4] ۔ دہ سورہ[5] ۔ الحقوق والفرائض[6] ۔ اجتہاد[7] ۔ امہات الامہ[8] ۔ رویائے صادقہ[9] توبۃ النصوح[10] ۔ ایامیٰ[11] ۔ مطالب القرآن[12] ۔ اور بعض مذہبی لکچر[13] ۔ اِن میں سے صرف الحقوق والفرائض تین جلدوں میں ہے۔ باقی سب کتابیں ایک ایک جلد میں ہیں۔ مطالب القرآن کو چھ مبسوط جلدوں میں لکھنے کا ارادہ تھا مگر ایک جلد بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ مولانا کو پیغامِ اجل آگیا اور کتاب ناتمام رہی اور

ناتمام ہی چھپی۔

(۱) ترجمہ قرآنِ کریم

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ترجمۃ القرآن کو لیتے ہیں کیونکہ مولانا کا سب سے مہتم بالشان مذہبی کارنامہ یہی ہے۔

مولانا نذیر احمدؒ کے ترجمہ سے پہلے اُردو میں قرآنِ کریم کے دو ترجمے اور ہو چکے تھے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ سابقہ دونوں ترجمے دہلی ہی سے شائع ہوئے۔

(۱) پہلا ترجمہ امامِ وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ۱۲۰۰ھ (مطابق ۱۷۸۵ء) میں کیا (مولانا احسن مارہروی اپنی کتاب تاریخ نثر اردو ص۸۰ پر اس ترجمہ کا سن ۱۲۰۳ھ (مطابق ۱۷۸۸ء) لکھتے ہیں) یہ غالباً نثر اردو کی سب سے پہلی کتاب تھی (تاریخ داستانِ اردو مؤلفہ پروفیسر حامد حسن قادری ص۵۵)

(۲) دوسرا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے برادرِ اصغر حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۰۵ھ (مطابق ۹۱-۱۷۹۰ء) میں کیا۔ پہلا ترجمہ لفظی تھا اور دوسرا قدرے بامحاورہ اور بیشتر لفظی۔ ان دونوں ترجموں کا نمونہ قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے ذیل میں دیا جاتا ہے جنہیں دیکھ کر آج سے قریباً پونے دو سو برس کی اردو عبارت کا آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ نیز دونوں ترجموں میں جو خفیف سا فرق ہے اُس کا بھی موازنہ آپ بآسانی کر سکیں گے۔

میں نے ان دونوں ترجموں کا نمونہ پیش کرنے میں اردو رسم الخط وہی اختیار کیا ہے جو اُس وقت رائج تھا تاکہ عبارت کے اسلوب کے علاوہ قارئین کرام کو اُس زمانہ کی طرز تحریر سے بھی واقفیت حاصل ہو جائے۔ اس طرز کتابت کو اب ایک تبرک سمجھئے۔ میں نے یہ دونوں نمونے قرآنِ کریم کے بہت قدیم نسخوں سے نقل کئے ہیں جو آج کل بازار میں نہیں ملتے۔ حضرت شاہ رفیع الدینؒ والا ترجمہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ والا ترجمہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔ میں دونوں ترجموں کے دو دو نمونے یہاں پیش کرتا ہوں:۔

(۱) ترجمہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ (نقل مطابق اصل)

(سورۃ البقرہ۔ رکوع اول) "شروع کرتا ہوں مین ساتہہ نام اللہ بخشش کرنیوالی مہربان کی"

"یہہ کتاب نہین شک بیچ اوسکے راہ دکہاتا ہی واسطی پرہیزگارون کی وہ جو ایمان لاتی ہین بن دیکہی اور قایم رکہتی ہین نمازکو اور اوسچیز سے کہ دیا ہمنی اونکو خرچ کرتی ہین اور جو لوگ کہ ایمان لاتی ہین ساتہہ اوسچیز کی کہ اوتارا گیا طرف تیری اور جو کچہہ اوتارا گیا پہلے تجہسے اور ساتہہ آخرۃ کی وہ یقین رکہتی ہین یہہ لوگ اوپر ہدایت کی ہین پروردگار اپنی سی اور یہہ لوگ وہی ہین بہٹکارا پانیوالی تحقیق جو لوگ کہ کافر ہوی برابر ہی اوپر اونکی کیا ڈرایا تو نی اونکو یا نہ ڈرایا تو نی اونکو نہین ایمان لاوینگی مہر کی اللہ نی اوپر دلوں اونکی اور اوپر کانون اونکی اور اوپر آنکہون اونکیکے پردہ ہی اور واسطے اونکے عذاب ہی بڑا۔"

(قرآن مجید مع الترجمتین والتفسیر لعبداللہ بن عباسؓ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ شائع شدہ ۱۲۸۳ھ صفحہ ۳ و ۴)

(ایضاً) ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ

(سورۃ البقرہ۔ آخری رکوع) "واسطی اللہ کی ہی جو کچہہ بیچ آسمانون کی اور جو کچہہ بیچ زمین کے ہی اور اگر ظاہر کرو جو کچہہ بیچ جی تمہارےکے ہی یا چہپاو اوسکو حساب لیویگا تمسے ساتہہ اوسکی اللہ پس بخشے گا جسکو چاہی اور عذاب کریگا جسکو چاہے اور اللہ اوپر ہر چیز کے قادر ہی ایمان لایا پیغمبر ساتہہ اوسچیز کی کہ اوتاری گئی ہی طرف اوسکی اور ایمان لائی مسلمان ہر ایک ایمان لایا ساتہہ اللہ کی اور فرشتون اوسکیکے اور کتابون اوسکی اور رسولون اوسکیکی نہین جدائی ڈالتی ہم درمیان کسیکے پیغمبرون اوسکو سے اور کہا اُنہون نی سنا ہمنی اور مانا ہمنے بخشش مانگتے ہین ہم تیری ای رب ہماری اور طرف تیری ہی پھر جانا نہین تکلیف دیتا

الله کسی جی کو مگر طاقت اوسکے پر واسطے اوسکی ہی جو کمایا اوسنی اور اوپر اوسکی ہی جو کمایا اوسنی ای رب ہماری مت پکڑ ہمکو اگر بھول گئے ہم یا چوک گئی ہم ای رب ہماری اور مت رکھہ اوپر ہماری بوجہہ جیسا رکھا تو نی اوسکو اوپر اون لوگون کی پہلے ہمسے تہے ای رب ہماری اور مت اوٹھوا وہ چیز کہ نہین طاقت واسطے ہماری ساتہہ اوسکی اور معاف کر ہمسی اور بخش ہمکو اور رحم کر ہمکو تو ہی دوستدار ہمارا مدد دی ہمکو اوپر قوم کافرونکی" (" " صـ۱۱)

(۲) ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

(بسم اللہ ....) شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا

(سورۃ البقرہ - رکوع اول)

ہ اس کتاب مین کچھہ شک نہین راہ بتاتی ہی ڈروالون کو جو یقین کرتے ہین بن دیکھے اور درست کرتے ہین نماز کو اور ہمارا دیا کچھہ خرچ کرتے ہین اور جو یقین کرتے ہین جو کچھہ اُترا تجھپر اور جو کچھہ اوترا تجھسے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہین اونہون نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی مراد کو پہنچے وہ جو منکر ہوئے برابر ہے اونکو تو ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ نہ مانینگے مہر کردی اللہ نے اونکے دلپر اور اونکے کان پر اور انکی آنکھوں پر ہے پردہ اور انکو بڑی مار ہی"

(قرآن مجید چہار ترجمہ طبع شدہ مطبع مجتبائی دہلی شائع شدہ سـ۱۳۱۲ھ صـ۳ و ۴)

ایضاً ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

(" " سورہ بقرہ - رکوع آخر) " اللہ کا ہے جو کچھہ آسمان اور زمین مین ہے اور اگر تم کہولوگے اپنے جی کی بات یا چھپاؤگے حساب لیگا تمسے اللہ پہر بخشے گا جسکو چاہے اور عذاب کریگا جسکو چاہے اور اللہ سب چیز پر قادر ہے مانا رسول نے جو کچھہ اوترا اوسکو اوسکے رب کی طرف سے اور مسلمانون نے سب مانا اللہ کو اور اوسکے فرشتونکو اور کتابونکو اور رسولون کو ہم جدا نہیں کرتے کسیکو اُسکے رسولون مین اور بولے ہمنے سُنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہیئے اے رب ہماری اور تجھی تک رجوع ہے اللہ تکلیف نہین دیتا کسے شخصکو مگر جو اوسکے گنجایش ہی اوسیکو ملتا ہی جو کمایا اور اُسی پر پڑتا ہے جو کیا اے رب ہمارے نہ پکڑ ہمکو اگر ہم بہولین یا چوکین اے رب ہماری اور نہ رکھہ ہمپر بوجہہ بھاری جیسا رکھا تہا ہمسے اگلون پر اے رب ہماری اور نہ اوٹھوا ہمسے جسکی طاقت نہین ہمکو اور درگذر کر ہمسے اور بخش ہمکو اور رحم کر ہمپر تو ہمارا صاحب ہے تو مدد کر ہمارے قوم کافرون پر" (" " صـ۶۳ و ۶۴)

(یہ مضمون لکھتے ہوئے ایک عجیب بات نظر سے گذری - سید افتخار عالم صاحب مارہروی نے ۱۹۱۲ء میں حیات النذیر شائع کی جو مولوی نذیر احمدؒ کی نہایت مفصل سوانح عمری اور مکمل کتاب المناقب ہے - اس میں مولوی نذیر احمدؒ کے ترجمۃ القرآن کا موازنہ و مقابلہ دوسرے قدیم و جدید ترجموں سے بھی کیا۔ اور آٹھویں پارے کے تیسرے رکوع کا ترجمہ ہر ایک مترجم قرآن کریم میں سے بطور نمونہ پیش کیا - بعد میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے سیر المصنفین جلد دوم ۱۹۲۸ء میں شائع کی - اُس میں مولوی نذیر احمدؒ اور دوسرے تراجم کا موازنہ کرتے ہوئے وہی آٹھویں پارے کے تیسرے رکوع کا ترجمہ بطور نمونہ درج کتاب کر دیا جو حیات النذیر میں شائع ہوا تھا اور خود کسی مترجم قرآن شریف کو دیکھنے کی زحمت نہ فرمائی - اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں مولانا احسن مارہروی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے بھی تاریخ نثر اردو میں انہی آیتوں کا ترجمہ بطور موازنہ لکھ دیا اور انہوں نے بھی مترجم قرآن شریفوں کو خود مطالعہ فرمانے کی تکلیف نہیں فرمائی - اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے بھی یہی کام کیا - حیرت اس بات پر ہوئی کہ اگرچہ یہ تمام پایہ کے ادیب اور انشاپرداز بڑی آسانی سے موازنہ کرنے کے لئے مترجم قرآن مجیدوں کے مختلف ٹکڑے اصل قرآن مجید سے دیکھ کر نمونۃً پیش کر سکتے تھے - مگر کسی نے بھی یہ محنت گوارا نہ

فرمائی کہ اصل قرآن شریف کو کھول کر دیکھیں اور سب نے ایک دوسرے کی نقل کرتے ہوئے قریباً ایک ہی ٹکڑا قرآن شریف کا نمونۃً پیش کیا اور پھر اسی پر بس نہیں اس سے بھی زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ کسی ایک ادیب نے بھی یہ نہ دیکھا کہ جو رکوع قرآن کریم کا ہم نمونۃً پیش کر رہے ہیں اُس کا صحیح حوالہ اصل قرآن مجید میں سے دیکھ کر لکھیں۔ جو آیات شروع میں مصنف حیات النذیر نے درج کی ہیں اُن کے آخر میں حوالہ لکھا ہے" (دلرانا پارہ ۸ رکوع ۲)" حالانکہ یہ حوالہ غلط ہے رکوع ۲ نہیں بلکہ رکوع ۳ ہے۔ (حیات النذیر صفحہ ۳۶۱) مگر مولوی محمد یحییٰ تنہا نے وہی رکوع ۲ درج کیا ہے جو حیات النذیر سے نقل کیا ہے۔ خود قرآنِ کریم میں نہیں دیکھا (سیر المصنفین جلد ۲ صفحہ ۳۴۳) مگر حامد حسن صاحب قادری نے تو غضب ہی کر دیا۔ نہ رکوع ۲ نہ ۳۔ آپ نے اُسے رکوع ۱۱ لکھ مارا (تاریخ داستان اردو ص ۵۶)۔ یہ ہے ہماری نہایت اہم ادبی اور تاریخی کتابوں کے اندراجات کا حال۔ اس جملہ معترضہ کے بعد آمدم برسرِ مطلب)

اِن متذکرہ بالا دونوں تراجم کا نمونہ آپ نے دیکھا۔ جو شخص قرآنِ کریم کے الفاظ کے معنی معلوم کرنا چاہے یا قرآن شریف کے معنی سبقاً سبقاً پڑھنا چاہے۔ اُس کے لئے بلاشبہ یہ ترجمے مفید ہیں۔ لیکن جو آدمی اردو میں کلام پاک کا مطالعہ کرنا چاہے۔ اُس کے لئے کچھ زیادہ کار آمد نہیں۔ ضرورت تھی کہ بامحاورہ اور سلیس اور عام فہم سادہ عبارت میں جو لوگوں کی بول چال کی زبان ہو قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا جائے۔ اس ضرورت کو سب سے مولوی نذیر احمدؒ نے محسوس کیا۔ اور ایسا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو اس ضرورت کو باحسن وجوہ پورا کرتا تھا۔ یہ ترجمہ مولوی صاحب نے پہلے پہل ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں شائع کیا۔ ترجمہ شائع ہوتے ہی مقبول ہو گیا۔ اور ہر طرف سے اس کی مانگ آنے لگی۔ اس وقت تک بلا مبالغہ لاکھوں تک چھپ چکا ہے۔ ترجمہ واقعی نہایت عمدہ اور بہترین ہے۔ اس وقت تک قرآنِ کریم کے بیسیوں تراجم بڑے بڑے علماء نے اردو میں کیے ہیں مگر جو روانی اور سلاست اور شگفتگی اور دلچسپی مولوی نذیر احمدؒ کے ترجمے میں ہے وہ کسی اور کے ترجمے میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔ صفحے کے صفحے آپ پڑھتے چلے جائیں یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ کوئی ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت دلچسپ اور بلند پایہ ادبی تالیف کا مطالعہ آپ کر رہے ہیں۔ اور یہی اس ترجمہ کا کمال ہے۔ الحق مولوی نذیر احمدؒ کا یہ کارنامہ اُن کے بعض تمام علمی اور ادبی کاموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور اس ترجمہ کی وجہ سے اُن کا نام زندہ رہے گا۔ یہ ترجمہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں اُن کو عربی زبان پر کامل عبور تھا۔ وہاں وہ اردو زبان اور ادب کے بھی پورے ماہر تھے تبھی اتنا عمدہ اور اچھا ترجمہ وہ دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ بلاشبہ یہ قرآنِ کریم کی عظیم الشان خدمت تھی۔ جو مولوی صاحب نے نہایت محنت اور پوری جانفشانی کے ساتھ انجام دی۔ اور یہ اُن کا ایسا عظیم الشان مذہبی کارنامہ تھا جس پر اُن کو جتنا بھی فخر ہوتا کم تھا۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ مہتم بالشان کام اکیلے نذیر احمدؒ کے بس کا نہ تھا۔ اگر بعض اور عالم اس میں مولوی صاحب کی پوری پوری مدد نہ کرتے تو مولوی صاحب تنہا اپنی کوشش سے شاید اتنا اچھا ترجمہ پیش نہ کر سکتے۔ اس کی تفصیل پہلے اڈیشن کے دیباچہ میں خود مولوی نذیر احمدؒ نے یہ لکھی ہے:۔

"ترجمے کے حق میں یہ ایک نیک فال تھی کہ حسن اتفاق سے مولوی ابو عبدالرحمٰن محمدؒ صاحب ہاتھ آ گئے اور وہ شروع سے آخر تک میرے شریک بلکہ ایک اعتبار سے شریکِ غالب اور مددگار رہے۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھتے۔ بیچ میں میز حائل ہوتی۔ میرے ہاتھ میں قرآن مجید اور کبھی میں نے حفظ پر اعتماد کیا۔ تو قرآن بھی نہ سہی۔ مولوی محمد صاحب کے گرداگرد تراجم اور تفاسیر اور کتب لغت۔ میں ایک جملے یا ایک آیت کا ترجمہ جیسا الفاظ قرآن سے سمجھتا تھا بولتا۔ اور محمد صاحب اُس کو قلمبند کرتے۔ اور پھر مجھ میں اور مولوی صاحب میں بحث ہوتی۔ اور اختلاف کی صورت میں تراجم اور تفاسیر اور لغت کی طرف رجوع کیا جاتا اس طرح پر سارے قرآن کا ترجمہ کیا گیا۔ پس یہ ترجمہ براہِ راست قرآن کا ترجمہ ہے نہ دوسرے ترجموں کی طرح کسی ترجمے کا ترجمہ۔ اس کا ماخذ قرآن کے الفاظ ہیں نہ کسی مفسر یا مترجم کے۔

پھر ہم دونوں نے ترجمے پر نظرثانی کی۔ مولوی محمد صاحب ترجمہ پڑھتے اور میں عبارت کی سلاست اور الفاظ کی نشست کا دھیان رکھتا اور
الفاظ کو قرآن سے ملاتا۔ اور پھر ہم دونوں میں پہلے
کی طرح بحث ہوتی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بحث میں رنجش بھی ہو جاتی تھی مگر چونکہ دونوں کی نیت

دونوں نے کبھی مناظرے کی حد سے تجاوز نہیں کیا۔ ابھی اختلاف کر رہے تھے ابھی متفق ہو گئے ابھی لڑے ابھی ملے۔

ایسی کاوش کے ساتھ ترجمہ اور نظرِ ثانی کرنے پر بھی ہم نے بہتیرا چاہا کہ لوگ ترجمہ کو دیکھیں۔ اور نکتہ چینی کریں مگر کسی نے حامی نہ بھری۔ اور یوں کوئی اڑتی ہوئی سن بھاگا اور چلتی ہوئی ایک بات کہہ دی تو گو ہم نے اُس کو بھی رد نہیں کیا مگر دل کی ہوس پوری نہ ہوئی۔ ترجمہ کی کاپیاں عام جگہ میں پڑھی اور مقابلہ کی جاتی تھیں اور بہت لوگوں کو معلوم ہوا کہ نیا ترجمہ چھپ رہا ہے مگر کوئی رُخ ہی نہ دے تو کیا کیا جائے۔ انلزمکموھا وانتم لھا کارھون۔ صرف سورہ بقر اور کچھ آل عمران کے لئے مولوی حافظ عبدالرب صاحب کی شمولیت سے جلسے ہوئے اور بڑی تفتیش کے ساتھ ترجمہ دیکھا گیا۔ مگر مشکل یہ آ کر پڑی کہ مولوی عبدالرب صاحب آنکھوں سے معذور۔ اور وہ ایک ایک لفظ کے لئے تمام تفاسیر اور تراجم لفظ لفظ پڑھوا کر سنتے تھے اور آدھے دن کی پوری محنت میں ایک رکوع بھی تمام نہیں ہوتا تھا۔ اگر اسی طرح پر نظرِ ثانی کو چلنے دیا جاتا تو مجھ کو اپنی زندگی میں ترجمے کے تمام ہونے کی توقع نہ تھی۔ بہ مجبوری اس طرز کو موقوف کیا۔ پھر بھی جو ڈھنگ سورہ بقرہ کے ترجمہ کا پڑ گیا تھا۔ اُس کو آخر تک نباہا۔ ایک مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری نے نئے ترجمے کا نام سنا اور پھڑک اُٹھے اور باصرار مسودہ منگوایا۔ میں نے اُن کو لکھا کہ ارادتمندانہ نہیں بلکہ مخاصمانہ اور معترضانہ نظر سے دیکھیں اور انہوں نے اسی نظر سے دیکھا اور تمام تر دیکھا اور خوب دیکھا۔

اُس وقت تک ہم نے ترجمے کی عبارت کی خوبی کے پیچھے اصل مطلب کا تو نہیں مگر ترتیب الفاظ کا اور خود الفاظ کا بھی جس قدر خیال کرنا ممکن تھا نہیں کیا تھا۔ مولوی فتح محمد خاں نے ہم کو روکا اور بجا روکا اور ہم نے سارے ترجمے کو پھر تیسری بار دیکھا۔

اس وقت تک ہمارا ترجمہ بطور ایک کتاب کے علٰحدہ لکھا ہوا تھا۔ اب کاپی لکھنے کی نوبت آئی تو جہاں جہاں حک و اصلاح کی وجہ سے زیادہ مشکوک ہو گیا تھا۔ مولوی محمد صاحب نے کاتب کے لئے اُس کو نقل کیا۔ نقل کرتے وقت جو اشتباہات واقع ہوتے وہ اُن کو میرے روبرو پیش کرتے اور یہ چوتھی نظر ہوئی مگر بالاستیعاب نہیں۔

اب یہ تجویز درپیش ہوئی کہ ترجمہ کس پیرائے میں چھپے۔ کبھی خیال آیا کہ مقابل متن۔ کسی نے کہا کہ صفحے کے اعلیٰ حصہ میں متن اور اسفل میں ترجمہ۔ لیکن معلوم تھا کہ جو مسلمان پرانی لکیر کے فقیر ہیں ذرا سی تبدیلی و تجدید سے بھی بھاگتے ہیں اور صرف ایسا ترجمہ لینا چاہتے ہیں جو بین السطور ہو۔ چنانچہ نقشِ اول کے لئے یہی طرز اختیار کیا گیا ہے۔ اور اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اوپر متن اور نیچے ترجمہ ہونے سے اصل و ترجمہ کے الفاظ کی کمی بیشی کھل پڑی۔ اس نوبت میں حکیم مولوی عبداللہ صاحب سے بڑی مدد ملی۔ کہ اُن کی طالب علمی جدید العہد ہے۔ اور الفاظ کی جامعیت و مانعیت پر اُن کی نظر خوب دوڑتی ہے۔ ترجمہ پر ہماری یہ پانچویں نظر ہوئی اور پچھلی سب نظروں سے اس میں زیادہ کاوش کرنی پڑی۔

پھر ایک چھٹی نظر حتنتم پروف کی تھی۔

اس طریقِ عمل سے ظاہر ہے کہ یوں کہنے کو تو ہم نے ڈھائی برس ترجمہ پر صرف کئے مگر ایک حساب سے رات دن اسی کے پیچھے پلٹے رہے تو وہ ڈھائی برس نہیں ہیں بلکہ پانچ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ اور لوگ تو صرف نظرِ ثانی کو کافی سمجھا کرتے ہیں۔ ہم نے چھ بار ترجمے کو دیکھا اور بتایا ہے اگرچہ یہ ترجمہ میرے نام سے شائع کیا جاتا ہے مگر میں نے تو سارا حال پوست کندہ ظاہر کر دیا ہے۔ حقیقت میں یہ ترجمہ مولویوں کی ایک جماعت کا ترجمہ ہے۔" (اقتباس از ترجمہ مولوی نذیر احمد اڈیشن اوّل)

یہی وجہ ہوئی کہ دہلی میں عام طور سے یہ بات مشہور تھی اور اب تک ہے کہ یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد کا نہیں بلکہ مولوی محمد صاحب کا ہے۔ مگر جو اصل حقیقت ہے اُسے مولوی نذیر احمد نے خود ہی بیان کر دیا ہے۔

یہ بتلانے کے بعد کہ ترجمہ کس طرح ہوا؟ اب ہم اس ترجمہ کی کچھ خصوصیات ناظرین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ جن سے آپ کو اس ترجمے سے متعلق صاحب کی بے انتہا محنت و کاوش کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

ترجمۂ نذیریہ کی خصوصیات

(۱) مولوی صاحب کا قاعدہ تھا کہ قرآن مجید کی عربی اور اردو عبارت کی کتابت اور طباعت نہایت خوشخط۔ روشن اور دیدہ زیب کرایا کرتے تھے اور اس کے لئے بہترین کاتب اور بہترین پریس انتخاب کیا کرتے تھے۔ میرے پاس جو حمائل ہے وہ ترجمہ کا دوسرا اڈیشن ہے اور ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں چھپا ہے۔ ترجمہ اور حواشی اگرچہ نہایت باریک اور خفی قلم کے ہیں مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ پر موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ آج کل بلاک میں بھی وہ خوبصورتی اور صفائی نہیں پائی جاتی جو لیتھو کی اس حمائل میں ہے۔ ہر شخص جو اسے دیکھتا ہے یہی سمجھتا ہے کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے بلاک کی چھپائی ہے۔ اس حمائل کے کاتب استاذی منشی محمد الدین مرحوم (مکرمی ظہیر الدین احمد صاحب پروپرائٹر اردو مرکز لاہور کے جدامجد) تھے اور حمائل دہلی کے مشہور چھاپہ خانہ مطبع انصاری میں چھپی تھی۔

(۲) صحت کا بے حد اہتمام رکھتے تھے۔ کاپیاں اور پروف نہایت احتیاط اور غور کے ساتھ بار بار مولانا خود دیکھتے تھے۔ اور اگر طباعت حسب منشا نہ ہوتی تھی تو فرمے ردی کر دیا کرتے تھے اور نقصان کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

(۳) کاغذ عمدہ اور مضبوط لگاتے تھے۔

(۴) آیات۔ رکوع۔ سورتوں اور پاروں کی فہرست شروع میں درج کرتے تھے۔

(۵) ہر اڈیشن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ کے متعلق مفید معلومات مختصراً لکھتے تھے۔ جس کے آخر میں ایک مضمون بھی ہوتا تھا جس کا عنوان تھا "وحی کے محفوظ رہنے کی کیا دلیل ہے؟"

(۶) مضامین قرآنی کی ایک نہایت مفصل فہرست ابتدا میں شامل کی۔ جس سے ہر مضمون کی آیات قرآن کریم سے چشم زدن میں نکل سکتی ہیں۔ یہ واقعی بڑی محنت کا کام تھا اور اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ فہرست بڑے سائز کے ۴۶ صفحات پر آئی ہے۔ اور نہایت جامع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق اس فہرست میں پندرہ باب ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعلق اُنیس۔ کل فہرست چھ حصص پر منقسم ہے۔

(۷) ترجمہ ایسا بامحاورہ اور سلیس ہے کہ نہ اس سے پہلے ایسا ترجمہ ہوا تھا۔ نہ بعد میں کوئی کر سکا۔

(۸) ترجمہ میں مولوی صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق مفرد ضمائر کا استعمال نہیں کیا بلکہ جمع کی ضمیریں استعمال کیں۔ مثلاً انا ارسلنٰک کا ترجمہ دوسرے تمام مترجمین کی طرح "ہم نے تجھے بھیجا" نہیں کیا بلکہ "ہم نے تمہیں بھیجا" کیا۔

(۹) قَالَ کا ترجمہ "کہا" ہے۔ مگر مولوی صاحب نے ہر جگہ یہی ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ موقع اور محل کے مناسب کہیں "فرمایا" کہیں "کہا" اور کہیں "عرض کی" کیا۔ اسی طرح بعض مخصوص اعضائے جسم کے نام لینا ہماری زبان اور ہماری تہذیب میں بہت معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر مولوی صاحب نے ایسے موزوں الفاظ تراشے کہ ان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مثلاً انہوں نے ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا کا ترجمہ دوسرے مترجمین کی طرح "مریم نے اپنی فرج کو محفوظ رکھا" نہیں کیا۔ بلکہ یہ کیا کہ "مریم نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا"۔ جو واقعی نہایت ہی لاجواب ترجمہ ہے۔ ایسا کہ اس سے بڑھ کر خیال میں نہیں آسکتا۔

(۱۰) ترجمہ میں ربط تسلسل اور سلاست پیدا کرنے کے لئے خطوط وحدانی میں بکثرت الفاظ اور فقرات اپنی طرف سے زیادہ کئے تاکہ عبارت مربوط۔ شگفتہ اور دلچسپ ہو جائے اور ترجمہ میں کہیں جھول باقی نہ رہے۔

(۱۱) قریباً ہر صفحہ پر فائدہ کے عنوان سے اردو میں مفید حواشی لکھے جو ایک مکمل تفسیر کا کام دیتے ہیں۔ یہ حواشی بیشتر حضرت شاہ عبدالقادر کی مشہور تفسیر موضح القرآن سے لئے گئے ہیں۔

(۱۲) ترجمہ کے بیسیوں اڈیشن مولوی صاحب کی زندگی میں چھپے اور ہر اڈیشن میں مولوی صاحب نے کچھ نہ کچھ ترمیم و تنسیخ ترجمہ میں ضرور کی۔

(۱۳) بعض اڈیشنوں میں ترجمہ بین السطور ہے اور بعض میں ایک صفحہ پر کلام پاک اور بالمقابل صفحہ پر اردو ترجمہ۔

(۱۴) قرآن کریم کے عربی متن کو بین السطور ترجمہ میں حنائی رنگ دے دیا۔ جس سے قرآن کریم کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا۔ یہ کام پریس پر نہیں ہوتا تھا بلکہ مولوی صاحب بیوہ عورتوں اور غریب آدمیوں سے فرموں کو رنگوانے کا کام لیا کرتے تھے۔ اور اس کا ان کو معقول اور نقد معاوضہ دیا کرتے تھے۔

(۱۵) رموزِ اوقاف نہایت سہل کر کے اور بڑے آسان پیرائے میں لکھے۔ ایسے کہ چھوٹا بچہ بھی سمجھ لے۔ یہ بات پہلے ترجموں میں مفقود تھی۔

(۱۶) ہدیہ بہت کم رکھا۔ بڑے سائز کا قرآنِ کریم جس کے ۱۱۱۲ صفحات تھے۔ چھ روپے میں ہدیہ کیا کرتے تھے۔ اُس سے بھی بڑے سائز کا قرآن شریف جو کمزور بصارت رکھنے والے اصحاب کے لئے ہوتا تھا آٹھ روپے یا نو روپے کو ہدیہ ہوتا تھا۔

ترجمہ نذیریہ کے نقائص

محاسن کے تذکرہ کے بعد ہم کو ترجمہ کے معائب پر بھی دیانتداری کے ساتھ ایک نظر ڈالنی چاہیئے اور دیکھنا چاہئے کہ اس ترجمہ میں کیا کیا نقائص رہ گئے ہیں۔ کیونکہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آنے سے چیز کی اصل حقیقت زیادہ واضح اور صاف نظر آنے لگتی ہے۔

کچھ ہم ہی پر موقوف نہیں۔ جب یہ ترجمہ پہلے پہل شائع ہوا تو مولوی اشرف علی جیسے سنجیدہ اور جید عالم کو بھی اس میں ۶۰ کے قریب موٹے موٹے نکات نظر آئے تھے اور ندوۃ العلماء لکھنو نے بھی اُس وقت اس میں ۵۰ کے قریب غلطیاں نکالی تھیں۔ ہم نے اس ترجمہ کا اس گہری نظر سے تو مطالعہ نہیں کیا۔ نہ اس لحاظ سے کبھی ترجمہ کو دیکھا کہ اس میں نقائص کیا کیا ہیں؟ مگر اس مضمون کے لکھنے کے وقت جب ترجمہ کو اس نظر سے دیکھا تو جو موٹی موٹی باتیں صرف دو ابتدائی پاروں کا ترجمہ پڑھنے سے سرسری طور پر خیال میں آئیں وہ ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) سب سے پہلی بات جو مولوی نذیر احمد کے ترجمہ میں گراں گزرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ہر جگہ افضل الرسل خاتم النّبیّین حضرت رسول کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے متعلق "پیغمبر صاحب" کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ اس سے صاف طور پر بُوئے بیگانگی آتی ہے۔ اور اگر مولوی نذیر احمدؒ کے نام سے لوگ واقف نہ ہوں تو یہی خیال ہوتا ہے کہ ترجمہ کرنے والا کوئی ہندو یا عیسائی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا اسمِ گرامی تو ہر مسلمان کو نہایت تعظیم و تکریم سے اور پورے ادب و احترام کے ساتھ لینا چاہئے۔ نہ کہ ایسی بے توقیری کے ساتھ۔ مولوی صاحب نے ترجمۃ القرآن کے علاوہ اپنی دوسری کتابوں میں بھی حضور علیہ السّلام کو بالعموم "پیغمبر صاحب" ہی کر کے مخاطب کیا ہے۔

(۲) خطوط وحدانی میں مولوی صاحب نے جگہ جگہ جو عبارتیں اور فقرے اپنی طرف سے عبارت کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے بڑھائے ہیں۔ اُن میں اُن کا انجن کہیں کہیں پٹڑی سے پھسل گیا ہے۔ اور وہ معنی قرآن کریم کی آیت سے ہرگز مستنبط نہیں ہوتے جو مولوی صاحب نے خطوط وحدانی میں لکھے ہیں۔ اس موقع پر بے اختیار وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں جو خود مولوی صاحب نے ایک مرتبہ سرسیّد احمد خاں کی تفسیر القرآن کے متعلق بیان کئے تھے اور جو ترجمہ القرآن کے سلسلہ میں خود مولانا پر پورے طور سے صادق آتے ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں:۔

"میرے نزدیک سرسیّد کی تفسیر دیوان حافظ کی اُن شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جوتڑوں سے کان گانٹھ کر (کتنی مہذب اور شائستہ عبارت ہے! اسماعیل) سارے دیوان کو کتاب تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سیّد احمد خاں نے منطوقِ آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے۔ مگر میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے ہیں۔ ہاں ہاں قرآن کے مُنزّل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور اُن معانی کو ماننا مشکل یہ وہ معنی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا۔ نہ جبریل حاملِ وحی کا۔ نہ رسولِ خدا کا۔ نہ قرآن کے کاتب و مدون کا۔ نہ اصحاب کا نہ تابعین کا۔ نہ تبع تابعین کا۔ نہ جمہور مسلمین کا"۔ (حیات النذیر ص۱۱۹)

(۳) بعض بعض جگہ خود ترجمہ بالکل غلط ہے۔ سیاق و سباق کے بھی خلاف۔ کلام عرب کے بھی خلاف۔ عادت اللہ کے بھی خلاف اور عقل کے بھی خلاف۔

(۴) کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا کو ترجمہ کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملے اور اُن کو یونہی اِدھر اُدھر سے الفاظ لے کر کام چلانا پڑا ہے۔

(۵) ایسا تو اکثر ہوا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ اور اُس کی عبارت میں جو وقار۔ سنجیدگی اور متانت ہے۔ اُس کے لحاظ سے ترجمہ نہایت سوقیانہ اور عامیانہ

ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو اس میں مسخراپن آگیا ہے۔ اور نتیجۃً ترجمہ قرآنِ حکیم جیسی باعظمت کتاب کی شان کے بالکل منافی ہو گیا ہے۔ یہ صورتِ حال مترجم کے دل میں قرآنِ کریم کی حقیقی عزت نہ ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ایک زمانہ میں عیسائیت کے دلدادہ رہے ہیں اور جب لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتے تھے تو التحیات کے وقت بجائے اشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ کے اشھد ان عیسی ابن اللہ آہستہ سے کہا کرتے تھے (حیات النذیر صفحہ ۴۶۸) تو ہمارا شبہ اور قوی ہو جاتا ہے۔ کہ شاید اُس وقت کی کوئی کسر دل میں باقی رہ گئی ہو جس کے نتیجہ میں خدا و رسولؐ کا ادب و احترام اُن کے دل سے اُٹھ گیا تھا۔ اگر ہمارا یہ خیال غلط ہے تو پھر اس کا باعث نئے نئے محاورے استعمال کرنے اور چھپے دار عبارت لکھنے کا شوق ہو سکتا ہے اور اس شوق میں اُن کے دل سے فرقِ مراتب اُٹھ گیا تھا۔

میں نمونۃً ایک ایک دو دو آیات اپنے متذکرہ بالا بیان کے ثبوت میں نیچے لکھتا ہوں۔ ناظرین خود اندازہ لگالیں۔ ممکن ہے رائے کے اظہار میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہو۔

(۱) واذ قال ربک للملٰئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک۔ (ترجمہ) "اور (اے پیغمبر لوگوں سے اُس وقت کا تذکرہ کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں (اپنا ایک) نائب بنانے والا ہوں (تو فرشتے) بولے کیا تو زمین میں ایسے شخص کو (نائب) بناتا ہے جو اُس میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کرے اور (بناتا ہے تو ہم کو بنا کہ) ہم تیری حمد (و ثنا) کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں"۔

اس ترجمہ میں الفاظ "بناتا ہے تو ہم کو بنا" قرآن مجید کے کسی فقرے سے مستنبط نہیں ہوتے۔ فرشتوں نے تو آدمی کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر کے بڑے ادب سے درگاہ رب العزت میں عرض کیا تھا کہ حضور ہم تو تابعدار ہیں جس طرح حضور کی مرضی۔ یہ فقرہ تو تمرد اور سرکشی کو ظاہر کرتا ہے۔ جو فرشتوں سے ہونی ناممکن ہے۔

(۲) واذ قال موسیٰ لقومہٖ یٰقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم۔ (ترجمہ) اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم نے بچھڑے (کی پرستش) کے اختیار کرنے سے اپنے اوپر (بڑا ہی) ظلم کیا تو (اب) اپنے خالق کی جناب میں توبہ کرو اور (وہ یہ ہے کہ) اپنے لوگوں کے ہاتھوں سے) اپنے تئیں ہلاک کرو"۔

اگر یہ معنی درست سمجھے جائیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ رہا ہو گا۔ اور سارے کے سارے حضرت موسےٰ علیہ السّلام کے سامنے ہی ایک دوسرے کو مار کر مر رہے ہوں گے پس آیت کے صحیح معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کی بُری خواہشیں اور بُرے خیالات کو مٹا ڈالو۔ اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے تم سے یہ گناہ سرزد ہُوا۔ اگر تمہارے دل میں خدا کا ڈر اور خوف ہوتا تو تم بچھڑے کو نہ پوجتے۔ چنانچہ امام راغب اس کے متعلق فرماتے ہیں۔ قیل عنی بقتل النفس اماطۃ الشھوات یعنی قتل نفس سے دل کو بُری خواہشوں سے پاک کرنا مراد ہے اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے کئے پر پشیمان ہو اور اپنے نفسوں پر لعنت بھیجو جس نے تمہیں اس شرک کی تحریک کی۔ جب یہ کہتے ہیں کہ قتل اللہ الانسان تو اس کے معنی یہ ہُوا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس انسان پر اُس کے بُرے اعمال کے باعث لعنت بھیجی۔ (تفسیر کبیر جلد اوّل صفحہ ۱۴۵)

(۳) واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا ما اٰتینٰکم بقوۃ واسمعوا، قالوا سمعنا وعصینا (ترجمہ) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم (یعنی تمہارے بزرگوں) سے پکا قول لیا اور (کوہ) طور کو اُٹھا کر تمہارے (یعنی تمہارے بزرگوں کے) اوپر لا لٹکایا (اور حکم دیا کہ یہ کتاب تورات) جو ہم نے تم کو دی ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور (جو کچھ اس میں لکھا ہے اُس کو) سنو (اور پلّے باندھو۔ اس کے جواب میں) اُن لوگوں نے (گویا زبانِ حال سے) کہا کہ ہم نے سنا تو سہی ولیکن (ہم اس کو) تسلیم نہیں کرتے"۔ یہ ترجمہ سارے کا سارا ہی بالکل غلط ہے۔ نہ پہاڑ زمین سے اکھیڑ کر بنی اسرائیل کے سر پر لٹکایا گیا۔ نہ یہاں توریت کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے۔ نہ زبانِ حال سے یہودیوں نے کچھ کہا۔ حیرت ہے کہ

مولانا نے بایں علم و فضل ایسا لچر ترجمہ کس طرح کر دیا؟ اور اُن کا دماغ اُس وقت کہاں تھا؟ بھلا آپ غور تو فرمائیں کہ کون ایسا عقل کا دشمن اور نادانِ محض ہوگا کہ پورا پہاڑ اُس کے سر پر لٹکا ہوا ہے (جو ایک منٹ میں اس کی ہڈیاں پیس کر رکھ دے گا) اور پھر بھی وہ بڑی دیدہ دلیری سے کہہ رہا ہے کہ حکم سن تو لیا مگر مانوں گا کبھی نہیں۔ ایسے مصیبت کے وقت میں تو فرعون جیسے سخت کافر نے بھی کہہ دیا تھا کہ میں موسیٰ کے رب پر ایمان لایا مجھے پانی سے بچاؤ۔ مگر بنی اسرائیل اُس سے بھی زیادہ سخت دل تھے کہ پہاڑ کے لٹکے ہونے کی حالت میں بھی اُن کی ہیکڑی قائم رہی۔ پھر توریت پر ایمان لانے کا قصہ مولانا نے اپنی طرف سے گھڑ کر ترجمہ میں داخل کر دیا۔ حالانکہ اصل میں اس کا کوئی بھی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ آیت کا سیدھا اور صاف ترجمہ یہ ہے کہ "جب ہم نے تم سے اقرار لیا۔ اُس وقت تم طور کے نیچے کھڑے تھے (اور پہاڑ تم پر بلند تھا) ہم نے تم سے کہا کہ جو کچھ حکم ہم نے تمہیں دیا ہے اُسے سنو اور اچھی طرح بجا لاؤ۔ تم نے کہا کہ ہم نے سن تو لیا مگر ہم مانیں گے نہیں۔ نہ معلوم اس سیدھے سادے ترجمے میں ایسی کیا مشکل تھی کہ مولانا نے ایسا بعید از قیاس اور بعید از فہم ترجمہ کیا؟

(۴) فول وجھك شطر المسجد الحرام۔ (ترجمہ) "(نماز پڑھتے وقت) مسجد محترم (یعنی کعبے) کی طرف کو منہ کر لیا کرو۔"

کعبے کے لئے مسجد الحرام کا لفظ عام طور سے مستعمل ہے اور ہر مسلمان اسے سمجھتا ہے۔ اس کے لئے مسجد محترم کا نیا لفظ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر "کی طرف کو منہ کر لیا کرو" یہاں "کو" بالکل فصاحت کے خلاف ہے۔ "کی طرف منہ کر لیا کرو" بالکل ٹھیک ہے۔

(۵) اذ تبرا الذین اتبعوا من الذین اتبعوا (ترجمہ) "اُس وقت گرو (اپنے) چیلے چانٹوں سے دست بردار ہو جائیں گے۔" "چیلے چانٹوں" ایک بہت ہی عامیانہ اور بازاری لفظ ہے۔ قرآنِ کریم کے ترجمہ کو ایسے سوقیانہ الفاظ سے پاک رکھنا چاہئے۔ مگر اسے کیا کیا جائے کہ اس قسم کے عامیانہ الفاظ جو متانت اور تہذیب کے بالکل خلاف تھے مولانا کے منہ پر چڑھے ہوئے تھے اور مولانا ہر جگہ تحریر و تقریر میں بلا تکلف اُن کا استعمال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآنِ کریم کے ترجمے میں بھی اُنہوں نے ان کے استعمال سے احتراز نہیں کیا۔

(۶) واتی المال علیٰ حبہ (ترجمہ) "اور مال (عزیز) اللہ کی حُب پر دیا۔" کتنا بھونڈا ترجمہ ہے۔ اگر یہ ترجمہ کرتے کہ "مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا" یا "اللہ کی محبت میں دیا" تو نہایت مناسب رہتا۔

(۷) فمن شھد منکم الشھر۔ (ترجمہ) "تم سے جو شخص اس مہینے میں (زندہ) موجود ہو۔" اس زندہ کے لفظ نے آیت کے ترجمہ کو قابلِ مضحکہ بنا دیا۔ صحیح ترجمہ یہ تھا کہ تم میں سے جو اس مہینے کو پائے وہ روزہ رکھے۔

(۸) ھن لباس لکم وانتم لباس لھن۔ (ترجمہ) "وہ تمہارے دامن (کی جگہ) ہیں اور تم اُن کی چولی (کی جگہ) ہو۔" اس ترجمے سے آیت کا مطلب بالکل ہی سمجھ میں نہیں آ سکتا اور بات مبہم سی رہ جاتی ہے اگر یہ ترجمہ کرتے کہ "وہ تمہارے آرام کا باعث ہیں اور تم اُن کے آرام کا باعث ہو۔" (لباس آدمی کے آرام ہی کا باعث ہوتا ہے) تو بات بالکل ٹھیک رہتی اور ترجمہ بھی موزوں ہو جاتا۔

(۹) وبقیۃ مما ترک آل موسیٰ و آل ھٰرون۔ (ترجمہ) "اور (نیز) موسیٰ اور ہارون جو یادگار چھوڑ مرے ہیں۔" پیغمبروں کے لئے "چھوڑ مرے" کا لفظ کتنا بیہودہ اور خلافِ ادب ہے۔ نہ معلوم مولوی نذیر احمد کے دل سے بزرگوں کا ادب و احترام کیوں اُٹھ گیا تھا؟ پھر ویسے بھی یہ ترجمہ غلط ہے کیونکہ یہاں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے الفاظ نہیں بلکہ آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے الفاظ ہیں۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ "آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ نے جو کچھ چھوڑا ہے۔"

(۱۰) قال فبما اغویتنی لاقعدن لھم صراطك المستقیم۔ (ترجمہ) "(اس پر) شیطان بولا کہ جیسی تو نے میری راہ ماری ہے۔ میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں تو سہی۔"

(۱۱) ان ربك لبالمرصاد۔ (ترجمہ) "بیشک تمہارا پروردگار نافرمانوں کی تاک میں (لگا رہتا) ہے۔"

دونوں مؤخر الذکر آیتوں میں خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے مولوی نذیر احمدؒ نے جو عامیانہ اور رکیک الفاظ استعمال کئے ہیں وہ کسی مزید تشریح کے

محتاج نہیں۔

نمونتہً انہی چند آیتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر ہمارے قرآن مجید کے ترجمے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو شاید اس قسم کی آیتوں کی تعداد سینکڑہ سے بھی بڑھ جائے گی۔

آخر میں مولوی صاحب کے ترجمہ کے دو نمونے ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ دونوں نمونے اُن کی حمائل مطبوعہ ۱۳۱۶ھ سے لئے گئے ہیں پہلے ترجموں کو سامنے رکھ کر اس ترجمہ کی سلاست کا آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔

نمونہ ترجمۂ نذیریہ

(۱) سورۂ بقرہ - رکوع اوّل

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - (ترجمہ) (شروع) اللہ کے نام سے (جو) نہایت رحم والا مہربان (ہے)

الٓمٓ یہ وہ کتاب ہے جس (کے کلام الٰہی ہونے) میں کچھ بھی شک نہیں - پرہیزگاروں کی رہنما ہے جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے اُن کو دے رکھا ہے اُس میں سے (راہِ خدا میں بھی) خرچ کرتے اور (اے پیغمبر) جو (کتاب) تم پر اُتری اور جو تم سے پہلے اُتریں اُن (سب) پر ایمان لاتے اور وہ آخرت کا بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کے سیدھے رستے پر ہیں اور یہی (آخرت میں من مانی) مرادیں پائیں گے (اے پیغمبر) جن لوگوں نے (قبول اسلام سے) انکار کیا اُن کے حق میں یکساں ہے کہ تم اُن کو (عذابِ الٰہی سے) ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔ وہ تو ایمان لانے والے ہیں نہیں - اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ (پڑا) ہے اور (آخرت میں) اُن کو بڑا عذاب (ہونے والا) ہے۔" (حمائل شریف مترجم ڈپٹی نذیر احمد ص۳-۴)

(۲) سورۂ بقرہ - رکوع آخر

" جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (وہ سب) اللہ ہی کا ہے اور جو تمہارے دل میں ہے اگر اُس کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ - اللہ تم سے اُس کا حساب لے گا پھر جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ÷ (ہمارے یہ) پیغمبر (محمد) اُس کتاب کو مانتے ہیں جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر اُتری ہے اور (پیغمبر کے ساتھ دوسرے) مسلمان بھی (یہ سب کے) سب اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے کہ (سب پیغمبروں کا دین ایک ہے اور) ہم خدا کے پیغمبروں میں سے کسی کو (جدا) نہیں سمجھتے (یعنی سب کو مانتے ہیں) اور بول اُٹھے کہ (اے ہمارے پروردگار) ہم نے (تیرا ارشاد) سنا اور تسلیم کیا اے ہمارے پروردگار (بس) تیری ہی مغفرت (درکار ہے) اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے ÷ اللہ کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اُسی قدر جس (کے اُٹھانے) کی اُس کو طاقت ہو - جس نے اچھے کام کئے تو اُن کا نفع بھی) اُسی کے لئے ہے اور جس نے بُرے کام کئے (اُن کا وبال بھی) اُسی پر - اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اُس کے وبال میں) نہ پکڑ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ جس طرح اُن پر تو نے (اُن کے گناہوں کی پاداش میں احکام سخت کا) بار ڈالا تھا ویسا بار ہم پر نہ ڈال اور اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس (کے اُٹھانے) کی ہم کو طاقت نہیں ہم سے نہ اُٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگزر اور ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما - تو ہی ہمارا (حامی و) مددگار ہے تو ہی اُن لوگوں کے مقابلے میں جو

کافر ہیں ہماری مدد کر۔" (شمائل شریف مترجم ڈپٹی نذیر احمد ص۵۰۔۵۱)

(۲) غرائب القرآن

۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں مولوی نذیر احمدؒ نے ترجمۃ القرآن کا ساتواں ایڈیشن ۲۲ × ۲۹/۸ تقطیع پر شائع کیا اور اس کا نام "غرائب القرآن" رکھا۔ یہ ترجمہ اُن لوگوں کے لئے چھاپا گیا جو صرفی نحوی لحاظ سے قرآنِ کریم کا مطالعہ کرنا چاہیں۔ اس ترجمہ میں الفاظ کی لغوی تحقیق بہت قابلیت اور لیاقت کے ساتھ کی گئی ہے۔ جو ایسے اصحاب کے لئے نہایت درجہ مفید ہے جو لفظوں کی تحقیق اور اُن کے لغوی اور صرفی و نحوی معنوں کی چھان بین میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بھی قرآن کریم کی ایک رنگ میں بہت اچھی خدمت تھی۔ ایک ایک لفظ کی تحقیق کے لئے مختلف کتب لغت کو دیکھنا اور اس کے متعلق چھان بین کرنی آسان کام نہ تھا۔ اور بہت عرصہ دراز کی محنت کو چاہتا تھا۔ اس کام میں محنت سے بھی زیادہ علمیت اور لیاقت کی ضرورت تھی۔ مگر خدا تعالےٰ جزائے خیر دے ایک صاحب مولوی محمد رحیم بخش کو جنہوں نے سالہا سال کی تلاش و تحقیق کے بعد اسے مرتب کیا اور مولوی نذیر احمدؒ کے سامنے پیش کر دیا۔ مولوی نذیر احمد کا کام اس سلسلہ میں صرف اتنا ہے کہ اُنہوں نے تنقیدی نظر سے اس مسوّدہ کو دیکھ لیا اور لاگت لگا کر اُسے شائع کر دیا۔ اصل تصنیف میں اُن کا کوئی حصّہ نہیں۔ اس قرآن مجید کے صفحات ۱۱۱۲ ہیں۔ اور ترتیب اس طرح ہے کہ شروع کے ۴۴ صفحات پر تو قرآن کریم کے مضامین کی مفصل فہرست ہے۔ دو صفحوں پر "پیغمبر صاحب اور قرآن مجید کے متعلق چند مفید باتیں" ہیں۔ صفحہ ۴۷ سے اصل قرآن مجید شروع ہوتا ہے۔ ایک صفحہ پر متن اور بالمقابل صفحہ پر ترجمہ ہے۔ متن کے حاشیہ پر الفاظ کی لغوی بحث ہے اور ترجمہ کے حاشیہ پر تفسیری نوٹ ہیں۔ کتاب نہایت خوشخط اور نفیس کتابت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کاتب منشی محمد قاسم ابن مولوی الہ دین صاحب لودھیانوی ہیں۔ اور کتاب دہلی کے مشہور پریس مطبع قاسمی میں چھپی ہے۔ تعداد اشاعت ۲۴۰۰ ہے۔

نمونۃً ہم یہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورہ فاتحہ کے الفاظ کی تحقیق کو نقل کرتے ہیں۔ جس سے غرائب القرآن کی اہمیت اور افادیت کا ناظرین کرام کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ بِسْمِ اصل میں تھا بِاسْمِ ۔ الف وصل کو تخفیفاً حذف کر کے بے کو طویل کر دیا تاکہ بے کا طول الفِ محذوف پر دلالت کرے۔ اِسم مشتق ہے سُمُوٌّ سے۔ بولا کرتے ہیں سَمَا یَسْمُوْ اذا علا و ظہر چونکہ اسم معنی پر عالی اور مقدم ہوتا ہے اس سے اُسے اسم کہتے ہیں اور ممکن ہے کہ سِمَۃٌ بمعنی علامت سے ماخوذ ہو۔ بولا کرتے ہیں وسم یسم سِمَہ ۔ چونکہ اسم اپنے مسمّٰے کی گویا علامت ہوتا ہے اس سے اُسے اسم کہتے ہیں پہلی تقدیر پر اسم کی تصغیر ہوگی سُمَیّ اور جمع اسماء اور اسامی اور دوسری تقدیر پر تصغیر وُسَیم اور جمع اَوْسام ۔ پھر بسم کی بے ایک مضمر کے متعلق ہوگی۔ عام ہے کہ وہ اسم ہو یا فعل۔ اسم ہوگا تو تقدیر عبارت یوں ہوگی ابتداء الکلام باسم اللہ اور فعل ہوگا تو یوں ابداء باسم اللہ۔ اللہ اصل میں تھا اَلْاِلٰہ ۔ دوسرا ہمزہ خلافِ قیاس حذف کر کے ایک لام کو دوسرے میں ادغام کر دیا گیا۔ الرحمٰن الرحیم دونوں مبالغے کے صیغے ہیں رحمت سے ماخوذ۔ اور رحمت کہتے ہیں رقت قلب کو۔

الحمد للہ رب العٰلمین ۔ حَمد مصدر ہے اور جب کوئی اچھا کام اپنے اختیار سے کرتا اور دوسرا اُس کی بزرگی کے ارادے سے اُس کی تعریف کرتا ہے تو اُسے حَمد کہتے ہیں۔ ربّ اصل میں مصدر ہے بمعنی تربیت۔ اور تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچانے کو۔ ربّ کا حمل اللہ پر مبالغۃً ہے۔ جس طرح زید عدل میں اور بعض کہتے ہیں ربّ صفت مشبہ ہے۔ عالمین جمع ہے عالَم کی۔ اور خدا کے سوا ہر موجود کو عالم کہتے ہیں۔ مٰلک یوم الدین دین کے معنی ہیں بدلے کے۔ بُرا ہو یا بھلا۔ بولا کرتے ہیں۔ کما تدین تدان۔ یوم الدین سے مراد ہے قیامت کا دن۔ کیونکہ اُس دن ہر بُرائی بھلائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین ۔ ایّا ضمیر منفصل منصوب ہے۔

اور کافِ خطاب کے لئے۔ نَعْبد لیا گیا ہے عبادت سے۔ اور عبادت کہتے ہیں انتہا درجے کے تذلّل و خضوع کو۔ اسی سے ہے طریق معبد ای مُذلّل و (غرائب القرآن صفحہ ۲)

(۳) ادعیۃ القرآن

یہ ایک بہت ہی مفید کتاب ہے جو قرآن مجید سے لے کر مولوی نذیر احمدؒ نے ترتیب دی۔ غالباً اس سے پہلے ایسی کتاب مرتب کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے قریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں چار باب مطالب کی تشریح میں لکھے ہیں اور اپنے ہر ایک دعوے کو قرآن کریم کی آیات سے ثابت کیا ہے۔

باب اوّل میں یہ بحث ہے کہ دعا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اور جب کبھی آدمی پر کوئی مصیبت یا بلا آتی ہے تو بے اختیار اُس کے ہاتھ اس مصیبت کو ٹالنے کے لئے رب العالمین کے حضور میں اُٹھ جاتے ہیں اگر زبان یا ہاتھ سے بھی انسان خدا کی درگاہ میں ازالۂ مصیبت کی التجا نہ کرے تاہم اُس کا دل مجسم دعا بن جاتا ہے۔

باب دوم میں اس امر کی تاکید ہے کہ دعا اور التجا صرف اُس احکم الحاکمین اور قادرِ مطلق خدا سے کرنی چاہیئے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ اور تمام شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ جس کے ہاتھ میں تمام طاقت اور تمام قوت ہے۔ پیر اور پیغمبر۔ ولی اور شہید۔ غوث اور قطب خود دعا کے محتاج ہیں اُن سے دعا کی خواستگاری لاحاصل اور بے فائدہ ہے۔ اور قبروں اور مزاروں سے لپٹ کر دعائیں مانگنی تو اتنی بڑی بیہودگی ہے جس کی انتہا نہیں۔

باب سوم اس امر پر مشتمل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اُس کی قبولیت کا وعدہ فرماتا ہے پھر ہم اُس کے حضور میں اپنے تمام خشوع و خضوع کے ساتھ کیوں نہ حاضر ہوں اور کیوں نہ اُس کو اپنی دعاؤں اور اپنی التجاؤں کا مرکز بنائیں ؟

باب چہارم میں مولوی صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی درگاہ میں دعا کی قبولیت کی کیا شرائط ہیں ؟ اور کون کونسی باتیں ایسی ہیں جن کو صحیح طور سے بجا لانے کے بعد عاجز اور ناتوان بندے کو اُس احکم الحاکمین قادرِ مطلق خدا کے حضور میں اپنی دعا اور التجا کے قبول اور باریاب ہونے کی توقع پیدا ہو سکتی ہے۔ جب ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کے حاصل کرنے کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ کی ضرورت ہوتی ہے تو دعا جیسی عظیم الشان شے کے لئے تو بدرجہ اولیٰ شرائط اور اسباب کی ضرورت ہے۔ جن کو پورا کرنے پر ہی دعا قبول ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد وہ تمام دعائیں جو قرآن کریم میں پیغمبروں اور نیک لوگوں کی زبانی منقول ہوئی ہیں سب کی سب ایک عمدہ ترتیب کے ساتھ مع ترجمہ اور حوالہ درج کر دی گئی ہیں۔ ہر دعا کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اور اس میں بتا دیا گیا ہے کہ یہ دُعا کس نے کی ؟ اور کیوں مانگی تھی ؟

کتاب کی لکھائی۔ ترجمۃ القرآن کی طرح نہایت اعلیٰ اور دیدہ زیب ہے اور چھپائی نہایت عمدہ اور صاف۔ کاغذ بھی عمدہ لگایا گیا ہے۔

(۴) ہفت سُورہ (۵) دہ سُورہ

قرآن کریم کی بعض سورتوں کو علٰحدہ کتابی شکل میں شائع کرنے کا مسلمانوں میں بہت رواج ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے بیشمار پنجسورے دیکھے ہوں گے جو مختلف لوگوں نے مختلف شہروں سے شائع کئے ہیں۔ مولانا نے اس میں یہ جدّت کی کہ پہلے ہفت سورہ اور پھر دہ سورہ شائع کیا۔ دہ سورہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

" معلوم نہیں پنجسوروں کا رواج کیوں ؟ کس سے ؟ اور کب چلا ؟ مگر بہت پُرانے پنجسورے دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پنجسوروں کا رواج کم از کم سینکڑوں برس پہلے سے چلا آتا ہے۔ خیال دوڑانے سے اس کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ سارے قرآن کی تلاوت

دیر طلب کام ہے۔ کسی نے اتفاقیہ طور پر اپنی رائے سے سورۂ یٰسین۔ الرحمٰن۔ تبارک الذی۔ واقعہ اور مزمل پانچ سورتیں منتخب کر کے اُن کا ورد بنایا اور اپنے زعم میں سارے قرآن کی تلاوت سے سبکدوش ہو بیٹھا۔ قرآن فی نفسہٖ کچھ ایسی بڑی ضخیم کتاب نہیں اور نہ شارع کی طرف سے جلدی کی تاکید ہے۔ مگر لوگوں کی ہمتیں دین کے بارے میں ایسی پست ہو گئی ہیں کہ حافظوں کا تو مذکور نہیں۔ جو قرآن پڑھ سکتے ہیں اُن میں بھی جیسا چاہیئے تلاوت کا التزام نہیں۔ پنجسورے کے موجد نے انگلی میں لہو لگا کر شہیدوں میں ملنا چاہا لوگوں کو حیلہ ہاتھ آیا۔ پنجسورے پر چل پڑے۔ ہم تو سرے سے قرآن ہی کو قابلِ انتخاب نہیں سمجھتے۔ قرآن الحمد سے لے کر والناس تک سارے کا سارا انتخاب ہے۔ مگر لوگوں نے فرمائش کی۔ ہم نے اس خیال سے کہ خیر قرآن کا نام تو ہے۔ متداول پنجسورے میں سورۂ فتح اور سورۂ نبا دو سورتیں بڑھا کر اوّل ہفت سورہ چھپوایا۔ اب سورۂ اخلاص یعنی قل ہو اللہ اور معوذتین یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تین سورتیں اور زیادہ کر کے دہ سورہ بنا دیا۔ اس دہ سورہ کے ورد کا مضائقہ نہیں۔ مگر سارے قرآن کی تلاوت کا فرض تو اس سے ساقط ہونے کا نہیں۔"

(۶) الحقوق والفرائض

ترجمہ قرآن کے علاوہ جس قدر کتابیں مولوی نذیر احمد نے لکھیں۔ اُن سب میں الحقوق والفرائض کو خاص حیثیت حاصل ہے اور واقعی یہ بے نظیر کتاب جس محنت۔ جس قابلیت اور جس لیاقت کے ساتھ لکھی گئی ہے وہ بیحد قابلِ قدر اور لائق تعریف ہے۔ کوئی بھی نمونہ ایسی اعلیٰ پایہ کی کتاب کا اس سے قبل اردو میں موجود نہ تھا۔ اور جہاں تک معلوم ہے بعد میں بھی دینیات کے مضامین پر اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ بلاشبہ یہ اکیلی کتاب انسان پر عائد شدہ حقوق اور فرائض کے متعلق ایک بہترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اور مسلم مضمون نگاروں۔ ادیبوں۔ انشا پردازوں اور واعظوں کے لئے تو یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یعنی جس مضمون پر یا جس اسلامی آداب و اخلاق پر آپ کوئی مقالہ لکھنا چاہیں اُس کا بہترین مواد آپ کو اس کتاب میں مل جائے گا۔ جس اخلاق کی تعلیم آپ اپنے سامعین کو دینا چاہیں اُس کے متعلق قرآن و حدیث کے ارشادات مع تشریحات آپ کو کتاب سے دستیاب ہو جائیں گے۔

انسان پر تین قسم کے حقوق اور فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سب سے اول حقوق اُس پر اپنے خالق اور مالک کے ہیں۔ جس نے اُسے اشرف المخلوقات بنایا۔ اور عقل اور سمجھ عطا فرمائی۔

دوسرے حقوق انسان پر اپنے ابنائے جنس کے ہیں۔ اس میں اپنے پرائے۔ دوست دشمن۔ حاکم محکوم۔ زبردست زیردست۔ خادم مخدوم سب آ گئے۔

تیسری قسم کے حقوق وہ ہیں جو خود اپنے نفس کے انسان پر واجب ہیں۔

ان تینوں قسم کے حقوق یعنی حقوق اللہ۔ حقوق العباد اور حقوق النفس کو صحیح اور درست طور پر بجا لانے کے بعد انسان اشرف المخلوقات کے خطاب کا حقیقی مصداق بن سکتا ہے۔ اور اس بے نظیر کتاب میں انہی ہر سہ حقوق کی تفصیلات اور تشریحات ہیں۔ کتاب کی تین جلدیں ہیں۔

جلد اوّل حقوق اللہ پر مشتمل ہے۔ جس میں ۳۴۸ مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ جن کے موٹے موٹے عنوان یہ ہیں۔ ایمان باللہ۔ بالانبیاء۔ بالکتب بالملائکہ۔ بالیوم الآخر۔ بالقدر۔ توحید۔ شرک۔ تقویٰ۔ ایفائے عہد۔ تسلیم و رضا۔ توکل۔ استقامت۔ ذکر اللہ۔ شکر۔ دعا۔ توبہ۔ تضرع۔ صلوٰۃ نجاست۔ طہارت۔ مسائل زکوٰۃ۔ حج وغیرہ۔ کتاب کے صفحات ۲۲۶ ہیں۔

جلد دوم حقوق العباد۔ اس میں ۶۰۵ مضامین ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے۔ حقوق الانبیاء۔ حقوق علماء۔ حقوق متعلم۔ حقوق حکام۔ حقوق رعایا حقوق والدین۔ حقوق اولاد۔ حقوق زوجین۔ حقوق اعزہ۔ حقوق ہمسایہ۔ حقوق مہمان۔ حقوق میزبان۔ حقوق السائل۔ حقوق یتامیٰ۔ حقوق ملازمین۔ حقوق آقا۔ حقوق احباب۔ حقوق مخالفین۔ حقوق کفار۔ حقوق اہل معاملہ۔ حقوق میت وغیرہ۔ کتاب کے صفحات ۴۹۲ ہیں۔

جلد سوم۔ حقوق النفس۔ اس میں ۵۰۰ کے قریب مضامین کا بیان ہے۔ جس میں تمام اخلاق۔ حسنہ اور سیئہ پر بحث ہے۔ اس کے بعد کتاب الآداب ہے۔ جس میں دنیا بھر کے ہر قسم کے آداب کی تفصیل ہے۔ مثلاً آداب بیت الخلاء۔ آداب البول۔ آداب الغسل۔ آداب العلم۔ آداب التلاوۃ۔ آداب المساجد۔ آداب ملاقات۔ آداب المجالس۔ آداب النوم۔ آداب اکل و شرب۔ آداب اللباس۔ آداب اللسان۔ آداب السماع۔ آداب البیع۔ آداب النکاح۔ آداب الولیمہ۔ آداب المریض۔ آداب میت۔ آداب تکفین وغیرہ۔ کتاب کے صفحات ۲۸۲ ہیں۔

ہر ایک مضمون جو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ مختلف عنوانات اور متعدد تفصیلات پر مشتمل ہے۔ نمونۃً ہر حصہ میں سے ایک ایک مضمون کی توضیحات پیش کی جاتی ہیں جس سے کتاب کی جامعیت کا تھوڑا سا اندازہ ناظرین لگا سکتے ہیں:۔

۱۔ خدا تعالیٰ کے حضور میں زبان سے جو اعمال انسان کو بجا لانے چاہئیں اُن کی تفصیل یہ دی گئی ہے۔ خدا کی عظمت۔ حمد و ثنا۔ تسبیح و تقدیس۔ ذکر اللہ۔ ذکر نعمت۔ شکر۔ دعا۔ توبہ و استغفار۔ استعاذہ۔ استعانت۔ خشوع و خضوع۔ تضرع و عجز۔

۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی ذیل میں حسب ذیل باتوں کی تفصیل ہے۔ اطاعت و تسلیم۔ ادب و احترام۔ اتباع سنت۔ احترام ازواج مطہرات۔ ممانعت ایذا دہی۔ ممانعت استہزاء۔ زیارت روضہ مطہرہ۔ ادب میں افراط و تفریط کی ممانعت۔ حضور علیہ السلام کی طرف جھوٹ کو نسبت دینے کی ممانعت۔ حمایت و نصرت۔ درود و سلام۔

۳۔ فضائل قوت غضبیہ کی ذیل میں مندرجہ ذیل مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ شجاعت۔ استقلال۔ علوئے ہمتی۔ آہستگی کظم غیظ۔ صبر۔ تحمل۔ صدق عفو۔ رفق۔ تواضع۔ عجز۔ حفظ اللسان۔ کم گوئی۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ ہر ایک خُلق اور ہر بات کے متعلق پہلے جس قدر آیات قرآنی ہیں سب مع ترجمہ و حوالہ درج کی گئی ہیں۔ اس کے بعد اس مضمون کی جو احادیث ہیں وہ سب ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں اور اُن کا ترجمہ بھی ساتھ دے دیا گیا ہے۔ حوالہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی بات تشریح طلب رہ گئی ہے تو اس کا ذکر حاشیہ میں کر دیا ہے۔ پھر ہر باب کے آخر میں "من المترجم" لکھ کر اُس باب سے متعلق مضمون کو زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب اور تدوین میں بھی مولوی حافظ محمد رحیم بخش صاحب مولانا کے دست راست رہے۔ بلکہ صحیح طور پر یوں کہنا چاہیئے کہ قریباً سارا کام اُنہی نے کیا۔ کیونکہ ہر مضمون کی آیتیں قرآن شریف سے نکالنا اور ہر بات کے متعلق احادیث کی تلاش یہ دونوں کام کامل طور پر مولوی محمد رحیم بخش نے انجام دیے۔ باقی ہر مضمون کے آخر میں "من المترجم" کے عنوان سے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک نوٹ لکھ دیا اور بس۔ اس سے ظاہر ہے کہ اصل کام مولوی محمد رحیم بخش صاحب ہی کا تھا جس کو اُنہوں نے بڑی خوبی اور نہایت محنت سے انجام دیا۔ کتاب کے آخر میں مولوی نذیر احمد صاحب نے صاف طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

(باقی)

محمد رضا انصاری

یادِ مجاز

مجاز کی آخری بار زیارت اس کے مرنے سے تقریباً ۲۵ گھنٹے قبل اور بیہوش ہونے سے چند گھنٹے پہلے اس طرح ہوئی کہ میں بس سے اُتر کر تیزی کے ساتھ اپنے دفتر جا رہا تھا۔ رات کے پونے نو بجے تھے مجاز اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سنٹرل ہوٹل (امین آباد) کے نیچے سڑک پر کھڑا حسبِ معمول خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اس کا رُخ ہوٹل کی عمارت کی طرف اور اس کے ساتھیوں کا منہ سڑک کی طرف تھا۔ بس سے اُتر کر میں سڑک پر آیا تو اس پر اور اس کے ساتھیوں پر نظر پڑی اور میں نے اس سے نظر بچا کر گذر جانے کی کامیاب کوشش کی۔ اے کاش! ذرا بھی اندازہ ہو جاتا کہ یہ آخری بار اس کو چھپتا دیکھ رہا ہوں، چاہے جتنی دیر ہو جاتی اس سے ضرور ملتا اور ہمت ساتھ دیتی تو خدا حافظ بھی کہتا۔

اس کے کسی بھی ملنے والے کو یہ اندازہ کاہے کو ہو سکتا تھا ــــ اگرچہ خود مجاز کو جیسے ہو چکا تھا، جبھی تو اس نے مرنے سے دو دن پہلے اپنے قدیم یاروں سے جو ایک کانفرنس کے سلسلے میں بمبئی سے آئے تھے رواداری میں کہا تھا "اب تو ہر ملاقات ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آخری ہی ملاقات ہے" سب اس کے جاننے والے جانتے تھے کہ مجاز مرنے جینے کی باتیں کرنے کا عادی کبھی نہیں رہا۔ شاعری میں ضرور اس نے صراحتاً بھی موت کا ذکر کیا ہے اور اشارتاً بھی ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے　　سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دُور آسمانوں سے　　موت آواز دے رہی ہے مجھے

یا ؎

اس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں　　سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے
یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی　　محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

مگر یہ تو تمام شعرا کہا کرتے ہیں! اور اگر آج مجاز ہمارے درمیان ہوتا تو اس کے یہ اشعار بھی وہ ٹیس نہ پیدا کر سکتے جو اس کے گذر جانے کے بعد پیدا ہو

جانے کا نام نہیں بھتی ہے۔ مرنا جینا روزمرہ کی ایسی حقیقت ہے کہ اس کو مدارِ گفتگو بنانا صرف ان ہی لوگوں کو زیب دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے فلسفیانہ دماغ لے کر آتے ہیں۔ مجاز اس دماغ سے کوسوں دور ہی نہیں تھا بلکہ ہزاروں کوس دور بھاگتا تھا۔ اس کو نہ زندگی میں فلسفہ (اصطلاحی مفہوم میں)، دیکھنے کا کوئی شوق تھا اور نہ شاعری میں۔ بلکہ ایک بڑے شاعر کا تو اس نے یہ کہہ کر مذاق تک اُڑایا تھا ؎

کبھی شاعر تھا اور بے مثل شاعر
مگر اب فلسفی ہی فلسفی ہے

سورج کی روشنی میں اس پر فلسفیوں کی سی کم سخنی ضرور طاری رہتی تھی مگر پیچیدہ فاضلانہ اور دور اندیشانہ طرزِ گفتگو کا اس سے کوئی یارانہ نہ تھا۔ اس کی خاموشی میں فکر سے زیادہ متانت کا عنصر کارفرما نظر آتا تھا۔ اہم سے اہم اور سنگین سے سنگین موقع پر آپ اس کو یا خاموش دیکھ سکتے تھے، یا حسبِ عادت فضا کے بوجھل پن کو اپنی گدگدانے والی باتوں سے کم کرنے والا، اور سورج ڈوبنے کے بعد ایک ہی فکر اس کا تعاقب کرتی رہتی تھی جس سے یکسوئی حاصل ہو جانے کے بعد زندگی اور موت دونوں کی قیمت اس کی نظر میں "یک جو خر" سے زیادہ نہیں رہتی تھی —— "آخری ملاقات" کا احساس پھر اس کا زبان سے اظہار! اگر مجاز بادہ خوار نہ ہوتا تو لوگ اسے ولی سمجھ کر اس کی کرامت قرار دیتے۔

میں نظر بچا کر دفتر پہنچ گیا اور مجاز "شہر کی رات میں ناشاد و ناکارہ" پھرنے کی عادت کی طرف لوٹ گیا ہوگا۔ بہرحال ۲۴ گھنٹے گزر گئے اور مجاز کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔

میرے عزیز اور مجاز کے کالج سے اب تک کے دوست فرحت اللہ صاحب نے کانفرنس ہال سے جہاں میں آخری نشست کی روئیداد قلمبند کر رہا تھا مجھے باہر بلوایا اور بتایا کہ مجاز کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ اس کی حالت خراب ہے اور وہ اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ میں نے کانفرنس میں موجود بعض دوستوں سے خبر کی توثیق چاہی اور ہم دونوں فوراً بلرام پور اسپتال پہنچے، وہاں دیکھا مجاز آخری سفر کی تیاریوں میں ہے۔ ڈاکٹروں نے ڈبل نمونیہ اور ہیمرج تشخیص کیا تھا، میں نے کوشش کی کہ ڈاکٹر کی تشخیص پر دھیان ہی نہ دوں۔ فرحت صاحب بولے "ایک ہی صورت مجاز کے بچنے کی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹروں کی تشخیص غلط ہو" مجھے یقین سا ہو گیا کہ ڈاکٹر کی تشخیص غلط ہی ہے۔ اسپتال کے انچارج کی اجازت سے شہر کے تجربہ کار معالج ڈاکٹر عبدالحمید کو بُلایا گیا مگر جب وہ پہنچے ہیں تو مجاز نے گنتی کی دو سانسیں لیں۔ ۵ دسمبر کو رات کے دس بج کر ۲۲ منٹ پر وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، احتشام حسین، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، نیاز حیدر سب کے سب دم بخود کھڑے رہ گئے۔ میں ایک طرف اپنے صحافتی فرائض کو دیکھ رہا تھا دوسری طرف اپنے ۱۹ سالہ تعلقات کی لاش کو جو اسپتال کے ایک پلنگ پر پڑی تھی۔ اسپتال سے دوسرے اخباروں کو فون کے ذریعہ اطلاع دینے کے ساتھ اپنے اخبار "قومی آواز" کو بھی فون کیا اور تفصیل بتا دی کہ شفٹ والے خبر بنا لیں گے، میں محسوس کر رہا تھا کہ میری رپورٹری کی زندگی میں ایسا لمحہ کبھی نہیں آیا جب جذبات کی شدت کسی واقعہ کی رپورٹ تک مجھے لکھنے نہ دے۔ سردار لاش کے پاس چپکے کھڑے تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سردار مجھ سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگے۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں دفتر پہنچا تو میرے ساتھی ہکا بکا بیٹھے تھے۔ ان سے حادثے کے سلسلے میں ایک سطر بھی لکھی نہیں جا سکی۔ فرائض کا یہ جبر دیکھ کر میں بھی پھوٹ پڑا اور اپنے دوست کی "آخری خدمت" اس کے مرنے کی خبر مجھے ہی مرتب کرنی پڑی۔

جب میں خبر لکھ رہا تھا تو مجھے یاد آیا کہ ابھی بیس ہی دن پہلے مجاز مجھے پوچھتا ہوا سرِ شام دفتر آیا تھا۔ ۱۷ نومبر کی شام تھی۔ مجاز دفتر میں داخل ہوا اور نظر مل جانے کے بعد بھی تجاہلِ عارفانہ کے انداز میں اس نے پوچھا "کہاں ہیں بھائی رضا انصاری؟"

مجاز اس وقت بے پئے مسرور تھا، غیر معمولی طور پر خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ ایسی بشاشت اس کے چہرے پر کم از کم پانچ چھ سال سے میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ شام کے مشغلے کے لئے جا رہا تھا۔ کئی مہینے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔ مجاز نے کہا۔ (لہجہ شکایت کا قطعی نہیں تھا) "کہاں تو ہم دونوں دن میں آٹھ آٹھ گھنٹے ساتھ رہا کرتے تھے، کہاں اب آٹھ آٹھ مہینے ملاقات نہیں ہوتی ہے۔"

یہ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے جب ماہنامہ "نیا ادب" (لکھنؤ) کی ترتیب و اشاعت میں اس کے تین ارکان سید سبط حسن، علی سردار جعفری اور اسرار الحق مجاز کے ساتھ چوتھا رکن بھی بڑھ گیا تھا۔ سردار اسی زمانے میں جیل چلے گئے اور اس سے پہلے لکھنؤ یونیورسٹی میں طالب علمی اور یونین کی سیکرٹری شپ کے فرائض میں مصروف ہو گئے تھے۔ باقی تین کبھی کبھی اور ہم دو (مجاز اور میں) اکثر اکٹھا رہا کرتے تھے۔ "نیا ادب" کے لئے فنڈ جمع کرنے میں، جس کے بغیر کسی بھی مہینے میں اس کی طباعت ممکن نہیں ہوتی تھی، سلسلے مضامین لکھنے اور حاصل کرنے میں نیز انگریزی اخبار نیشنل ہیرلڈ میں اپنی اپنی ڈیوٹی دینے میں مصروف رہتے تھے۔

بہر حال میں نے معذرت کی "بھئی ہم دونوں اتنی دور دور رہتے ہیں کہ ارادہ کر کے تمہارے یہاں جائیں بھی تو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جناب حسبِ معمول غائب نہ ہوں۔"

اس نے کہا "اگر لکھنؤ میں ہوں تو دوپہر تک ہم گھر سے کہیں نہیں جاتے۔"

میں نے صلاح دی کہ "جب کبھی باہر جانے لگو تو ایک پوسٹ کارڈ ہمیں ڈال دیا کرو۔ اکثر لوگ تمہیں پوچھتے ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تم آج کل کہاں ہو۔ ہم تمہاری آمد و رفت اخبار میں دے دیا کریں گے۔"

مجاز نے خاص منہ بنا کر کہا "ابھی اتنے بڑے آدمی ہم نہیں ہوئے ہیں۔" پھر بھی اس نے وعدہ کر لیا کہ جب سفر کو جانے لگے گا تو مجھے اطلاع ضرور دے گا۔

اس وعدے کے بیس دن کے بعد ہی وہ بڑے لمبے سفر پر چلا گیا اور اس طرح کہ کسی کو بھی اس کے گھر والوں تک کو اس کی تیاریوں کی اطلاع نہ مل سکی۔ اگر ہسپتال میں ایک جاننے والے کی نظر اس پر نہ پڑتی جس نے اس کے ایک عزیز کو فون کے ذریعہ اطلاع کر دی، تو یقیناً مجاز کے مرنے کا بھی پتہ دو ایک روز بعد ہی چلتا۔

دس سال سے ہمارے اس شہر میں سوسائٹی کا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجاز کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے جنازے میں ایک ہزار کے قریب منتخب شہری، ادیب، اساتذہ، طلبا اور سماجی کارکن شریک تھے۔ حالانکہ اسی شہر میں پانچ سال قبل رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی نے بھی وفات پائی تھی، ان کا جنازہ ایک غریب الوطن کا جنازہ معلوم ہوتا تھا۔ خیر یہ وہ صوبائی مجلس قانون ساز کے ممبر بھی تھے جس کے سلسلے میں وہ سال میں کم از کم پانچ مہینے لکھنؤ ہی میں رہتے تھے اور لکھنؤ ان کے دوستوں اور عزیزوں کی طرح ماننے والوں کی کثرت کے اعتبار سے ان کا وطن ہی تھا اور اس سے پہلے صفی لکھنوی کے جنازے کا نظارہ بھی جن آنکھوں نے دیکھا وہ کسی طرح یہ تسلیم نہیں کر سکتی تھیں کہ یہ اس شاعر کا جنازہ ہے جو کم و بیش اسّی سال تک ہر بڑی چھوٹی ادبی محفل میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا رہا ہے۔ مجاز کا گھر شہر کے ایک دور افتادہ حصے میں تھا اور مدفن اس سے زیادہ ویران جگہ بننے والا تھا۔ ڈاکٹر عبد العلیم نے قبرستان کی حالت دیکھ کر مجھ سے طنزاً کہا تھا "قبروں کی اس طرح درگت ہونے سے تو لاکھ درجے لاش کو جلانے کا طریقہ بہتر ہو گا۔"

ایسے ویران قبرستان تک مجاز کو پہنچانے اُردو، ہندی کے ادیب اور ہندو مسلمان سبھی اُمنڈ آئے تھے۔ نمازِ جنازہ، دعائے مغفرت کے لئے جنھوں نے پڑھی، پڑھی۔ شریک سب ہی ہو گئے تھے۔ اپنے رخصت ہونے والے دوست کو آخری خراجِ عقیدت پیش کرنے کے جذبے سے، اور جب

وہ سپردِ خاک کیا گیا تو زار زار رونے والوں میں اس کے اسّی سالہ بدقسمت باپ نہیں تھے۔ وہ تو ضبط و صبر کا پیکر بنے خاکِ گورستان پر بیٹھے تھے بلکہ وہ لوگ تھے جن میں سے اکثر کو مجازؔ سے اس قدر متعلق پہلی اور آخری بار دیکھا گیا۔

مدفن سے لوٹتے ہوئے سب ہی متاثر اور رنجیدہ تھے۔ بہتوں کی طرح میرے حافظے میں بھی ایک عمر کی یادیں اُبھر اُبھر کر ہیجان برپا کر رہی تھیں ——— مجازؔ سے پہلے اس کے چھوٹے بھائی انصار سے میری شناسائی ۱۹۳۶ء میں اس وقت ہوئی تھی جب چلنے والے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے خلاف صف آرا ہونے کے لئے علی گڑھ کے طالب علموں کے ساتھ لکھنؤ کے مسلمان طلبا اور خاص کر فرنگی محل اور ندوے کے عربی طالب علم اکٹھے ہوئے تھے۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش میں (جنوری ۱۹۳۷ء) ایک شاندار مشاعرہ ہوا جس میں پہلے پہل میں نے مجازؔ کو سُنا۔ "رات اور ریل" سنائی تھی۔ آواز کی گرفتگی کی وجہ سے پوری نہیں پڑھ سکا۔ مہمان شعراء ٹھہرائے گئے تھے فرنگی محل کے سامنے اور میرے مردانے مکان سے متصل ایک بڑے مکان میں۔ مجازؔ بھی انہی مہمانوں میں تھا۔ دوسرے مہمانوں کے چلے جانے کے بعد وہ دو ایک روز فرنگی محل میں فرحت اللہ انصاری کے یہاں ٹھہرا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ وہ انصار کا بھائی اور میرے عزیز حیات اللہ انصاری اور فرحت اللہ انصاری کا دوست اور کالج فیلو ہے۔ مجازؔ سے میری شناسائی ان واسطوں کی بدولت دوستی میں جلد ہی تبدیل ہوگئی مگر اس کو میرے نام کے سلسلے میں دلچسپ مغالطہ رہا۔ مخاطب کرنے میں تو صرف "رضا" کافی تھا۔ لکھنؤ سے جانے کے بعد میں نے خط لکھ کر اس سے وہ نظم مانگی جو اس نے حیات اللہ انصاری سے (جو اس وقت مارکسی زیادہ تھے) طویل تبادلۂ خیالات کے بعد لکھنؤ ہی میں کہنا شروع کر دی تھی یعنی "اندھیری رات کا مسافر" یہ جون یا جولائی ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ مجازؔ نے علی گڑھ سے ردولی شریف جاتے ہوئے پنجاب میل پر یہ نظم مکمل کی تھی اور ٹرین ہی پر سے مجھے جواب لکھا جس کے ساتھ "انقلاب" اور "اندھیری رات کا مسافر" نظمیں بھی اس نے بھیجی تھیں۔ اس سلسلے کی دو باتیں مجھے اب تک یاد ہیں، ایک تو اس نے پتے پر میرا نام "رضا انصاری صاحب" لکھا مگر نام کے اوپر کونے میں اس نے چھوٹا سا "اللہ" بھی لکھ دیا۔ جب ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے نام کی صحت کی طرف اسے متوجہ کیا۔ کہنے لگا: "حیات اللہ اور فرحت اللہ کا بھتیجا سمجھ کر میں نے خیال کیا کہ "اللہ" آپ کے نام کے ساتھ بھی لگا ہوگا مگر پورا یقین نہیں تھا اسی لئے تو بہت چھوٹا سا "اللہ" لکھ دیا تھا۔

دوسرا جملہ حیات اللہ انصاری نے "اندھیری رات کا مسافر" پڑھ کر کہا تھا: "دیکھو اس کے مصرعے "مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں" میں ریل کی رفتار اور کوچ کی کیفیت کس طرح نمایاں ہے جیسے عربی ادب میں ملتا ہے کہ عرب شاعروں کی بحریں اونٹ کی چال کے ردم پر مبنی ہیں۔"

اس نظم میں ایک مصرعہ تھا "خدا سویا ہوا ہے اہرمن محشر بداماں ہے"۔ فرنگی محل کے ہمارے بزرگوں نے اس مصرعے کا بُرا مانا اور جب میں نے یہ نظم پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے سُنائی جو اس وقت (۱۹۳۶ء میں) کانگرس کے صدر تھے اور فرنگی محل میں ہم لوگوں کی قائم کردہ "اسٹڈی سرکل" میں آئے تھے، تو بعد میں مجھے ڈانٹ بھی پڑی۔ کچھ دنوں کے بعد مجازؔ لکھنؤ آیا اور اس نے بتایا کہ ایک موقع پر پنڈت نہرو کے سامنے اس کو نظم پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا تو اس نے ایک پرانی نظم سُنا دی، یہ نئی نظم نہیں سُنائی۔ اس لئے کہ پنڈت جی اسے سُن چکے تھے، وہ سمجھتے کہ یہ دوسروں کی نظم سُنا رہا ہے۔ ہم دونوں اس "احتیاط" پر کافی مسرور ہوئے۔ واقعہ یہ تھا کہ حیات اللہ انصاری نے جو سرکل کے انچارج تھے، پنڈت جی سے کہہ دیا تھا کہ مجازؔ کی نظم اب پڑھی جائے گی۔ مگر مجازؔ کو خوش طبعی اور ظرافت کے لئے مواد درکار رہتا تھا وہ ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی ہنسنے ہنسانے کا پہلو بہرحال پیدا کر لیتا۔

مثلاً دسمبر ۱۹۴۳ء میں میں دلّی گیا ہوا تھا۔ مجازؔ وہیں تھا۔ اسے اپنی بہن (صفیہ مرحومہ) کے عقد کے سلسلے میں لکھنؤ جانا پڑا۔ جذبی اور میں اسے دلّی اسٹیشن پر سوار کرنے گئے۔ اس زمانے میں ریل پر جگہ ملنا، پھر تیسرے درجے میں یعنی "جوانِ مرداں" کی کوشش کے باوجود آسان

نہ تھا، خوش قسمتی سے قلی نے بہ مشکل آسان کر دی، مختصر سامان کے بارہ آنے لئے اور ایک روپیہ دو کانسٹیبلوں کو دلایا جو ایک خالی ڈبے کے سامنے کھڑے تھے، اس طرح مجاز کو سپاہیوں کے ڈبے میں اوپر بچھونا بچھانے کی جگہ مل گئی۔ ہم دونوں گاڑی چھٹنے سے پہلے اسٹیشن سے چلے آئے۔ لکھنؤ آکر مجاز سے ملاقات ہوئی تو وہ دلی اسٹیشن کو یاد کر کے خوب لطف لے رہا تھا۔ یعنی اس کو رات بھر بیٹھے بیٹھے سفر کرنا پڑا۔ وہ سپاہی جو اپنا ڈبہ ظاہر کر رہے تھے ہر مسافر سے ایک روپیہ لے کر بڑی فراخ دلی سے جگہ تقسیم کر رہے تھے۔ گاڑی چھٹنے سے چند منٹ قبل وہ "اپنا ڈبہ" کھچا کھچ مسافروں کو سونپ کر آرام سے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ مجاز نے جب بھی اس حادثے کا ذکر کیا اس انداز میں کیا کہ خود بھی ہنسا دوسروں کو بھی ہنسایا۔

ظرافت کا لطیف احساس اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی ظرافت کا اپنے کو بھی شکار بناتا تھا۔ اس کی نظم "شہرنگار" ۴۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اسی سال لکھنؤ سے ایک ماہنامہ "منزل" کے نام سے میں نے نکالنا شروع کیا تھا اس میں یہ نظم شائع ہوئی۔ ہمارے دوست سبط حسن نے جو اس زمانے میں بمبئی میں تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے اردو اخبار "قومی جنگ" میں کام کرتے تھے "منزل" پر ایک تبصرہ لکھ کر بھیجا جو نکتہ چینیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی زد میں مجاز کی نظم "شہرنگار" بھی آگئی تھی۔ یہ تبصرہ "منزل" ہی میں شائع ہوا۔ سبط حسن نے لکھا تھا: "مجاز کی نظم "شہرنگار" (رخصت اے ہم سفرو! شہرنگار آہی گیا) بڑی بھرپور نظم ہے۔ میں اسے اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔ لیکن پہلا شعر مجھے ہمیشہ کھٹکتا ہے۔ بھئی ہم سفروں کی یہ شان تو نہیں کہ دوستوں کو خدا حافظ کہہ دیا جائے اور راب تو راہ روز بروز کٹھن ہوتی جاتی ہے اور ضرورت ہے کہ تمام ہم سفر مل کر چلیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ انقلاب سے پہلے روس میں گورکی اور دوسرے ادیبوں نے مل کر ایک تحریک چلائی تھی اور اس کا بھی یہی نام تھا یعنی "ہم سفروں کی تحریک"۔"

مجاز نے تبصرہ پڑھا اور بولا: "بھئی سید صاحب (سبط حسن) کی یہ زیادتی ہے۔ یہاں "ہم سفر" اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا جو روس میں گورکی یا دوسرے ادیبوں نے لیا تھا، یہ تو ریل کے بھرے ہوئے ڈبے کے مسافر ہیں جن میں ما، واڑی بھی ہیں، میواتی بھی، بنئے بھی، کلرک بھی اور چنا جور گرم والے بھی۔ ان سب ہم سفروں کو لے کر "شہرنگار" میں جانے کا کیا تک ہے؟" ہنستے ہنستے ہم سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اس نے نہ نکتہ چینی پر غصہ کیا نہ ایک قریبی دوست کے اعتراض پر دل شکنی کا احساس ظاہر کیا۔ وہی شگفتہ خاطری اور وہی ہنسوڑپن۔ ہاں محفل مزاج کے مطابق نہ ہو تو سنجیدگی بلکہ "با ادب باملاحظہ" والی کیفیت اس کے جوتے سے لے کر منڈھی ہوئی ٹوپی تک سے ظاہر ہوا کرتی تھی۔

"شہرنگار" پر یاد آیا کہ مجاز نے یہ نظم مراد آباد کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ ۴۳ء میں اپریل کی آخری تاریخوں میں وہاں ایک ادبی اجتماع ہوا تھا جس کے منتظم ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) بھی اس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ اس موقع کی چند باتیں یاد آرہی ہیں۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ان ادبی تقریبوں میں جاتے تھے جہاں سے انجمن کی عمارت فنڈ کے لئے عطیہ دینے کا وعدہ کیا جائے۔ مراد آباد سے بھی وعدہ ہوا تھا۔ میں بھی مراد آباد گیا تھا اور مجاز کے ساتھ مولوی صاحب سے ملنے گیا وہ اور پنڈت دتا تریہ کیفی ایک مقامی وکیل کے مکان میں ٹھہرائے گئے تھے، ہم دونوں ملنے پہنچے تو دیکھا آمنے سامنے آرام کرسیوں پر مولوی صاحب اور پنڈت جی بیزار سے بیٹھے حقے پی رہے ہیں۔ بیزاری یوں تھی کہ منتظمین ان دونوں مہمانوں کو ٹھہرا کر بے خبر ہو گئے تھے نہ چائے کا پتہ نہ کھانے کا۔ مولوی صاحب نے باتوں باتوں میں ایک مزے دار فقرہ کہا۔ وہ بتا رہے تھے کہ صبح سے ہم دونوں بیٹھے ہیں، کسی منتظم کی صورت تک نہیں دکھائی دی۔ اس گھر میں ڈیوڑھی کے پاس بھینسیں بھی بندھی تھیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے: "بھینسوں والا تک اپنی بھینسیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہے۔" مجاز نے اس پر لطف فقرے سے اتنا مزا لیا کہ جب کبھی مراد آباد کا ذکر آتا وہ بھینسیں چھوڑ کر

بھاگ جانے کا ضرور ذکر کرتا۔

ڈپٹی کلکٹر صاحب کے عمارت فنڈ میں عطیہ دینے کا ذکر آیا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ ان صاحب نے "نیا ادب" کو بھی مجاز کی دوستی میں عطیہ دیا تھا بصورتِ چیک جو بنک سے کیش ہی نہیں ہو سکا۔ مولوی صاحب نے کہا "اچھا یہ بھی بات ہے!" مجاز کے چہرے کی شگفتگی ایک دم غائب ہو گئی۔ اس کی فطری شرافت کو یہ "غیبت" پسند نہیں آئی۔ باہر نکل کر اس نے کہا بھی کہ تم کو یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ وہ کسی کی غیبت نہیں کر سکتا تھا جب تک کوئی لطیف پہلو اس میں ایسا نہ ہو کہ غیبت یا برائی کا پہلو اس میں دب جائے میں بات کہہ چکا تھا مگر بھینس والے جملے کی یاد نے مجاز کے تکدر کو دور کر دیا اور ہم دونوں اس سے لطف لینے لگے۔

خیر، مجاز ۱۹۳۷ء کے بعد ایک سال اِدھر اُدھر رہا پھر اپنے والدین کے ساتھ لکھنؤ میں آکر مقیم ہو گیا۔ اب ہم لوگوں کو ایک ادبی تحریک "انجمن ترقی پسند مصنفین" نے ایک دائرے میں لے کر قریب تر کر دیا تھا۔ سبط حسن بھی حیدر آباد چھوڑ کر آ گئے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی صوبائی شاخ کے آرگنائزر بن کر علی سردار جعفری نے علی گڑھ اور دہلی کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا حیات اللہ انصاری قوم پرور اور ہفتہ وار "ہندوستان" لکھنؤ سے نکال رہے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جذبی بھی ایک عارضی ملازمت کی وجہ سے لکھنؤ آ گئے تھے (وہ تو فرنگی محل ہی میں مقیم تھے) سجاد ظہیر الہ آباد چھوڑ کر قریب قریب لکھنؤ میں رہ پڑے تھے پروفیسر احمد علی ڈاکٹر عبد العلیم اور سید احتشام حسین تو لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازم ہی تھے مجاز ان سب کا محبوب شاعر اور عزیز دوست تھا۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں سبطے، سردار اور مجاز نے مل کر نیا ادب لکھنؤ سے نکالا۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی (مرحوم پاکستان) بھی لکھنؤ آ بسے اور ان کا ماہنامہ "کلیم" (دہلی) نیا ادب میں مدغم ہو گیا۔ ترقی پسند مصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے "نیا ادب اور کلیم" کا مرتبہ جس قدر بلند تھا اسی قدر انتظامی حالت اس کی ابتر تھی اس پہلو کے استحکام کے لئے چاروں سواروں (جوش، سبطے، مجاز اور سردار) میں میں بھی شامل کیا گیا، اب ایک دوسرے قریب ترین دائرے نے ہم لوگوں کو ایک کر دیا۔ دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور ترقی پسند ادیبوں کی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ سجاد ظہیر، علیم صاحب، سردار جعفری اور علی جواد زیدی (جو اس وقت ترقی پسند تحریک سے دلچسپی رکھتے تھے اور آج کل نظامت اطلاعات یو۔ پی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں) گرفتار ہو گئے، جذبی نوکری چھوڑ کر علی گڑھ ایم۔ اے کرنے کے خیال سے چلے گئے۔ سارا شیرازہ بکھر گیا۔ مجاز نہ اس وقت گرفتار ہوا اور نہ جنگ کے "قومی جنگ" بن جانے کے بعد ملازم ہی ہوا۔ ہاں اس کے دماغ پر اثر اسی زمانے میں ہو گیا تھا۔ یہ کیفیت ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں اس کی رہی مگر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ دماغی خلل کے زمانے میں بھی اس کی گفتگو کی نوعیت ایسی رہتی کہ عام آدمی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ توازن کی کمی ہے یا ظرافت کی زیادتی۔

پہلی بار صحت یاب ہونے کے بعد وہ کچھ دنوں دلّی میں رہا پھر لکھنؤ آ گیا۔ ۱۹۴۳ء میں دلّی میں اسے ملازمت مل گئی۔ اب خط و کتابت ہونے لگی اور آنے جانے پر ملاقاتیں بھی۔ ۱۹۴۲ء کے شروع میں سردار جعفری جو ایک سال کی قید بھگت کر رہا ہو چکے تھے مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے بلاوے پر بمبئی چلے گئے۔ سجاد ظہیر بھی رہائی کے بعد مع اہل و عیال بمبئی میں مقیم ہو گئے اور سبط حسن بھی کچھ دنوں کے بعد بمبئی باسی ہو گئے لشتم پشتم "نیا ادب" لکھنؤ سے نکلا۔ بالآخر اس کو بھی بمبئی بھیج دینا پڑا۔

اب مجاز رہ گیا تھا تو اسے دلّی کی کشش کھینچ لے گئی۔ فروری ۱۹۴۳ء میں دہلی سے اس نے ایک خط میں لکھا:

"بھیا رضا، شرمندہ ہوں کیا کروں حالات ہی ایسے تھے۔ دو غزلیں لکھ چکا ہوں، ایک نظم لکھ چکا ہوں۔ ایک نظم کل شروع کی ہے جس کا ریکارڈ بی۔ بی۔ سی لندن سے براڈکاسٹ ہوگا۔ اب لندن تک مشاعرہ پہنچا دیا گیا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں تم میری ہر خطا معاف کر دو گے مجھے یقین ہے۔ جوش کا کوئی خط نہیں ملا،

لکھنؤ میں اب کیا رہ گیا ہے سوائے تمہارے اور . . . . مجھے ابھی رہنا ہے۔ گھر لکھ دیا ہے، یہاں ایک اسکیم ہے مطلع کروں گا اور حالات الحمدللہ۔"

اپریل ۴۳ء میں دہلی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس تھا، میں لکھنؤ سے سجاد ظہیر بمبئی سے، عبداللہ ملک لاہور سے رپورٹروں کی حیثیت سے وہاں اکٹھے ہوئے۔ مجاز اس وقت دہلی میں تھا مگر بے روزگار، اجلاس کے بعد میں مراد آباد کے ادبی اجتماع میں شریک ہونے پہنچ گیا وہاں مجاز بھی آیا۔ الگ الگ ٹھہرنے کی وجہ سے ایک ہی آدھ بار وہاں ملاقات ہوئی ن۔م راشد کے کمرے میں جو دہلی ریڈیو کی طرف سے مشاعرہ پیلے کرنے کے انتظام میں آئے تھے۔ میں وہاں سے لکھنؤ آ گیا۔

مجاز کا ۸ مئی ۴۳ء کا خط مجھے لکھنؤ میں ملا وہ دہلی میں ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا:

"بھیا رضا انم بھی عجیب چیز ہو۔ مراد آباد اسٹیشن پر ہم سے رخصت ہونے بھی نہ آ سکے۔ حالانکہ ہم تم سے قریب ہی خرابات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تمہارا آنا آسان اور میرا اٹھنا دشوار تھا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا "حسابِ دوستاں در دل" رکھو۔

اب صورت یہ ہے کہ وہی ہوا جس کا میری طرف سے اندیشہ تھا یعنی پھر نوکری کر لی مگر اس سے قبل بنّے (سجاد ظہیر) وغیرہ سے مشورہ کر لیا تھا لہٰذا ضمیر اور دل دونوں مطمئن ہیں۔ معاملہ سرکاری نہیں ہے اس لئے کوسنا نہیں، کوسنے کی اور کوئی وجہ ہو تو دریغ بھی نہ کرنا۔

اب صورت یہ ہے کہ ۱۵ سے کام شروع کر رہا ہوں اسی شرط پر کہ بمبئی کی کانفرنس (ترقی پسند مصنفین کی تیسری سالانہ کانفرنس جو مئی ۴۳ء میں ہوئی) کے لئے چار پانچ دن کی چھٹی مل جائے گی۔ اس عرصے میں یہ کر رہا ہوں کہ کل ۹ کو ایک دن کے لئے امرت سر کے ترقی پسندوں کے مشاعرے میں پھر ۱۰، ۱۱ کو لاہور میں اپنی وفا کا حتی الامکان ثبوت دیا جائے گا پھر بالکل اسی سلسلے میں ۱۳ کو دلّی واپسی ہو جائے گی اور ۱۵ کو ذمہ داریوں کی قبر میں دفن ہو جانے کا مصمم اور غالباً نیک ارادہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تم بمبئی کن تاریخوں میں جا رہے ہو، یہاں ۱۲ کو روانگی کا ارادہ ہے اختر بلائے پوری بھی شاید ساتھ ہو جائے۔ وعدہ تو کیا ہے اگر اسے چھٹی مل گئی تو، یہ امرت سر جا کر معلوم ہوگا۔ شاید یہاں سے کچھ اور لوگ بھی چلیں جن کے چلنے کا کبھی کوئی اعتبار نہیں۔ میں بہرحال جاؤں گا۔ کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی۔

اگر تم لکھنؤ سے براہِ راست جاؤ تو لکھو اور اگر بغیر کسی دقت کے دلّی ہوتے ہوئے جا سکو تو اچھا ہو میرے نزدیک کوئی زیادہ فرق نہ ہوگا، سوچ لو۔ فیض کل آیا تھا وہ بمبئی نہ جا سکے گا۔ راشد کا البتہ خیال ہے مگر فی الحال وہ سیکنڈ کلاس کا کرایہ مانگ رہا ہے۔ یہ مشکل مسئلہ بہرحال جلد مطلع کرو اور اپنے فیصلے سے مطلع کرو۔ ساتھ چلنے تو "سفر" اور "رفیقانِ سفر" دونوں رہنے۔ دوسرا صفحہ سبط کو دے دینا اگر ہوں۔ جذبی کا آپریشن کامیاب رہا پرسوں رات کو گیا تھا۔ آج پھر جاؤں گا۔ ان کے والد سے بیماری نے سمجھوتہ کرا دیا ہے وہ بھی آ گئے ہیں۔ پندرہ روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ آج کل چہرے پر بڑی آب و تاب ہے "ہسپتال میں" تو راتیں "تلاش" کر لی ہیں مگر جرأتِ رندانہ نہیں ہے۔ تم کو دلّی بلانے میں ایک خودغرضی یہ ہے کہ لکھنؤ سے اپنی سائیکل منگانا چاہتا ہوں۔"

۱۹ مئی مجاز کا خط میرے جواب میں آیا:

"پیارے رضا! تمہارا خط ملا، جو میری عدم موجودگی میں یہاں آیا تھا میں ان دنوں لاہور چلا گیا تھا، ابھی آیا ہوں، نوکری کر لی ہے تفصیل سے ملاقات ہونے پر بتاؤں گا، جواب میں دیر ہونے کی بھی یہی وجہ ہوئی کہ ابھی آیا ہوں۔ اچھا تو حالات یہ ہیں کہ یہاں سے ایک شاندار قافلہ یعنی شوکت (ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری) مادام زہرہ، ایک آدھ کامریڈ اور ہم خود بھی ۲۱ مئی کی صبح کو جمعہ کے دن جی۔ آئی۔ پی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ جھانسی سے شام یا رات کو گزرے گی۔ تم بھی اس طور پر چلو کہ ہمیں جھانسی میں مل جاؤ وہی گاڑی تمہیں جھانسی سے بمبئی کے لئے ملے گی، وقت دریافت کر لینا۔ یہاں سے تو ۹ بجے صبح کو روانہ ہوتی ہے۔ ساتھ ہو جائے گا تو سفر اچھا ہی ہوگا تو گویا جھانسی میں مل رہے ہو۔ سیٹلے کو کیا کیا جائے اور کیا کہا جائے۔ ہم تو کام دن ہی کام کر کے چھٹی لے کر جا رہے ہیں لہٰذا سعادت مندی مسلّم۔ اچھا فی الحال خدا حافظ۔

تمہارا مجاز"

ہم لوگ (ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر رام بلاس شرما اور میں) لکھنؤ سے وقتِ مقررہ پر بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے مگر مجاز نہ جھانسی میں ملا اور نہ بمبئی میں۔ بمبئی اسٹیشن پر سجاد ظہیر آ گئے تھے وہ بھی ہم لوگوں سے مل کر مجاز اور اس کے شاندار قافلے کو دوسرے ڈبوں میں تلاش کرنے لگے مگر تلاش بے سود رہی ——— لطف یہ کہ مجاز کو "جن کے چلنے کا کبھی کوئی اعتبار نہیں" تھا وہ دوسرے دن بمبئی میں نظر آئے یعنی ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری اور ان کی بیگم۔

سنہ ۴۳ء اور سنہ ۴۴ء میں مجاز دلّی ہی میں رہا مگر ملازمت کی جکڑ بندیوں سے جلد ہی اس نے نجات حاصل کر لی۔ یہ ملازمت ہارڈنگ لائبریری (دہلی) کے لائبریرین کی حیثیت سے تھی اور ایک ماہنامہ "ادیب" (دہلی) کی ترتیب بھی اس سے متعلق تھی۔ یہ رسالہ مرحوم فصیح الدین احمد، ایس۔ ایم۔ آئی۔ واحدی اور مس نجمہ تصدق کی ادارت میں بڑے سائز پر نکلتا تھا، منزل (لکھنؤ) کی طرح یہ بھی ایک سال سے زیادہ نہ نکل سکا۔

مجاز نے جو یہ لکھا تھا "کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی" تو یقیناً اس کا عقیدہ ابدی تھا جس کو کوئی لالچ یا کوئی خوف بدل نہیں سکتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں غیر سنجیدہ رہنے والا مجاز عقیدے اور یقین میں اس قدر ایمان دار کیسے رہا ——— ترقی پسند مصنّفین کے نظریے پر اس کا عقیدہ تھا مگر اس کی فطری شاعری کسی نظریے کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ایک آدھ غزل یا نظم اس نے کہی اور کسی نے کہہ دیا کہ یہ "پارٹی لائن" سے الگ ہے تو ہمیشہ جواب دیا کرتا تھا کہ "تھوڑی سی پٹری سے اُتر گئی ہے"۔ بات یہ تھی کہ اس کا ذوقِ سلیم مسیحائی میں اس غیر فطری آمیزش کو فوراً گرفت میں لے لیتا تھا جو مصلحت یا مبالغے کے تحت اکثر صداقتوں کے ساتھ لگ جایا کرتی ہے۔ ایک دفعہ اس نے بعض ترقی پسند ادیبوں کی غیر مخلصانہ "غریب نوازی" پر بڑا اچھا جملہ کہا تھا۔ اس سے ترقی پسندوں کی کانفرنس میں تقریر کرنے پر اصرار کیا جا رہا تھا وہ اس وقت دوسرے عالم میں تھا بہرحال اس نے ایک ہی جملے میں تقریر کر دی۔ اس نے کہا "اب تک لوگ جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کا خواب دیکھتے تھے۔ اب ہم لوگ محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے خواب دیکھتے ہیں"۔ بڑی جچی تلی بات اس کے منہ سے نکلی تھی۔ خاص کر ان لوگوں کے لئے تھی جو طبقاتی شعور سے یکسر خالی ہونے کے باوجود "مزدور اور غریب" کی چھاپ لگا کر اپنے ادب کو چلتا سکّہ ثابت کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔

مجاز نے بھی مزدور اور کسان کے گیت گائے ہیں مگر پورے شعور اور احساس کے ساتھ اور سررشتۂ ادب کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

اس کی ایمانداری کی ایک مثال، ہزاروں مثالوں میں سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کانپور میں ایک ہی وقت میں دو مشاعرے ہوئے ایک کا اہتمام مل مالکوں کی طرف سے تھا، دوسرے کا ملوں کے مزدوروں کی طرف سے۔ مجازؔ نے دونوں میں شرکت کا وعدہ کر لیا لیکن پہلے وہ مزدور مشاعرے میں گیا جس کی نشست طویل ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرے مشاعرے سے بلاوے پر بلاوے آ رہے تھے۔ موٹریں دوڑ رہی تھیں بنا دِرا، بہترین کھانا اور سب سے زیادہ شراب کی پیش کش۔ یہاں چند دوستوں کے چندے سے تھوڑی بہت منگائی گئی تھی۔ اچانک مجازؔ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مل مالکوں کے مشاعرے میں نہیں جائے گا، پھر وہ نہیں گیا۔ اس کا فیصلہ ہونا اچانک تھا مگر وہ "راج ہٹ" کی طرح قائم رہتا تھا۔

دلی کے ایک مشاعرے میں اس نے جانے کا وعدہ کیا۔ بلانے والے نے میرے ساتھی مکین احسن کلیم (جو اب لاہور میں ہیں) اور حبیب الرحمٰن (قومی آواز) کو زادِ راہ بھیج کر متعین کیا کہ وہ مجازؔ کو لکھنؤ سے سوار کرا دیں۔ مجازؔ نے حتمی ارادہ کر لیا تھا۔ عین وقت پر اس کو معلوم ہوا کہ دلی میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام جوشؔ صاحب کے یہاں کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں وہ جوشؔ صاحب سے خوش نہیں تھا (ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد تو وہ سخت ناراض ہو گیا تھا، کہتا تھا کہ جوشؔ نے ہم سب کو ذلیل کر دیا) بہرحال اس نے دلی جانے ہی سے انکار کر دیا۔ لاکھ لاکھ دونوں نے کہا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

اس کی ایک غیر مطبوعہ غزل کا مطلع بھی جوشؔ اور فراقؔ سے اس کی ناخوشی کو ظاہر کرتا ہے ؎

فراقؔ ہوں میں نہ جوشؔ ہوں میں
مجازؔ ہوں سرفروش ہوں میں

اس کا سرفروشی کا دعویٰ محض سخن سازی نہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر یا عقیدے کے اظہار میں سرفروشی کی حدوں تک پہنچ بھی جاتا تھا۔ ملازمت کے علاوہ اس کا ذریعہ معاش اور ہو بھی کیا سکتا تھا مگر جب اس کے بعض ادیب دوستوں نے سرکاری ملازمتیں دورانِ جنگ میں حاصل کر لیں تو اس کو بڑی ناگواری ہوئی اور جب اس کے سامنے سرکاری ملازمت کا سوال آیا تو اس نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا۔ ریڈیو کے ایک مشاعرے میں اس نے کمال ہی کر دیا۔ جب اس کے پڑھنے کی باری آئی تو اس نے سرکاری ملازمت کر لینے والوں کی ہجو شروع کر دی ؎

شاعر ہوں اور امیں ہوں عروسِ سخن کا میں
کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

اس کی آواز ریڈیو والوں نے فوراً دبا دی، اس کے بعد اس پر آل انڈیا ریڈیو کے دروازے بند کر دئے گئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دہلی میں جب ریڈیو اسٹیشن کھلا ہے (١٩٣٥ء میں) تو پہلا ادیب مجازؔ ہی تھا جس نے پروگرام کا آغاز اپنی ایک غزل سے کیا تھا ؎

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

اسی پر ریڈیو کے دروازے بند کر دئے گئے۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ "کنٹرولر صاحب تمہارے قدردان اور پرانے دوست ہیں ان سے معذرت کر لو" حقیقت بھی یہی تھی کہ نشے کی ترنگ میں اس نے ہجو پڑھ دی تھی ورنہ وہ "ذاتیات" پر حملے کا قائل ہی نہیں تھا۔ جب اصرار حد سے بڑھا تو اس نے ایک نظم کہی جس کا مقطع تھا ؎

کرنل سہی میں خان بہادر سہی مجازؔ
اب دوستوں کی ضد ہے تو شاعر نہیں ہوں میں

وہ تو زمانہ بدیسی حکومت کا تھا، قومی حکومت کے زمانے میں ابھی کچھ مہینوں کی بات ہے کہ بعض قدردانوں کی کوشش سے مجازؔ کو دو سو روپئے مہینہ

مرکزی حکومت نے وظیفہ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ قدر دانوں نے وظیفے کا فارم بھر بھا کر مجاز کو دستخط کرنے کے لئے دیا۔ اس نے دوستوں کی دل شکنی کے خیال سے انکار نہیں کیا مگر دستخط بھی کر کے نہیں دیئے۔ مجاز اس کیریکٹر کا آدمی تھا۔ عجیب طرح کی غیرت اس میں تھی۔ تمام با اثر اور دولتمند اشخاص سے اس کے تعلقات تھے مگر کبھی اپنا دکھڑا کسی کے سامنے لے کر وہ نہیں بیٹھا۔ نہ چاپلوسی کی، نہ اپنے عقیدے کی بھینٹ چڑھائی اور نہ بعض ادیبوں کی طرح اترا کر یا اکڑ دکھا کر اس نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ اس کی شاعری کی طرح اس کی حرکات اور عادات بھی بے ساختہ تھے۔

'شراب و شاہد' اس کی دو کمزوریاں تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرح اپنی ان کمزوریوں کو ڈھانکنے چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکا، ساتھ ہی یہ بھی نہ تھا کہ جہاں بیٹھے وہاں فخریہ اپنے ان کارناموں کو بیان کرے' وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی خواہش ضرور رکھتا تھا۔ اگرچہ جانتا تھا کہ اس کی صاف و شفاف طبیعت ایسی پوشیدگی کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ اس نے شروع زمانے میں کہا تھا کہ ؎

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری میخواری ابھی تک راز ہے

لیکن یہ ایسا کھلا راز تھا کہ اس کے گھر والے بھی جلد ہی اس سے واقف ہو گئے تھے، پھر بھی اس سلسلے کے ایک واقعہ نے مجاز کو ایک دفعہ کافی برہم کر دیا۔ یہ واقعہ مجاز اور شوکت تھانوی دونوں نے الگ الگ مجھ سے بیان کیا۔ شوکت صاحب نے دل لگی میں اور مجاز نے تکلیف کے ساتھ۔ شوکت تھانوی نے مجاز کے والد سے ملاقات کے دوران میں مجاز کا اس طرح ذکر کیا جیسے دو بزرگ بیٹھ کر ہونہار لڑکوں کا ذکر کرتے ہیں انہوں نے مجاز کی سعادت مندی، صلاحیت اور خوش اخلاقی کی تعریف کی (شوکت صاحب سے اور مجاز کے والد سے مجاز کے واسطے کے بغیر تعلقات تھے) اور یہ بھی کہہ دیا کہ "شراب کی لت اس کے پیچھے بری لگ گئی ہے۔" شوکت صاحب نے محض دل لگی میں یہ کہہ دیا یقیناً ان کی نیت بری نہ ہو گی۔ مجاز کو شوکت صاحب کی زبان سے اور پھر اپنے گھر میں غالباً والدہ یا والد سے شوکت صاحب کی گفتگو کا علم ہوا اور اسے بہت تکلیف ہوئی۔ مجھ سے مجاز نے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے شوکت سے کہہ دیا کہ باپ اور بیٹے دونوں سے دوستی رکھنا خطرناک بات ہے آپ ایک ہی سے دوستی رکھئے۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت تمام عقیدوں اور نظریوں کے باوجود ماحول کو دکھی بنانے سے انکار کرتی تھی۔ خواہ وہ گھر کا ماحول ہو یا بیرونِ خانہ۔

بہر حال مجاز جو کچھ تھا تھا، ۱۹۴۴ء کے بعد اس سے ایک طرح کی دوری ہو گئی یعنی وہ دن میں آٹھ آٹھ گھنٹے والی ملاقات کا موقع نہیں رہا۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ دلی میں زیادہ رہا اور کچھ اس لئے کہ اس پر دوسرا دورہ دماغی بیماری کا پڑ گیا جو زیادہ سخت تھا۔ اس سے سنبھلنے کے بعد اسے ایک حادثہ اس کی محبوب بہن صفیہ اختر کے انتقال کا پیش آ گیا جس کے بعد جیسے اسے چپ لگ گئی۔ دیکھنے والوں کو اس پر ترس آتا تھا کہ ایسا باغ و بہار انسان کیسا بدل گیا۔ اِدھر میرا جان کا عذاب پیشہ اخباری رپورٹری دوستوں عزیزوں ہی نہیں گھر والوں تک سے مجھے دور رکھتا رہا اور مجھے مجاز کے آخری زمانے کے احساسات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

ڈاکٹر محمد حسن

گُلِ نغمہ

(مجاز کے متعلق میری ڈائری کے چند اقتباسات)

ہفتہ ۱۸ فروری ۱۹۵۶ء

مجاز بھائی!

معاف کیجئے گا آپ کی یہ امانت خصوصی عام کر رہا ہوں۔ آپ نے رانچی میں ایامِ جنوں میں جو غزلیں اور نظمیں کہی تھیں وہ بھی اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اب ان کی نوعیت ایک مقدس یادگار کی ہے اور اس یادگار کو پیش کر دینے میں میں کیوں بخل کروں۔

آپ نے اپنی تصویر مجھے عنایت کرتے ہوئے اس کی پشت پر جوش کا یہ شعر بھی لکھا تھا ؎

ہم آئینہ میں اپنے حال کی تغئیر دیکھیں گے
تمہارے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویر دیکھیں گے

آپ کی رخصت کے بعد میں نے کئی بار کوشش کی ہے کہ اپنے ہاتھ سے آپ کی کوئی تصویر کھینچ سکوں۔ ناکام رہا۔ آخر خود آپ ہی کے ہاتھوں کھینچی ہوئی آپ کی تصویریں جوں کی توں پیش کر دی۔ پتہ نہیں آپ میری ڈائری میں محفوظ کی ہوئی ان جھلکیوں کو دیکھتے تو کیا کہتے۔ کاش کہ آپ انہیں دیکھ لیتے۔

کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

محمد حسن

سنہ ۱۹۵۰ء

ہفتہ ۲۹ر جولائی

آج رات مجاز آ گئے بے پناہ چاندنی نکھری ہوئی تھی توبہ شکن چاندنی۔ بہت رات گئے تک باتیں کرتے رہے غزلیں سُنتے رہے، شعر و شاعری ہوتی رہی غرضکہ بڑی دلچسپ صحبت رہی۔ باتوں باتوں میں ایک نکتہ پر بارہا سوچا تھا مگر اس قطعیت کے ساتھ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ سوچا یہ حافظ، جوش اور مجاز کے ہاں نشاط کا تصور کیسا ہے۔ مجاز نے کہا اور بڑے پتے کی بات کہی کہ جوش کے نشاط میں عیاشی کی بُو آ جاتی ہے جبکہ حافظ کا نشاط درد آشنا ہے۔ اپنی نظم "آج" کے بارے میں بھی ایک اچھی بات کہی اور اس کی شعوری اور غیر شعوری ترتیب پر اچھی طرح روشنی ڈالی۔

اس نظم کا آخری شعر ہے ؎

حُسن سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے ان کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

میں نے کہا تھا کہ یہ شعر ساری نظم کی فضا سے علیحدہ ہے۔

مجاز نے جواب میں کہا کہ ہم آخر کے شعروں میں سے ہر شعر میں معشوق سے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے لب و رخسار کی بات "پھر" انگبیں پینے کی سرکش آرزو" سے لے کر "کلاہ فخرِ انسانی" تک بات پہنچتی ہے اور اس سے پہلے کہ نظم میں عیاشی اور لذتیت جگہ پائے شاعر پھر احترامِ لب و رخسار کی طرف رجعت کر جاتا ہے اور اس شعر سے فاصلہ قائم کر دیتا ہے ؎

حُسن سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے ان کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

دوشنبہ، ۱۴ر اگست

مجاز سے ملاقاتیں! کافی ہاؤس کی وہی پُرانی جانی پہچانی شام جس میں باتوں باتوں میں فراق کے شعر جگمگا اُٹھے ہیں ؎

فرشِ میخانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ   دیدنی ہے تری آہستہ روی اے ساقی
خاک میں چوٹ دبی تھی یہ نہ جانے کب کی   رگِ پیمانہ لہو دینے لگی اے ساقی

آج مجاز کی نئی غزل سُنی ہے جو کسی مشاعرے کے لئے طرح میں کہی ہے، بڑی انکساری اور معذرت کے ساتھ سُنائی ؎

بس اس تقصیر پہ اپنے مقدر میں ہے مر جانا   تبسم کو تبسم کیوں نظر کو کیوں نظر جانا
خرد والوں سے حُسن و عشق کی تنقید کیا ہوگی   نہ افسونِ نگہ سمجھا نہ اندازِ نظر جانا
مئے گلفام بھی ہے سازِ عشرت بھی ہے ساقی بھی   مگر مشکل ہے آشوبِ حقیقت سے گذر جانا

غمِ دوراں میں گذری جس قدر گذری جہاں گذری
اور اس پر لطف یہ ہے زندگی کو مختصر جانا

یہ لکھنؤ ہے۔ یہاں کی اُجڑی ہوئی صحبتوں کا یہ گداز، یہ لطافت اور شیرینی اور کہاں ملے گی یہ اُجڑی ہوئی بیوہ کا سہاگ ہے جس کے لاکھ لُٹ جانے پر بھی غضب کا نکھار ہے۔ سردی کی پچھلی راتوں کی چاندنی، ڈھلتی ہوئی دھوپ اور رنگِ نغمہ جو آپ اپنی شکست کی آواز ہے۔

۱۳ر اکتوبر ۵۰ء

کل رات شراب کی میز پر مجازؔ نے نشہ کے ہلکے ہوئے لہجے میں وہی بات کہی: "ہائے وہ تصور جو دامن نہیں چھوڑتا۔ ہائے وہ خیال جو دل کے گوشے سے نکلتا ہی نہیں اس کا کوئی کیا علاج کرے؟"

چہارشنبہ، ۱۰ر نومبر

آج اسرار الحق مجازؔ کی قیام گاہ پر غالب سوسائٹی کا جلسہ منعقد کیا گیا تھا سالہا سال کے بعد یہ ہماری پہلی پبلک سرگرمی تھی جلسہ بہت کامیاب رہا۔ بڑی خوش گوار اور دلکش فضا تھی۔ یہ ابتدا بہت ہی عمدہ رہی ہے ایک طرف تو ہمارا اجتماع بڑا ہی نمائندہ تھا اور آئندہ اس سے زیادہ نمائندہ ہونے کی امید ہے۔ آنند نرائن ملاؔ، آل احمد سرور، جی۔ پی جوہری، ڈاکٹر وحید مرزا سبھی موجود تھے۔ احتشام صاحب نے اپنا مقالہ "غالب کا تفکر" پڑھا دوسرے اس نے مجازؔ کو پھر سے ذرا سرگرم عمل کر دیا ہے۔

اتوار، ۱۵ر نومبر

مجازؔ پھر بیمار ہو گئے ہیں۔ آج کی شام انہی کے ساتھ گذاری گھر پر شام گذارنے کا یہ موقع مجازؔ کے لئے نیا ہی تھا۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے مجازؔ کا "نیا ادب" کا زمانہ پھر سے لوٹتا ہوا نظر آرہا ہے مجازؔ سے معلوم ہوا کل ڈاکٹر تاثیر کا انتقال ہو گیا۔ بہت دیر تک افسوس کرتے رہے۔ اچھا آدمی مر گیا۔ مجھے وہ شعر یاد آیا جسے ایک مدت تک اقبال کا سمجھتا رہا تھا ؎

زلفِ آوارہ، گریباں چاک، اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

اور مجازؔ نے ایک شعر سنایا ایک مصرعہ یاد رہ گیا۔

اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج

۱۹۵۱ء

بدھ ۲۶ر ستمبر

شام کو مجازؔ سے ملاقات ہوئی مجازؔ نے آٹھ اشعار کی ایک نظم گاندھی جینتی کے سلسلے میں ریڈیو کے لئے کہی ہے وہ واقعہ مجھے یاد ہے کافی ہاؤس میں عیاذ انصاری، میں، مجازؔ اور ایک کرتی اور صاحب بیٹھے تھے عیاذ نے کہا "گاندھی جینتی کے مشاعرے کے لئے وہ نئی نظم لکھ دو چار پانچ نئے شعر لکھ دو تو تمہیں لے لیں گے۔"

مجازؔ نے کہا: "پچاس روپے لیں گے۔"

عیاذ بولے "اچھا چلو، پچاس روپے ہی دیں گے فی شعر دس روپیہ مگر لکھ ضرور لینا۔"

میں نے عیاذ سے کہا کہ "بھئی ان سے شعر لکھوانے کی بہترین صورت وہی ہے جو بمبئی کے کچھ دوستوں نے نکالی ہے دو بوتل شراب کے ساتھ کمرے میں بند کر دو باہر نکالو گے تو غزل تیار ملے گی۔"

دوسرے صاحب بولے کہ "اس وقت تو فردوسی کا معاوضہ مل رہا ہے مجازؔ کو ہر شعر پر دس روپیہ۔"

مجاز نے برجستہ کہا "جناب! فردوسی نے تو محمود سے لیا تھا۔ ہم عیاذ سے وصول کر رہے ہیں۔"
آج وہ غزل مکمل ہوئی تو بڑی بے تابی سے سنائی اور کہا۔ مجھے آج یہ اشعار لکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی لکھ سکتے ہیں، صلاحیتیں مردہ نہیں ہوئی ہیں اور حقیقتاً مجاز کے اپنے رنگ کی جھلکیاں کچھ اشعار میں نمایاں ہیں۔

وہ کلیم عصر حاضر ....

آج آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے کی اپنی تصویر مجاز نے مجھے دی ہے اس کی پشت پر یہ عبارت لکھی ہے:

"محمد حسن کو جوش کے اس شعر کے ساتھ ؎

ہم آئینہ میں اپنے حال کی تعبیر دیکھیں گے
تمہارے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویر دیکھیں گے"

شاید یہ اشارہ اس خواہش کی طرف ہے جو میں نے ان کی سوانح حیات لکھنے کے سلسلے میں اکثر ظاہر کی ہے اس سلسلے میں سارا مواد یک جا کر لینا چاہتا ہوں۔

دوشنبہ، ۸ / اکتوبر

مجھ میں ڈائری لکھنے کی سکت نہیں ہے صرف مجاز کی خاطر یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔

اختر شیرانی سے مجاز کی پہلی ملاقات کا حال پوچھا تھا۔

مجاز نے کہا "اختر شیرانی کی پہلی نظم میں نے غالباً ۱۹۳۰ء میں پڑھی تھی جو مولانا محمد علی پر کہی گئی تھی پھر "نمائش" کے سلسلے میں اختر شیرانی سے خط و کتابت شروع ہوئی انہوں نے وہ نظم مانگی تھی میں اس کے بعد کبھی کبھی ان کو نظمیں بھیجتا رہتا تھا۔ پھر کسی کام سے وہ دہلی آئے اور صرف مجھ سے ملنے کے لئے علی گڑھ چلے آئے میں گھر پر نہیں تھا پرچہ چھوڑ گئے لکھا تھا:

"میں تم سے ملنے علی گڑھ آیا ہوں اب رشید صاحب صدیقی کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"رشید صاحب کے ہاں پہنچا تو رشید صاحب نے کہا "ہاں آئے تھے پوچھتے تھے سلیمہ سلطانہ کہاں رہتی ہے؟ میں نے کہا مجاز سے رجوع کیجئے۔" غالباً اس طالبہ علم سے خط و کتابت رہی ہوگی۔ میں اسٹیشن گیا تو ملاقات ہوئی صرف کرتہ اور پاجامے میں تھے اور وہ بھی ملگجا، بال اُلجھے ہوئے، میں سمجھ گیا کہ اختر یہی ہیں۔ ان کو ساتھ لے آیا اور کنکر والی کوٹھی میں دو لڑکے جو میرے دوست تھے اور ذرا مرفہ الحال تھے، ان کے ہاں ٹھہرا دیا۔"

اور باتیں نکل آئیں سینٹ جونس کالج آگرہ کا ذکر آیا کہنے لگے۔ کالج میں مشاعرہ ہوا جذبی اور میں ہم جماعت تھے۔ سرور کچھ سینئر تھے۔ حامد حسن قادری صاحب نے وہاں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کر رکھی تھی۔ تینوں نے نظمیں یا غزلیں اس مشاعرے کے لئے لکھیں مجاز کو اس مقابلے میں بہترین غزل پر گولڈ میڈل ملا۔ اس واقعے کا تذکرہ مجاز کئی بار بڑے ولولے کے ساتھ کر چکے ہیں۔ غزل کے کچھ اشعار یہ ہیں:

یوں ہی بیٹھے رہو بس دردِ دل سے بے خبر ہو کر — بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر
وہی جلوے جواب نکہتِ دامن تھے گریزاں تھے — نظر میں رہ گئے گل ہائے دامانِ نظر ہو کر

فلک کی سمت کس حسرت سے تکتے ہیں ارے توبہ
یہ نالے نارسا ہو کر یہ آہیں بے اثر ہو کر!

نئی غزل جو راتے بریلی کے طرحی مشاعرے کے لیئے کہی ہے سُنائی۔ یہ دوسری غزل ہے جو پچھلے چند ہفتوں میں مجاز نے کہی ہے۔ پہلی وہ نظم ہے جو گاندھی جی کے سلسلے میں کہی تھی :

دامنِ دل پہ نہیں بارشِ الہام ابھی　　عشق ناپختہ ابھی جذبِ دروں خام ابھی
خود جھجکتا ہوں کہ دعویٔ جنوں کیا کیجیے　　کچھ گوارا بھی ہے یہ قیدِ در و بام ابھی
یہ جوانی تو ابھی مائلِ پیکار نہیں　　یہ جوانی تو ہے رسوائے مے و جام ابھی
واعظ و شیخ نے سر جوڑ کے بدنام کیا　　ورنہ بدنام نہ ہوتی مئے گل فام ابھی
میں بصد فخر یہ زہّاد سے کہتا ہوں مجاز
مجھ کو حاصل ہے شرفِ بیعتِ خیّام ابھی

---

۱۱ راکتوبر

نیاز فتحپوری کے مکان کے قریب ہی ایک حجام کی دکان ہے، شاعری سے شوق رکھتا ہے۔ خود بھی شعر کہتا ہے اور شاعروں کے بال کاٹنے کا شغف رکھتا ہے۔ جگر، احسان، دانش وغیرہ کے بال کاٹنے پر فخر کرتا ہے۔ مجاز سے تین چار سال سے تقاضا کر رہا تھا۔ آج مجاز اس کی طرف گئے تھے، بال کٹوا کر میرے ہاں آئے۔

دوشنبہ، ۱۲ رنومبر

مجاز سے ملاقات ہوئی، کشمیر کے مشاعرے سے پرسوں واپس آئے ہیں اور غالباً زندگی میں پہلی بار ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) روپیہ کی چیزیں گھر والوں کے لئے خرید کر لائے ہیں۔ گھر میں جشن ہو رہا ہے باقاعدہ نیاز دلائی گئی کہ لڑکا "آخری عمر میں مسلمان" ہوا ہے۔ یہ زندگی میں پہلا موقع ہے۔ دہلی میں آزاد کتاب گھر والوں سے "آہنگ" کا ایک مکمل اور مبسوط ایڈیشن چھاپنے کے لئے بات چیت ہو رہی ہے۔

۱۲ر دسمبر

صبح مجاز آ گئے تھے ان کے ساتھ احتشام صاحب کے ہاں گیا اور پھر مجاز کے اصرار پر ہم سب آنند نرائن ملاّ کے ہاں ان کے بھائی پی۔ این۔ ملاّ کے شدید طور پر زخمی ہو جانے پر عیادت اور اظہارِ ہمدردی کرنے کے لئے گئے۔ آلِ حسن بھی ساتھ تھے۔ مجاز اس کے بعد امیر رضا صاحب کے ہاں چلے گئے وہیں کھانا کھائیں گے اور شام تک پنگ پانگ کھیلیں گے۔ آج کل ہفتے میں ایک دن پنگ پانگ کھیلنے وہاں ضرور جاتے ہیں۔ مجاز نے مجھے بتایا کہ وہ امسال اردو ایم۔ اے کا امتحان علی گڑھ سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے دینے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی والدہ کو یہ ارمان ہے کہ وہ ایم۔ اے پاس کر لیں۔ مجھے اس شخص کی باترتیبی پر حیرت ہو رہی ہے۔ کتاب کے بارے میں اس قدر سنجیدہ۔ بار بار اس پر اصرار ہے کہ تم دیباچہ لکھ دو۔ ملاّ صاحب کے ہاں جانے کے سلسلے نہ صرف خود آمادہ بلکہ تھے اور احتشام صاحب کو لیجانے کے بھی وہی محرک ہوئے۔

سنہ ۱۹۵۲ء

ہفتہ، یکم مارچ

یونیورسٹی پہنچا، پتہ چلا مجاز آئے ہیں اجمیر کے مشاعرے کے بعد دہلی اور اس کے بعد کچھ عرصے علی گڑھ رہ گئے تھے۔ معلوم ہوا پروفیسر

مسعود حسن رضوی کو نظمیں غزلیں سنا کر گئے ہیں تعجب ہوا مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اردو ایم۔ اے کے کورس کی ایک نقل دے گئے ہیں، ۱۴/۱۲ ست امتحان ہے کافی ہاؤس میں ملنے کو کہہ گئے ہیں۔

کافی ہاؤس پہنچا تو وہ حالت تھی جیسی شراب پینے کے بعد ہوتی تھی۔ بکھرو کھلا ہوا باتیں برابر کرتے جا رہے ہیں زمین و آسمان کے قلابے اور تمام وقت اپنے اور محض اپنے بارے میں باتیں، شراب کے لئے دو روپے مانگے میں نے دے دئے مگر تعجب ہوا۔ مجھ سے کبھی وہ روپیہ نہیں مانگتے تھے۔ میجسٹک ہوٹل حضرت گنج میں جا کر بیٹھے۔ دو ایک اور لوگوں کو راستے سے پکڑ لیا اور شعر سنانے لگے۔ دو قطعے سنائے جو جوش صاحب کے خلاف لکھے تھے ؎

نطق رسوا دہن دریدہ ہے ۔۔۔ یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے

رندِ برباد کو نصیحت ہے ۔۔۔ شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

[یہاں "پندنامہ برائے میاں مجاز" اور جوش صاحب کی لکھی ہوئی ایک نظم کی طرف اشارہ ہے جس میں شیخ عبداللہ وزیر اعظم کشمیر کی مدح کی گئی تھی]

پیر جوش شباب کیا جانے ۔۔۔ شورش اضطراب کیا جانے

سینۂ انقلاب چھلنی ہے ۔۔۔ شاعرِ انقلاب کیا جانے

قطعے سنائے، پھر خود ہی شروع ہو گئے "کرشن چندر نے کہا کہ مجاز اگر طنز اس خوبصورتی کے ساتھ نظم ہو سکتا ہے تو میں اپنا قلم واپس لیتا ہوں۔"

"میں نے کہا "نہیں کرشن تم اس قدر خوبصورت زبان لکھنے والے ہو۔ تم تو شاعر ہو تجھے افسانہ نگار کون کہتا ہے۔" تو مسکرانے لگا۔

"اور جوش نے کہا کہ مجاز پھر پاگل ہو گیا ہے۔ پہلے پاگل ہوا تھا تو سبطِ حسن کو گالیاں دیتا تھا اب کے مجھے بُرا بھلا کہتا پھرتا ہے۔ مگر آدمی GENUINE اور پُرخلوص ہے۔" اختر ملیح آبادی نے کہا کہ "چچا جان! اور ذہین بھی ہے۔"

اس پر جوش نے کہا: "یہی تو مصیبت ہے۔"

یہ لطیفہ سُنا کر بہت خوش ہوئے۔

جب میجسٹک میں یہ لطیفہ بیان ہو رہا تھا تو مجھے شبہ ہوا کہ جوش کا اندازہ شاید صحیح ہے۔ لیکن اس وقت تک میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ کافی ہاؤس میں آنے سے پہلے بھی شراب پی ہوگی اسی لئے بہک رہے ہیں لیکن بعد کو اندازہ ہوا کہ یہ خیال درست نہ تھا۔

غزلیں اور نظمیں سُنانے لگے۔ نظم تھی "کیفِ جاودانی"

حسن اک کیف جاودانی ہے

پھر غزل سُنائی جس کا شعر ہے ؎

کیوں مجاز آپ نے ساغر توڑا ۔۔۔ آج یہ شہر میں چرچا کیسا تھا

اور اس کے ساتھ ایک لطیفہ بھی سُنایا۔

سہیل عظیم آبادی نے کہا تھا کہ اس بحر میں جمیل مظہری نے اعلیٰ ترین غزل کہہ دی ہے اب اس میں تم سے تو کیا جوش اور جگر جیسوں سے غزل ہونی دشوار ہے۔ بولے "میں نے آزاد ہند ہوٹل، جامع مسجد دہلی کے اسی کمرے میں دو بج کر پانچ منٹ سے لے کر ڈھائی بجے تک کے وقت میں یہ غزل افضل پشاوری کو بولی ہے۔ میں بولتا گیا وہ لکھتا گیا۔ وہ اس کا گواہ ہے۔"

غزل یقیناً اچھی تھی جب اس شعر پر پہنچے ؎

کیوں جوانی تھی مجھے یاد آئی ۔۔۔ میں نے اک خواب سا دیکھا کیا تھا

تو بولے اس سے ایک رات قبل ہی میری عمر پورے چالیس برس کی ہوئی تھی۔

دوسری غزل اور وہ نظم اس کے مقابلے میں زیادہ اچھی نہ تھیں لیکن اپنی طبیعت کی اس جولانی اور اُبال پر بڑا فخر تھا۔ بڑی ادا کے ساتھ کہنے لگے:

"I have been drinking poetry in
the night and vomiting poetry in the day."

(میں رات بھر شاعری پیتا رہا ہوں اور دن بھر شاعری اگلتا رہا ہوں)

بار بار "آہنگ" کے نئے ایڈیشن کے انتساب کا ذکر کرتے تھے اور داد چاہتے تھے:

فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل و جگر ہیں
مخدوم اور سردار کے نام جو میرے دست و بازو ہیں

شنکر لال چیف کمشنر دہلی کی بھتیجی یا بھانجی کی شادی کا دعوت نامہ جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ ہندی میں چھپا ہوا تھا۔ اسے بار بار نکال کر پڑھتے تھے اور اس کی عبارت کی تعریف کرتے تھے۔ عبارت یہ تھی:

"سُدھا
جسے اب تک ہم نے کیول (صرف) اپنا ہی سمجھا
کو
کرشن کمار کو سونپتے سمے
آپکے درشن کی
آشا ہے"

ملک راج آنند سے اپنی لڑائی کا ذکر کرنے لگے۔ کرشن چندر اور سردار جعفری کے بہت تذکرے ہوتے رہے۔ دہلی میں ہونے والے ایک مشاعرے کا بار بار ذکر کر رہے تھے جو چیمسفورڈ کلب میں ہوگا اور جس میں پاکستان کے بارہ شاعر شرکت کریں گے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے انہیں ویزا ملیں گے۔ نواب صاحب پٹودی کا بہت ذکر کرتے رہے۔

اپنی نظم "حسن ایک کیف جاودانی ہے" کے بارے میں کہنے لگے کہ علی گڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہا کہ اس نظم میں تم کیٹس سے آگے نکل گئے ہو جس نے کہا تھا "حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے۔" اب تک اس کے پیچھے پیچھے گھوم رہے تھے۔

جذبی سے لڑائی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور ایک قطعہ پڑھتے ہیں جو حیدرآباد سے ٹرنک کال پر کسی نے سنایا تھا اور جو غالباً خود مجاز ہی کا لکھا ہوا ہے۔

یہ علی گڑھ نہیں ہے بلدہ ہے — مرغیوں کا حسین دڑبہ ہے
کوئی چھیڑے نہ میرے شاعر کو — ہوں گے جذبی بھی یہ تو جذبہ ہے

دہلی میں شبیر حسین زیدی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ شہرزاد کے رقص کے تذکرے میں دو جملے خاص طور پر بار بار کہتے ہیں:

"soviet embassy speaks, chinese embassy relays."

پتہ نہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

دوسرا جملہ یہ ہے کہ "چار لڑکیاں اور دو بیویاں میرے گرد گھوم رہی ہیں اب پھر دہلی واپس جانا ہے اور پھر بھگتنا ہے انہیں۔"
سنتے سنتے اُکتا گیا۔ ناک میں دم آ گیا۔

معلوم ہوا کہ کتاب میں میرا لکھا ہوا دیباچہ شامل نہیں ہو سکا ہے اور "آہنگ" کی ترتیب میں آخری نظم "زہراب حسن" ہے جس کا پہلا مصرع ہے:

حسن ایک کیفِ جاودانی ہے

یو۔ پی حکومت کے محکمہ اطلاعات میں پہنچے اور گاندھی جی پر جو نظم ان کے رسالے "اطلاعات" میں چھپی تھی اس کا معاوضہ علی جواد زیدی سے طلب کیا انہوں نے سارے فائل نکلوائے اور خاص طور پر کلرک کو اسی کام میں لگایا۔ کافی دیر فائلیں الٹنے پلٹنے اور پریشان ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ معاوضہ پہلے ہی وصول کر چکے ہیں اور اس کی دستخطی رسید فائل میں موجود ہے۔

مجاز پاگل ہو گیا ہے ——— لیکن یہ حقیقت اس وقت میرے اوپر منکشف نہیں ہوئی تھی یہ دوسرے دن معلوم ہوا اور اسی وقت میں نے اس پاگل پن کی وجہ بھی ڈھونڈھ نکالی۔ مجاز کا پاگل پن ایک دائرہ میں چلتا ہے۔ پتہ نہیں لوگ اسے کیوں نہیں پہچانتے۔

پہلے خاموشی۔ پھر کچھ زیادہ زندہ دلی ——— باقاعدگی ——— پھر خواہش ——— پھر رکاوٹیں ——— پھر عشق بے پناہ ——— شکست ——— جنون ——— پھر خاموشی ——— اور پھر وہی سلسلہ۔

پھر وہ قدیمی نوٹ بک جس میں مختلف ٹیلی فون نمبر درج ہیں، ان کی جیب سے بار بار باہر نکلنے لگی۔

اتوار، ۲ مارچ

صبح مجاز کے ہاں پہنچا کیونکہ ابھی تک یہ خیال راسخ نہیں ہوا تھا کہ مجاز واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔ صبح ۷ بجے پہنچا تھا مگر جاگ چکے تھے۔ اس قدر صبح سویرے بیدار ہو جانا یقیناً ایک معجزے سے کم نہیں معلوم ہوا کہ انہیں علی گڑھ سے والدہ کے نمونیہ میں مبتلا ہو جانے کی غلط خبر دے کر بلایا گیا ہے اور ان کے بہنوئی ابو سالم صاحب جو علی گڑھ میں ہیں ہفتے کے روز آنے والے ہیں۔ اس وقت تک خود بھی یہاں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ "پھر کلکتہ کی امن کانفرنس میں جاؤں گا وہاں کے لئے ضرور نظم لکھنا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

مجاز پاگل ہو گیا میں اپنی آنکھوں کے سامنے بحران کی کیفیت دیکھ رہا ہوں۔ وہی ۱۹۴۵ء والا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ بولتے بولتے آواز بیٹھ گئی تھی لیکن زبان نہ تھکتی تھی۔

اپنے وطن ردولی کا قصہ سنانے لگے کہ ان کے ایک چچا نواب حسن فوق تھے جو پاگل تھے۔ جامدانی کی شیروانی پہنے، سر پر صافہ باندھے چھوٹی سی داڑھی ——— بقول مجاز "بالکل پیر تقی میر لگتے تھے بالکل میر" ——— سنگھاڑے کی گولیاں پتے میں بھرے سوکھے تالاب میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک شعر کہہ لیا "ایک گولی کھالی۔"

ان کے شعر سناتے رہے اور افسوس کرتے رہے کہ ان کا کلام ضائع ہو رہا ہے۔ محمد وسیم انصاری کا پتہ بھی لکھایا کہ ان سے کچھ مل جائے تو تم ضرور جمع کر کے چھپا دینا۔ شعر یہ تھے ؎

ابھی چاہیں تو ظلم کر بے وفائی کی سزا دے دیں
تمہارا نام رکھ دیں عہد و پیماں بھولنے والے

کہنے لگے شاعر کا انا یہاں پوری طرح شباب پر آتا ہے۔ ان کی ایک اور غزل کے چند شعر سنائے ؎

برس رہا ہے جو برسے سحاب کیا ہوگا
ہمارے دیدۂ تر کا جواب کیا ہوگا

یہی نہ ہوگا کہ در در کی خاک چھانیں گے ——— بس اور اے دلِ خانہ خراب کیا ہوگا

جو عہدہ دار جنوں ہیں انہیں خطاب ملے
میں بادشاہ ہوں میرا خطاب کیا ہوگا

ایک اور شعر انہی کا سنایا ؎

کسی کافر پہ آتا ہے شباب آہستہ آہستہ
کہ جیسے ہو عروج آفتاب آہستہ آہستہ

اس کے بعد ہیری چند اختر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو شعر دکھائے اور ان کی تعریف کی۔ شعر یہ تھے ؎

شباب آیا کسی بت پہ فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا بننے کا وقت آیا
ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

پھر گھر سے نکلے راستے میں کہنے لگے کہ روسی اور چینی سفارت خانوں میں جگہ مل رہی ہے۔ ایک جگہ اردو پڑھانے کی ہے دوسری رسالے کی ادارت کی " نروتم ناگر بھی میرا یار ہے جو ہندی رسالے کی ادارت کرتا ہے۔ یہ رسالہ سوویت بھومی بھی روسی سفارت خانے سے نکلتا ہے" وغیرہ۔

پھر ہم لوگ ٹہلتے ہوئے سرور صاحب کے ہاں پہنچے گورکھپور کے ایک صاحب عبیدالرحمٰن اور عیاذ انصاری آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ والے بھی تھے۔ پہلے نظمیں اور غزلیں ہوتی رہیں پھر سینٹ جانس کالج آگرہ کا ذکر چھڑ گیا جب سرور صاحب نے ایک ڈبیٹ میں اقبال کی حمایت کی تھی اور انہیں اردو کا سب سے بڑا شاعر بنایا تھا اور مجاز نے غالب کی۔ اس وقت کے اپنے حلیے کا بڑا ہی اچھا بیان کیا تھا ترکی ٹوپی پہنے ہوئے اور اس پر ہلتے ہوئے پھندنے کے ساتھ غالب کی حمایت کرنے کھڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد جذبی اور اپنے ہم جماعت ہونے کا ذکر کرنے لگے۔ دونوں سائنس کے طالب علم تھے جذبی اس زمانے میں ملال تخلص کرتے تھے اور مجاز شہید کے نام سے لکھتے تھے ایک بار دونوں نے سنیما جانے کا پروگرام بنایا۔ پہلے وارڈن صاحب سے اجازت لینے کے لئے ملال پہنچے مہاجن صاحب ان دنوں وارڈن تھے۔ ملال نے پہلے جا کر غلط سلط انگریزی میں پوچھا:

"sir I want to go to cinema."

خیر اجازت مل گئی۔ اس کے بعد مجاز پہنچے۔ اس سے پہلے کہ یہ کچھ کہیں مہاجن صاحب نے خود ہی کہا:

"I was expecting you. You can also go to pictures."

"آیئے میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی سینما دیکھنے جا سکتے ہیں"

اس کے بعد اپنے ایک اور ہم جماعت کا ذکر کرنے لگے جس پر شر پر تھا، ایک عیسائی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ کسی نے بتایا کہ اس کو رام کرنے کے لئے اُلّو کا دل کھلاؤ۔ لہٰذا جاڑے کی راتوں میں رات رات بھر غلیل لئے سڑکوں پر اُلّو مارتے پھرتے تھے۔ آخر ایک دن ۲ بجے صبح کو اُلّو ہاتھ آیا اور اس کا دل نکال کر کیک میں رکھ کر اس لڑکی کو لے جا کر کھلایا مگر وہ پھر بھی مہربان نہ ہوئی۔

فانی کے بارے میں بہت سے قصے سنائے۔

پہلی بار جب اصلاح لینے گئے تو فانی صاحب میکش اکبر آبادی کے ہاں آگرہ میں تھے۔ میکش صاحب کے مکان کے دونوں طرف طوائفیں رہتی ہیں اور بیچوں بیچ میں میکش صاحب کا مکان ہے۔ پہلی غزل ڈرتے ڈرتے انہوں نے سنائی۔

فانی نے میکش صاحب کو مخاطب کرکے کہا، "میاں میکش اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے؟"
اس کے بعد کی ایک غزل پر ایک مصرعہ کی اصلاح کی اور ایک شعر پر دو بار صاد بنا دیا۔ اصلاح یہ تھی۔ مجاز کا شعر تھا ؎

قتل کرکے وہ مستیاں ان کی
خونِ دل بھی شراب ہوتا تھا

فانی نے پہلا مصرعہ یوں بدل دیا ؎

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ
خونِ دل بھی شراب ہوتا تھا

مجاز نے ہر بار اسے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا لونڈا پن دیکھئے لکھنوی انداز کا شعر کہا تھا جس شعر پر دو صاد بنائے تھے وہ یہ تھا ؎

ان کے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرہ کو آفتاب ہونا تھا

اس کے بعد تیسری بار اپنے زعم میں غالب سے بھی زیادہ اچھی غزل لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ انہوں نے ایک نظر دیکھی اور کہا "کل آنا"

"ہم سمجھے کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ دوسرے دن گئے تو مطلع پڑھا ؎

یوں مسکرائے رُخ سے اٹھا کر نقاب کو
کچھ بجلیوں نے گھیر لیا آفتاب کو

کہنے لگے "مہمل شعر ہے حضرت! آپ برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہیں" پھر کہا، "تبسم لب پر ہوتا ہے کہ چہرے کے چاروں طرف؟"

"اس غزل کی اصلاح کے بعد ہم کمرے میں جا کر ایک گھنٹہ کے قریب خوب خوب روئے اور فانی صاحب پر سخت خفا ہوئے۔ ان کی پر غزل لکھی، راہ میں ملے تو طنز سے انہیں خوب جھک کر سلام کیا" راستے سے گذر رہے تھے، مجاز کا مکان راہ میں تھا سلام کیا تو وہیں گھٹے۔ مجاز نے وہی غزل جو ان کی غزل پر لکھی تھی سنائی بالکل خاموش بیٹھے رہے غزل ختم ہو گئی تو کہنے لگے "میاں مجاز اس غزل کو ایک بار پھر پڑھنا"

مجاز نے کہا، "یہ گویا میرے لئے سب سے بڑی دادِ تحسین تھی"
یہ غزل فانی کی غزل "ٹالے ہوئے تو ہیں۔ سنبھالے ہوئے تو ہیں" پر لکھی ہوئی تھی اور "آہنگ" میں شامل ہے، اس کا مطلع ہے ؎

سینے میں ان کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

یہ مطلع مجاز کو پسند نہ تھا اور بڑی مشکل سے "آہنگ" کی مکمل تدوین کے وقت اسے شامل کرنے پر راضی ہوئے تھے۔
آخری غزل جو مجاز نے فانی کو دکھائی تھی اس پر فانی نے کہا، "میاں! تمہاری غزلوں میں نشاط کا رنگ ہے میرا غم تمہاری جوانی اور نشاط کو روند ڈالے گا اس لئے آئندہ مجھ سے اصلاح نہ لیا کرو۔ صرف الفاظ اور ترکیبوں کا اشتباہ دور کر لیا کرو یا ایک آدھ مصرعہ سنا دیا کرو"
اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوا۔

فانی کا ایک اور قصہ بھی سُنایا۔

بھوپال کے مشاعرے میں جو نواب صاحب بھوپال کی سالگرہ کے موقع پر ہوا تھا اتفاق سے فانی بھی موجود تھے اور جوش بھی۔ رات کو نواب صاحب نے ڈنر دیا اور اس کے بعد شراب کا دور چلا سب لوگ نشے میں بدمست تھے۔ جوش صاحب میں فقیر محمد خاں گویا کی روح بیدار ہوئی کہنے لگے:

"فانی صاحب! یہ نواب بھوپال بھی پٹھان ہیں اور میں بھی آفریدی ہوں۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ یہ آج نواب بھوپال بنے بیٹھے ہیں اور میں ایک فاقہ کش فقیر ان کی شراب پی رہا ہوں ورنہ میرے پردادا نے ان کے پردادا کے ٹونک، جھانسی اور بندھیل کھنڈ کے میدانوں میں چیتھڑے بکھیر دئے تھے۔"

سناٹا چھا گیا۔

فانی صاحب نے جوش صاحب کو خاموش کرایا۔ "جوش صاحب! جوش صاحب! چپ ہو جائیے۔ پُرانی تاریخ دُہرانے سے کیا فائدہ؟"

جمعرات، ٦ر مارچ

حضرت گنج میں مجاز ملے اسی حالت میں۔

آج بھی پیسے کا تقاضا۔ آج بھی سلور اسنو میں بیئر پیتے رہے اور قصے سُناتے رہے، وہ شعر سُنایا جو لکھنؤ کے ہندی اخبار "نوجیون" کے ہولی نمبر کے لئے لکھا ہے ؎

ہندو مسلم سکھ عیسائی امن کے موتی رولیں گے
خون کی ہولی کھیل چکے ہیں رنگ سے دھبے دھولیں گے

آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اپنی ملازمت کے قصے سُناتے رہے۔ جب ملازمت سے معطل کر دئے گئے تھے تو دو مہینے کے قرض کی رقم سات سو روپے تک ہو گئی تھی اسی زمانے میں سب سے پہلی مرتبہ مجاز کے شراب پینے کی اطلاع گھر والوں تک پہنچی۔ اسی زمانے میں مجاز جس فلیٹ میں رہتے تھے اس کے نیچے والے حصے میں ایک نرس مس نورا سنگھ رہتی تھی جو ہسپتال میں کام نہیں کرتی تھی بلکہ پرائیویٹ نرس کی طرح کام کرتی تھی۔ اس نے مجاز کی شراب نوشی کو روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ "چھ بوتلیں وہسکی کی تمہارے لئے ہیں لیکن اس کا عہد کرو کہ ہمارے ہی گھر پر پیئو گے اور باہر کہیں نہیں پیئو گے۔" اسی زمانے میں "آوارہ" لکھی گئی۔

ڈاکٹر سید حسین مرحوم کے قصے سُناتے رہے اور بڑی عقیدت کے ساتھ۔ جب ڈاکٹر سید حسین امریکہ سے جلاوطنی سے واپس آئے تھے اور بمبئی میں احمد عباس اور مجاز اپنے بھائی انصار ہروانی کے ساتھ ان سے ملنے گئے تھے ۱۹۳۶ء میں پہلی ملاقات کا ذکر کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مجاز نے سید حسین مرحوم پر "ایک جلاوطن کی واپسی" نظم لکھی تھی اور احمد عباس کے تذکرہ کرنے پر بھی سید حسین نے اس نظم کے سُننے کا اشتیاق مجاز سے ظاہر نہیں کیا۔

جمعرات ۱۳ر مارچ

مجاز کی دیوانگی حد سے تجاوز کر رہی ہے۔ ملا صاحب نے فریاد کی، سرور صاحب الگ شاکی ہیں۔ انہوں نے چائے پر بلایا تھا وہاں ان کی طرف سے نہ جانے کس کس کو مدعو کر آئے۔ کوئی بیگم بشیر ہیں ان کو بھی بلا آئے ہیں۔ سرور صاحب کی بیگم صاحبہ سے کہلا بھیجا

کہ چھ سات مہمانوں کے لئے چائے وغیرہ کا انتظام کر رکھیں چائے کی پارٹی میں بھی کافی ہنگامہ کیا۔ عیاذ ان کو پہنچانے گئے تو کہہ دیا کہ "اگر اس چوراہے سے آگے بڑھو گے تو اینٹیں ماروں گا۔"

۵ بجے صبح مجھے ملے مجنوں گورکھپوری سے ملنے رائل ہوٹل جا رہے تھے کہنے لگے تم بھی ساتھ چلو میں نے کہا۔ "اتنے سویرے کہاں جائیے گا۔" بولے "وہ صبح ۵ بجے اٹھ جاتا ہے اسے تم نے کوئی گھٹیا آدمی سمجھا ہے؟"

اس سے پہلے میرے یہاں آئے تھے اور ایک نہایت لچر تک بندی کر کے لائے تھے "کنگال کر دیا ہم کو، نیپال کر دیا ہم کو" وغیرہ۔ وہ کسی ایسے شناسا کو سُنائی جو یہاں برف خانے میں کام کرتے تھے اور ان سے کہا کہ "یہ تین شعر کیسے ہیں۔ تین روپیے کے ہوئے یا نہیں؟"

اس نے کہا۔ "انتہائی گھٹیا ہیں۔"

کہنے لگے۔ "ہم تو آگرے میں فانی کے زیرِ سایہ رہتے تھے البتہ ہمارا ایک اور دوست گھٹیا مئو میں رہتا تھا۔"

جمعرات ۱۰ اپریل

منیش نرائن سکسینہ آئے ہیں۔ کلکتہ کی امن کانفرنس سے واپس آ رہے ہیں۔ سُنا ہے مجازؔ بھی وہاں وارد ہوئے اور گھڑی گھڑی بیئر کی بوتلیں خرید کر لاتے تھے اور پیتے تھے نئے نئے لڑکے اور طلبا انہیں پلاتے تھے۔ کانفرنس کے ڈیلی گیٹوں کے اجتماع میں مائیکروفون پر قبضہ جما کر کھڑے ہو گئے اس سے کچھ ہی دیر قبل سردار جعفری نے انگریزی میں تقریر کی تھی اور ڈیڑھ گھنٹے کے لئے "one and a half Hour" استعمال کیا تھا اور کسی دوسرے شاعر نے کہیں "رنگین آنکھیں" اور "غزالِ رنگیں" کی ترکیبیں استعمال دی تھیں، مجازؔ نے انگریزی میں تقریر شروع کی۔ جملے کچھ اس طرح کے تھے:

"I am supposed to be a fairly important poet in INDIA and PAKISTAN put together but what is 'one and a half hour' I fail to understand. I have also never come across "TECHNICOLOR" eyes or a TECHNICOLOUR CHIZAL. These people know nuthe ENGLISH non Uedu."

آج کل برملا کہتے ہیں کہ شاعر صرف دو ہیں ایک فیضؔ اور دوسرا مجازؔ۔

جوشؔ صاحب سے سخت ناراض ہیں۔

آغا حشر ٹائپ کے ڈراموں کے مکالمے بولتے ہیں اور بار بار دُہراتے ہیں:

"جہاں پناہ! ایران کا شہزادہ مراد حاضر ہے۔"

"ناشاد نامراد شہزادہ مراد کو حاضر کیا جائے۔"

پھر شعر پڑھیں گے ؎

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تعریف بوئے مشک غزالوں کے سامنے

"بس ہو چکے بہلنے چلو کھانے۔"

دوشنبہ، ۱۲ مئی

آج میں نے یہاں کے انگریزی روزنامے کے آرٹ اور فلم سیکشن کا کام سنبھال لیا۔ آج شام چیتن آنند کی فلم "آندھیاں" ریلیز ہوئی اس سلسلے میں دیو آنند، مشہور ہندوستانی اداکار اور نوکیتن کی پوری ٹیم آئی ہوئی ہے جس میں ان کا فوٹوگرافر جال مستری اور موسیقار علی اکبر خان بھی شامل ہیں ان لوگوں کے ساتھ شام گذری۔

رات کو رائل ہوٹل میں ڈنر تھا، شراب تھی، حسن تھا، عمدہ کھانے تھے —— اور دیو آنند پر مرکز سارے فلم پسندوں کی توجہ تھی۔ عزت، شہرت اور امارت کے اس نظارے سے عجیب احساس ہوا کہ یہ شخص جو دستاوسکی، زولا اور سرت چندر کا نام لیتا ہے، ہزاروں میں کھیلتا ہے اور لاکھوں انسانوں کی بھیڑ سے چوروں کی طرح گھبرا کر بچ کر نکلتا ہے، ایک سمت سے۔

—— اور اسی شام مجاز کے رانچی پاگل خانے میں داخل ہونے کی خبر سُنی اور کس المیہ انداز میں۔ انصار ہروانی انہیں یہ کہہ کر لے گئے کہ رانچی میں مشاعرہ ہو رہا ہے اور پاگل خانہ پہنچ کر انہیں بتایا کہ مشاعرہ گرمی کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ مجاز انصار کو بھی اپنی نظم سُنانے پر مصر تھے۔ جنہیں انھوں نے زندگی بھر کبھی کوئی شعر نہیں سُنایا۔ کہنے لگے " بھئی عجیب لوگ ہیں جنہوں نے گرمی کی وجہ سے مشاعرہ ملتوی کر دیا۔ گرمی کی وجہ سے کبھی مشاعرہ ملتوی ہوتے نہیں سُنا۔"

اور وہ شاعر شراب و نغمہ، حسن و شباب کا وہ مطربِ نے نواز، پاگل خانے کی چار دیواری میں قید ہو گیا۔ ابھی کچھ روز ہوئے میں نے کسی کا بیہودہ افسانہ نما مضمون پڑھا تھا جس میں مجاز کے پاگل پن کا بھی مذاق اڑایا گیا تھا اور کیچڑ اچھالی گئی تھی۔

کیا ہماری ادبی اور فنی دنیا کا یہی آئین ہے کہ ہر ایک فن کار پاگل خانے کی اندھی دیواروں کے بیچ دفن کر دیا جائے اور دنیا ہنستی رہے، قہقہے مارتی رہے، قہقہے لگاتے لگاتے پاگل ہو جائے۔

پتہ چلا ہے کہ مجاز کے برابر والے وارڈ میں قاضی نذر الاسلام ہیں۔ یہ ہے ہماری ادبی شہرت اور فنی برگزیدگی کی انتہا، تہذیب اور علم دوستی کی معراج —— ع تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

ایامِ جنوں کی غزلیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں من و عن نقل کی جا رہی ہیں[1]۔

---

[1] یہ غزلیں اور نظمیں "مجاز کا غیر مطبوعہ کلام" کے عنوان سے (مع ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے نوٹ کے) الگ شائع کی جا رہی ہیں۔

مجازؔ کا غیر مطبوعہ کلام

(ایامِ جنوں کی غزلیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں)

○

جذبۂ شوق نہیں شہپرِ پرواز نہیں
للہ الحمد کہ وہ بارگہِ ناز نہیں

حسن کی بزم بھی خلوت کدۂ ناز نہیں
عالمِ عشق کوئی انجمنِ راز نہیں
(یہ شعر کاٹ دیا گیا ہے)

وعدۂ لیل نہیں بادۂ گلفام تو ہے
لبِ شکر ریز نہ ہوں آنکھ بھی غماز نہیں

نالۂ درد نہیں روکششِ محمل تو نہ ہو
یہ کوئی نجد کی بکھری ہوئی آواز نہیں

سنگ ساری ہے کہ لوہا بھی پگھل جائے مجازؔ
لبِ فرہاد پہ بجلی کوئی اعجاز نہیں

○

یہ تیرگیٔ شب ہی کچھ صبح طراز آئی
خود وعدۂ فردا کی چھاتی بھی دھڑک جاتی

ہونٹوں پہ ہنسی سہم آتے ہوئے شرماتی
کیا صبحِ قیامت ہی حاصل ہے جدائی کا
([illegible])

اب رات نہیں کٹتی اب نیند نہیں آتی

جو اوّل و آخر تھا وہ اوّل و آخر ہے
میں نالہ بجاں اٹھتا وہ نغمہ بساز آتی

سوزِ شبِ ہجراں پھر سوزِ شبِ ہجراں ہے
شبنم بہ مژہ اٹھتی یا زلفِ دراز آتی

یارب وہ جوانی بھی کیا محشرِ ارماں تھی
انگڑائی بھی جب لیتی ایک آنکھ جھپک جاتی

آغازِ سیہ مستی، انجام سیہ مستی
آئینہ میں صورت بھی آنے کی قسم کھاتی

سینے میں مجازؔ اب تک وہ جذبۂ کافر تھا
تثلیث کی جو بندہ وحدت کی قسم کھاتی

○

نہ رہ نمانہ کسی رہگذر کو دیکھتے ہیں
جدھر سے تیر چلے ہیں اُدھر کو دیکھتے ہیں

جبینِ گرم بہ تمکینِ ناز کیا کہیئے
ابھی فریبِ قضا و قدر کو دیکھتے ہیں

نگاہ آڑ نہ لے معصیت پناہی کی
نگاہ ہو گی کبھی معصیت پناہی پہ[*]
ابھی تو وسعتِ دامانِ تر کو دیکھتے ہیں

سوادِ نجد کی رعنائیوں میں گم یکسر
کسی سفیر کے عزمِ سفر کو دیکھتے ہیں

○

زلفِ سرکش بے نیازِ پیچ و خم
قیس کے چاکِ گریباں کی قسم

○

آبنوسی جسم پر تانبے کا رنگ
قلبِ شاعر کو نویدِ عزمِ جنگ

○

زلزلے ہیں طالعِ بیدار میں
وہ توانائی لب و رخسار میں

○

عارضِ گلرنگ پیمانے لئے
انکھڑیاں راتوں کے افسانے لئے

[*] ایک مصرعہ یہ بھی لکھا تھا۔

○

(سودا کی زمین میں غزل کہی ہے)

رعشہ سا جو یاں دست و گریبان میں دیکھا
ہندو میں نہ پایا نہ مسلمان میں دیکھا

سفاک سے ابرو یہ غضبناک سی آنکھیں
اک داغ سا ہر قلبِ پُر ارمان میں دیکھا

فرخندہ جبیں ہو کے بھی شمشیر بکف ہے
شیطان نے کیا سینۂ انسان میں دیکھا

اب درد کلیجے سے لگائے ہوئے پھریے
ایمان سے پایا ہے نہ ایمان میں دیکھا

اس سے تو مجاز آپ بھی بے بہرہ ہوں شاید
جو سوزِ وفا آپ کے ہذیان میں دیکھا

○

سنہ ۱۹۲۹ء میں لکھی ہوئی غزل جو جگر کی زمین میں ہے ایامِ جنوں ہی میں پوری ہوئی ہے اس کے نیچے آگرہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں فٹ نوٹ تاج کے بارے میں "مراد تاج محل" کے الفاظ لکھے ہیں اور آخر میں یہ مصرعہ واوین کے اندر لکھا ہوا ہے "یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا تھا"

دھواں سا اک سمت اُٹھ رہا ہے شرارے اڑ اڑ کے آ رہے ہیں
یہ کس کی آہیں یہ کس کے نالے تمام عالم پہ چھا رہے ہیں

نقاب رُخ سے اٹھا چکے ہیں کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں
میں حیرتی ازل ہوں اب بھی وہ خاک حیراں بنا رہے ہیں

ہوائیں بے خود فضائیں بے خود یہ عنبر افشاں گھٹائیں بے خود
مژہ نے چھیڑا ہے ساز دل کا وہ زیرِ لب گنگنا رہے ہیں

یہ شوق کی وارداتِ پیہم یہ وعدۂ التفاتِ پیہم
کہاں کہاں آزما چکے ہیں کہاں کہاں آزما رہے ہیں

صراحیاں نو بنو ہیں اب بھی جماہیاں نو بنو ہیں اب بھی
مگر وہ پہلو تہی کی سوگند اور نزدیک آ رہے ہیں

وہ عشق کی وحشتوں کی زد میں وہ تاج کی رفعتوں کے آگے
مگر ابھی آزما رہے ہیں مگر ابھی آزما رہے ہیں

عطا کیا ہے مجاز فطرت نے وہ مذاقِ لطیف ہم کو
کہ عالمِ آب و گِل سے ہٹ کر اک اور عالم بنا رہے ہیں

آہنگِ جنوں

یہ نظم بڑی پرانی ہے اس کے صرف چند اشعار ہی چھپے ہیں۔ مجاز نے ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کی اُردو میگزین کے لیئے یہ نظم مجھے لکھوائی تھی مکمل طور پر غالباً پہلی بار یہاں چھپ رہی ہے۔ اس کے عنوان کے نیچے بریکٹ میں "بغیر اجازت کے" الفاظ بھی لکھوائے تھے ۱۹۴۵ء کا یہ زمانہ بھی ان کی ذہنی بے راہ روی کا تھا

نہ چھیڑ اے ہم نشیں پھر مضطرب ہیں بجلیاں دل میں
مرے آتے ہی اکثر آگ لگ جاتی ہے محفل میں

مرے ہاتھوں میں جب عشق و جنوں کا ساز ہوتا ہے
زمیں کیا آسماں تک گوش بر آواز ہوتا ہے

مری مضراب اکثر چھیڑ دیتی ہے رگِ جاں کو
مری شعلہ نوائی پھونک دیتی ہے گلستاں کو

گلستاں میرا گھر ہے ناز پروردہ ہوں فطرت کا
کوئی ٹھکرا نہیں سکتا کہ آوردہ ہوں فطرت کا

مری آنکھوں میں فرطِ غم سے جب بھی اشک آئے ہیں
چمن کی ہر کلی نے خون کے آنسو بہائے ہیں

ہوا کے سرد جھونکے سسکیاں بھرتے نظر آئے
مہ و انجم مجھے سرگوشیاں کرتے نظر آئے

سراپا درد ہوں میں دکھ بھری گودوں کا پالا ہوں
میں ہر محفل کی زینت ہوں میں ہر گھر کا اُجالا ہوں

نہ واعظ ہوں نہ ناصح ہوں نہ ہادی ہوں نہ رہبر ہوں
محبت میرا قرآں ہے جوانی کا پیمبر ہوں

جہاں میں ہوں وہاں اک لن ترانی کی خدائی ہے
مرے نزدیک دنیا پر جوانی کی خدائی ہے

وفا دشمن جوانی کو وفا کا درس دیتا ہوں
سرک جاتے ہیں آنچل سر سے جب میں دیکھ لیتا ہوں

نہ ناکامی کا اندیشہ نہ غم کی سرگرانی ہے
جنونِ زارِ محبت میں جوانی ہی جوانی ہے

جوانی کی نگاہیں دیکھتی ہیں عین مستی میں
اجل کا وحشیانہ رقص عرصہ گاہِ ہستی میں

ضعیفی محفلِ عشرت میں خرقہ پوش آتی ہے
جوانی جب بھی آتی ہے کفن بر دوش آتی ہے

(نظم کا دوسرا حصّہ)

بغاوت کا علم بردار ہوں محشر بداماں ہوں
فرشتوں نے جسے سجدے کئے ہیں میں وہ انساں ہوں

پرانی دشمنی ہے اہلِ زر کے آستانوں سے
میں بجلی ہوں گرا کرتا ہوں اکثر آسمانوں سے

بڑھا ہوں جب بھی میداں میں بغاوت کا علم کھولے
فرشتے نے اجل کے آسماں پہ ہنس کے پر تولے

جسے زخمی کیا میں نے وہ ہرگز جی نہیں سکتا
مرے خنجر کا مارا اُٹھ کے پانی پی نہیں سکتا

"سیہ کارانِ زر" کو "فتنہ پردازانِ مذہب" کو
جکڑ رکھا ہے میں نے سازشوں کے جال میں سب کو

میں بادل بن کے صحراؤں پہ منڈلایا کیا برسوں
میں بجلی بن کے کاشانوں پہ لہرایا کیا برسوں

مرے ہی دم قدم سے بزمِ فطرت میں اُجالا ہے
مجھے آندھی نے لوری دی ہے طوفانوں نے پالا ہے

جلالِ ابروئے سرکش جمالِ رُخ کا آئینہ
خدا کا رازداں ابلیس کا اک یارِ دیرینہ

جنوں کے راگ گاتا ہوں لہو کے اشک روتا ہوں
ہمیشہ کشتگانِ غم کی پہلی صف میں ہوتا ہوں

نظر آنے لگی ہیں پھر مرے خوابوں کی تعبیریں
مرے پائے جنوں پر ٹوٹتی پھرتی ہیں تقدیریں

مرے سینے میں مستقبل کے جلوے مسکراتے ہیں
مری گفتار سن کر اہلِ دولت کانپ جاتے ہیں

فراق کے خطوط

۴ بینک روڈ الہ آباد

۱۵ ردسمبر ۱۹۵۵ء

برادرم طفیل صاحب!

آپ کے یہاں سے جانے کے بعد صرف دو مختصر سے خط ملے تھے۔ جن کا میں نے بھی دو لفظی جواب بھیج دیا تھا۔ تفصیلی بات چیت کے لئے تفصیلی خط لکھا کریں۔ لیجئے میں اس کی ابتدا کرتا ہوں۔

ادب سے متعلق بہت سے خیالات و سوالات اس وقت سے میرے ذہن میں اٹھتے رہے ہیں جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ اس باب میں میری تین حیثیتیں ہیں۔ طالب علم ادب، عملی ادیب اور معلّم ادب۔ میرے ذہن میں جہاں ادب سے متعلق اور بہت سے سوال اٹھتے ہیں ایک یہ سوال بھی بار بار اٹھتا ہے کہ انگریزی شاعری اور انگریزی نثر کے سینکڑوں محاسن ہمارے اردو ادب میں کیوں نہیں آسکے اور قریب قریب ہر لحاظ سے ہمارا اردو ادب انگریزی ادب سے کیوں کمتر ہے؟ اس کی ایک نہیں بچاسوں وجہیں گنائی جاسکتی ہیں۔ صرف شاعری کو لے لیں۔ اقبال۔ جوش اور فیض تک کے یہاں وہ کئی محاسن نہیں ملتے جو منجملہ دیگر اکابر سخن کے مثلاً ٹینی سن، سوِن برن شیلے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دوئم و سوئم صف کے انگریزی شعراء کے کلام میں جلوہ گر ہیں جیسے کنگسلے، والٹر سکاٹ، ڈرائیڈن، فرانسس ٹامسن میتھیو آرنلڈ یا پالگریو کے خزانۂ زریں (Golden Treasury) کے درجنوں وہ شعراء جو صف اوّل کے شاعر نہیں لیکن جن کی نظموں کو کئی لحاظ سے ہماری نظمیں نہیں پہنچ سکتی ہیں خاص کر صوتی لحاظ سے۔

گذشتہ نصف صدی سے ہمارے کئی شاعر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور اس سے متاثر و فیض یاب بھی ہوتے رہے ہیں۔ پھر یہ کمی ہماری شاعری میں کیوں رہ جاتی ہے؟ شاید ایک وجہ تو یہ رہی ہے کہ منظوم شاعری میں ہم میکانکی طور پر قدیم اصنافِ سخن کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں۔ انگریزی کے اشکالی سٹینزا (STANZA FORMS) قافیوں کی نئی خوش آئند ترتیبیں (RHYMES CHEMES) کو ہم بہت کم اپنا سکے ہیں۔ تخلیقی فقرہ، تخلیقی اضافت EPITHET اور PHRASING میں بھی

یا بیان میں نئی تعبیروں کے معاملہ میں، ایسے اسالیب کی تخلیق کے معاملہ میں جن میں ہماری زبان یا بولی کے نئے تابناک اعلیٰ امکانات جلوہ گر ہوں ہم یورپ کے شاعروں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہماری شاعری کی زبان میں کچھ دائمی اور ناقابل ترمیم و تبدیل عناصر (CONSTANTS) پیدا ہو گئے ہیں۔ بیان کے روایتی و رسمی ٹکڑے بار بار ہماری شاعری میں آجایا کرتے ہیں۔ ہمارے اسلوب شاعری کے کچھ معمولات بن گئے ہیں۔

دوسری وجہ اس کمی کی یہ ہے کہ خصوصاً غیر مقفیٰ شاعری میں ہم انگریزی بلینک ورس کسا کا یہ کی ان تکنیکوں پر عبور حاصل نہیں کر سکے جن سے لمبے یا طولانی جملے اس طرح اُگتے ہیں جیسے کوئی سڈول متناسب جسم نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ پورے کس بل اور تناؤ کے ساتھ ایسے جملے جو کسی متعدد طویل بحر میں مسلسل متعدد مصرعوں کے ذریعہ تکمیل پا سکیں ابھی ہماری غیر مقفیٰ شاعری میں بہت کم آسکے ہیں۔ جاندار بلینک ورس محض عدم قافیہ سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا داخلی عمل اُس پُرانا یام (Breath Control) کی صفت رکھنے والی محنت سے پیدا ہوتا ہے جس میں شاعر کا خیال مصرعوں کے زیر و بم میں منڈلاتا ہوا دکھائی اور سنائی دے۔ ابھی ہماری بلینک ورس کو جملوں کے مختلف پھیلنے ڈھالنا اور سمندری جوار بھاٹوں کی شان پیدا کرتا لمبے جملوں کا فن تخلیق THE ART OF THE LONG SENTENCE سیکھنا ہے۔ ایک نیا علم بیان حاصل کرنا ہے فقروں کے زنجیریں باندھنا سیکھنا ہے۔ شاندار پارہ ہائے نظم VERSPARAS کا فن ابھی ہمیں بہت کم آسکا ہے، تیسری وجہ مذکورہ بالا دوسری وجہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ہماری مقفیٰ اور غیر مقفیٰ دونوں طرح کی نظمیں اکثر محض غزل کی تلبیس ہوتی ہیں۔ ان میں خیال کا تدریجی اُگاؤ یا ترقی DEVELOPMENT OF IDEA یا مکمل کائنات خیال بہت کم ہوتا ہے۔ وہ کاوے کاٹتی ہیں آگے نہیں بڑھتیں ہم حلقوں یا دائروں میں لکھتے ہیں (WRITING IN CIRCLE) یا (ARGUING IN A CIRCLE)۔ مختلف تشبیہوں سے ہم ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں، مختلف خیالوں سے ایک بڑے سے خیال کی بڑی اکائی ہم تیار نہیں کر پاتے جسے تعمیری صلاحیت یا ARCHITECTONICS کہا گیا ہے۔

یہ تمام صلاحیتیں حاصل کرنے کی طرف ہمارے شعرا کو توجہ کرنا چاہئے، ہمیں انگریزی شاعری کے غائر مطالعہ سے رہنمائی حاصل کرنا ہے بلینک ورس یا نئی مقفیٰ نظمیں ہم کہنے تو لگے ہیں لیکن وہ بلند تر سنجیدگی THE HIGHER SERIOUSNESS ہماری نئی تخلیقوں میں خال خال ہی نظر آتی ہے جس کے بغیر ہماری شاعری بلند مغربی شاعری کی ہم پلّہ و ہم مرتبہ نہیں ہو سکتی۔ بس آج اتنا ہی۔

اندازے پر نظر ثانی کر کے آپ کے پاس جلد ہی بھیجوں گا۔ زیادہ تاکید نہ کریں۔ ورنہ مجھے نادم ہونا پڑے گا۔ جوش کے پاکستان چلے جانے پر تو ہندوستان و پاکستان کے اخبارات بڑی گلفشانیاں کر رہے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ میاں جہاں رہو خوش رہو۔

آگے پیچھے بیخود دہلوی، کیفی دہلوی، ہوش بلگرامی اور مجاز کے اٹھ جانے سے ایک خلا محسوس کر رہا ہوں۔ ابھی چراغ حسن حسرت اور منٹو کے داغ تازہ تھے۔ اب تو جینے سے میرا جی بھی بھر گیا ہے۔

اے موت کی نیند ہم بھی جاگے ہیں بہت
اپنا بھی تو آفتاب آئے لب بام

آپ کا
فراق گورکھپوری

(۲)

۸/۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
۲۲ دسمبر ۱۹۵۹ء

برادرم

آپ کا جواب تو نہیں آیا۔ پھر بھی خط لکھنے کے لئے قلم اٹھا ہی لیا ہے۔
آج کے خط میں کیا لکھوں۔ طبیعت میں سکون بھی ہے تازگی بھی اور کچھ اُداسی بھی۔ کچھ دیر سے بیٹھا ہوا اپنا یہ شعر گنگنا رہا تھا۔

اس دَور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

پچھلے دو مہینوں میں میرے یہاں کچھ غزلوں کی بارش سی ہوتی رہی ہے۔ میں نے تو کوئی نئی نظم کہنے کے لئے اپنے تحت الشعور کو خاموش چھوڑ دیا تھا۔ نہ جانے کیونکر غزلوں کی جھڑی لگ گئی۔ اجازت دیجئے کہ کچھ غزلوں سے چند منتخب اشعار عرض کردوں:-

دیکھتے دیکھتے دن ڈوب گیا رات ہوئی
ترے قدموں کی صدا آئی کرامات ہوئی

میں یہ کہتا ہوں بچھاؤ کوئی بازی اب اور
بازیٔ عشق تو سب کھیل چکے مات ہوئی

یہ ستاروں کی شعاعیں یہ ہوائیں یہ دل
اب ترے درد کو نیند آنے لگی رات ہوئی

———

اب نشاطِ حیات دو نہ یاس
وصل کی رات اور اتنی اُداس

یہ دھڑکتا ہوا دلِ فطرت
یہ قضا کا تموّجِ انفاس

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس

———

مجھ کو تیرا پتہ نہیں ملتا
ڈھونڈنے سے خدا نہیں ملتا

ایک مدت سے عشق ہے بے صبر
کوئی صبر آزما نہیں ملتا

ساغرِ زہر ہو کہ جامِ حیات
اس کے ہاتھوں سے کیا نہیں ملتا

———

بندگی سے کبھی نہیں ملتی
اس طرح زندگی نہیں ملتی

آہ وہ مشک بیز زلفِ سیاہ
جس کی ہمسائگی نہیں ملتی۔

یوں تو ملنے کو مل گیا ہے خدا
پر تری دوستی نہیں ملتی

ایک دُنیا ہے میری نظروں میں
پر وہ دنیا ابھی نہیں ملتی

———

اک سوا آپ کے اس دل میں گذر کس کا تھا
آپ آئے ہی نہیں ورنہ یہ گھر کس کا تھا

تم سے پہچانے نہ جاتے تھے خود اپنے جلوے
تمکو معلوم ہے وہ ذوقِ نظر کس کا تھا

خود گیا اور جلو میں چمنستان گئے
برگ ہر لالہ و گل رختِ سفر کس کا تھا

———

کہہ گئی لہلہا کے قوسِ قزح　　داستاں تیری نوجوانی کی
آنکھ میں موجِ بادۂ شیراز　　شان ابرو میں ترکمانی کی
کھینچ دی اس کی خامشی نے فراقؔ　　ایک تصویر خوش بیانی کی

سر بسر ہے وہ سمیٹے ہوئے رنگینیِ حسن　　نگہِ شوق کے دامن میں تری کیسی ہے
اور لوگوں کے خطوں کے تو جواب آتے ہیں　　نامہ بر آہ تری نامہ بری کیسی ہے
کس کے آنسو شبِ غم جذب ہوئے اس میں فراقؔ　　آج یہ خنکیِ بادِ سحری کیسی ہے

آدمی آدمی کو بھول گیا　　زندگی زندگی کو بھول گئی
"اتفاقات ہیں زمانے کے"　　دوستی دوستی کو بھول گئی

اُٹھ گئی دوست کی نگاہِ کرم　　شرم سے عشق پانی پانی ہے
اک قیامت ہے چھیڑنا اس کو　　ارے دنیا بڑی دوانی ہے
ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں فراقؔ　　زندگی، ہجر کی کہانی ہے

ایک مست شباب کی باتیں　　جیسے موجِ شراب کی باتیں
عرش والے ادب سے سنتے ہیں　　عشقِ عالیجناب کی باتیں!
خم بہ خم زلف سے سُنے کوئی　　عشق کے پیچ و تاب کی باتیں
کہہ رہے ہیں نجوم رات گئے　　اک پریشاں خواب کی باتیں
آپ بھی خواب دیکھتے ہیں فراقؔ　　"وقتِ پیری شباب کی باتیں"

جب خطا عشق کی ہوئی مجھ سے　　زندگی روٹھ کر ملی مجھ سے
تجھ کو پا کر خوشی سے مر نہ گیا　　بس یہی تو ہوئی کمی مجھ سے
نگہِ ناز تری کچھ لے دوست　　کہہ رہی تھی ابھی ابھی مجھ سے
عشق پہ درگزر کرو نہ کرو　　اب تو اک بات ہو گئی مجھ سے
نگہِ شرمگیں پہ اپنی نہ جا　　بے تکلف نہیں ابھی مجھ سے

جب مجھے تری یاد آتی ہے　　آس بندھ بندھ کے ٹوٹ جاتی ہے
تیری رودادِ حسن میری غزل　　داستاں داستاں سناتی ہے

معجزہ انقلاب کا دیکھو! ۔۔۔ موت بھی زندگی لٹاتی ہے
دیکھ رنگیں نوائیوں سے مری ۔۔۔ شفقِ صبح لہلہاتی ہے

ایک برقِ بلا کو دیکھا ہے ۔۔۔ حسنِ تابِ آزما کو دیکھا ہے
کیا تعلق تری اداؤں سے ۔۔۔ موجِ بادِ صبا کو دیکھا ہے
حسن اُس کا ہے میری نظروں میں ۔۔۔ مجھ سے پوچھو، خدا کو دیکھا ہے
کوئی نکلا ہو جیسے چھپ کے فراقؔ ۔۔۔ دل میں اک نقشِ پا کو دیکھا ہے

جل جل کر آ کاش دیپ بجھ گئے فراقؔ ۔۔۔ پو پھٹتی ہے جیسے برہن کی چھاتی

ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں نیند نہ آئے تو اشک بہائیں
ایک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں لے دل رو رو کے سو جائیں
حسن ہے ایک زیبا سفتہ یا اک بے سونگھا ہوا پھول
ہوش فرشتوں کے بھی اڑا دیں یہ تیری دوشیزہ ادائیں
اہلِ مسافت ایک رات کا یہ بھی ساتھ غنیمت ہے
کوچ کرو تو صدا دے دینا ہم نہ کہیں سوتے رہ جائیں
محکمِ گناہ و ثواب سے مطلب لیکن عشق میں اکثر آئے
وہ لمحے خود میری ہستی جیسے مجھے دیتی ہو دعائیں
ایک غزالِ رم خوردہ کا منہ پھیرے ایسے میں گزرنا
جب مہکی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں دان ڈوبے آنکھیں جھپکائیں
جسمِ نازنیں میں سنتا پا نرم لویں بل کھائی ہوئی سی
بزمِ ناز میں تیرے آتے ہی جیسے کئی شمعیں جل جائیں
سا اپنے دل سے غافل رہنا اہلِ عشق کا کام نہیں
حسن بھی جس کی پرچھائیں ہے آج اُس من کی جوت جگائیں
باتیں اُس کی یاد آتی ہیں لیکن مجھ پر یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پہ اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں
ہر اک کام مکمل ہو کے کوئی کمی رہ جاتی ہے
ہے بھرپور زندگی لیکن تجھ کو کہاں سے ہم پہنچائیں

دھوکے نہ کھانا اہل محبت سب سے بڑا یہی دھوکا ہے
پریت جگت کی ریت یہی ہے سب بھولے دھوکے کھائیں
رات چلی ہے جوگن ہو کر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے چھپے ذرا دیر تو ناگن پر تاروں کے دیپ بجھیں ہم بھی سو جائیں

اب تو آپ ادب کہتے ہوں گے اس لئے شعر خوانی ختم۔ میری کتاب اردو غزل گوئی جسے آپ نے سال ہی میں شائع کیا ہے اس میں بہت شد و مد سے میں نے اردو شاعری میں اہم ترین جگہ غزل کو دی ہے۔ لیکن آج ایسا کہتے میں ذرا ہچکچاؤں گا۔ اس خط میں یوں تو میں آپ کو غزلیں سنا رہا ہوں لیکن نیم شعوری طور پر یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش میں میتھیو آرنلڈ کی نظم سہراب اور رستم یا MEMORIAL
VERSES یا ٹینی سن کی نظم MORTE DE ARTHUR یا کیٹس کی نظم LABELLEDAMS
SANSMERCY. اور ODE TO ANTUMN یا اوشانسی کی نظم WE ARE THE
MUSIC MAKERS یا براؤننگ کی نظم EPILOGUE TO OSLANDO اور THE LAST RIDE
TOGETHER یا کپلنگ کی نظم IF اور LEST WE FORGET اور انگریزی شاعروں کی صدہا نظمیں
جو میرے ذہن میں گونج رہی ہیں اس طرح یا اس شان کی ستراسی نظمیں بھی اردو کو دے سکتا۔ لیکن ہائے ہائے حالت یہ ہے کہ ہم اس قسم کی منظوم اور کیسی خوبیوں کی حامل صحافت کر کے مثلاً "ہم آج طبعاً کر رہے ہیں" یا اس قسم کے چند منظوم دلچسپ ٹٹکلے پیش کر کے کہ چاولوں کے چہرے پر مفلسی برستی ہے" لہک کر اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ میری چند نظمیں بھی منظوم صحافت سے آگے نہیں بڑھ سکیں لیکن میں انہیں عہد آفریں تخلیقیں نہیں سمجھتا۔ جیران و دلچسپ ذہنی ADOLOSCENTS کو چھیڑ گئے کالیداس کی شکنتلا یا تلسی داس کی رامائن یا حافظ کی غزلوں یا مولانا روم کی مثنوی جس عظمت کا ثبوت دیتی ہے اس ادبی عظمت کا ثبوت، مایکاوسکی یا نرودا ہیں۔ اگرچہ ان کے کارنامے بھی بہت پُر عظمت ہیں نہیں دے سکے۔ لیکن میں اسے ناممکن نہیں سمجھتا کہ کمیونسٹ ادیب آئندہ ایسی عظمت کا ثبوت دے سکیں گے۔ میں خود ان کمیونسٹ ادیبوں کی خاک پا ہوں بلکہ اس سے بھی کم جن کے نام میں نے ابھی گنوائے ہیں مگر اسے کیا کروں کہ انہیں ان ادیبوں سے فرو مایہ پاتا ہوں جو کمیونسٹ نہیں تھے اور جن میں سے کچھ کے نام پہلے گنا چکا ہوں۔

میری ان باتوں سے کمیونسٹ تحریک اور مارکسی ادب کی تحریک کو بجائے نقصان پہنچنے کے فائدہ پہنچے گا۔ آج کا کوئی نمک حلال ادیب مارکس کی تعلیم و پیغام کو نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن جہاں اس تعلیم و پیغام سے اس کے وجدان کو بہت سی روشنیاں اور محرکات ملیں گے لیجے کی عظمت و شرافت، طہارت قلب، تخیل کی الوہیت، ماسفتیں اور سرمدی کیفیتیں دنیا کی کئی ہزار برس پرانی زندہ جاوید آفاقی ادبی مثالوں اور روایتوں سے سیکھنا پڑے گا۔ ہم تلسی داس، کالیداس، ڈانٹے، ورجل اور دوسرے صدہا اکابر ادب کے کچھ مخصوص عقیدوں کو غلط سمجھنے کے باوجود ان کے رچے ہوئے مزاج، شائستگی و تہذیب قلب اور ان کی انسانیت کو رچ کر یا اس سے بے نیاز رہ کر صرف زور طبع و زندہ کمیونزم و مارکسزم کے بوتے پر بڑا ادب نہیں پیدا کر سکتے۔ کمیونسٹ روس اور کمیونسٹ چین میں شیکسپیئر کے ڈرامے اس لئے کثرت سے نہیں کھیلے جاتے کہ اب سے کئی سو برس پہلے کے عقائد سے عوام کو روشناس کرایا جائے بلکہ اس لئے کھیلے جاتے ہیں کہ ان میں انسانیت کی وہ جگمگاتی ہوئی قدریں ہیں جو فیوڈل ازم، مرکنٹائل ازم، کیپٹل ازم اور کمیونزم یا تہذیب کے ہر جگ میں یکساں مقبول و محبوب و محترم رہیں گی۔ تنگ نظری، SELF SUFFICIENCY اور EXCLUSIVENESS ادب، تہذیب، انقلاب، کمیونزم سب کے لئے مہلک ہے۔ البتہ برائے نام عقیدہ مندی جھک مار نیاز مندی یا اکابر سلف کے کاندھوں پر سوار ہو کر اپنے چھوٹے قد کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش

بھی یا بڑوں کو معکدیں قبولیت سے نوازنے کی کوشش کسی ادیب کے لئے بھی خطرناک خامکاری ہے۔

ادیب کی شخصیت میں عشق حیات وکائنات کا کارفرما ہونا کامیابی کی شرط ہے اور یہ عشق محض درس عمل نہیں دیتا اس میں ایک خلاقانہ اضطراب ایک من کو موہ لینے والی مجہولیت یا WISE PASSIVENESS بھی ہوتی ہے۔ اس عشق میں عملی مقاصد کے علاوہ ہمہ گیر عملی قدروں کے علاوہ ایک ماورائی وجدانی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ ہندو دیومالا میں خالق کائنات برہما کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو عاشق کائنات وشنو کا مرتبہ ہے۔

ہمارے شہر الہ آباد میں ہندی کی ایک شاعرہ کوکل جی ہیں جن کی یہ نظم بہت مشہور ہے

آج رات سنگار کروں گی
کھلے چپول سا جوبن لیکر
کانٹوں کے بن پار کروں گی

انھوں نے مجھے اپنی ایک لاجواب نظم سنائی جس میں سیکڑوں مصرعے تھے اور جس کا عنوان تھا "ماں" (یعنی بیاہی جانے والی بیٹی کا رخصت ہوتے ہوئے ماں سے خطاب، نظم سن کر میں جھوم گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ان سے کہا کوکل جی اس امر میں آپ بھی میری ہم خیال ہوں گی کہ شاعر کو اپنے کلام کے ذریعہ سماج کی سیوا اور انسانوں کے دکھوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کوکل جی نے کہا آپ سچ کہتے ہیں لیکن اگر ہم صرف سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی مسائل کے ہو رہے تو ہم اخلاقی طور پر گر جائیں گے۔ مناظر قدرت اور انسانی زندگی کا وہ پہلو جس میں خدمت سے قطع نظر محبت اور پیار کی دعوت ہمیں ملتی ہے اگر ہم اس سے بے نیاز ہو گئے تو پھر ہمارے پاس رہ کیا گیا۔ ادب کو صرف درس عمل ہو کر نہیں رہ جانا چاہئے اگرچہ درس عمل بھی ادب کو ہونا چاہئے

میں نے کہا کوکل جی آپ نے بالکل میرے عقیدے کو دہرایا ہے۔ اس گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے، ہیولاک ایلس کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے جسے انہوں نے اپنی کتاب رقص زندگی میں درج کیا ہے "فن اخلاق سے زیادہ اخلاقی ہوتا ہے"

ART IS MORE MORAL THAN MORALITY

یہ خط بہت طویل ہو گیا۔ بلکہ دو غزلہ کی رعایت سے دو خطا، اچھا اب رخصت۔ لیکن وہ دیدیں والی بات تو کہہ چھوڑے جا رہا ہوں۔ بات بھولی بھی تو کون سی!

آپ کا
فراق

(۳)

۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء

برادرم۔ ایک بار نقوش ہی کے صفحات میں ہم لوگوں نے اسلامی ادب کی بحث چھیڑ دی تھی اور یہ شرارت صرف آپ کی تھی اس سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اسلامی عناصر کو ادب میں جگہ دینے کے خلاف ہوں۔ آیئے آج پھر اسلامی ادب کے فقرے کو سمجھنے کا جتن کریں۔ کیا اسے یوں سمجھا جائے کہ ساڑی، سہاگ کا ٹیکہ، گنگا اشنان، دیپاولی، بنارس کی کچوریاں، ادب میں آئیں تو وہ ہندو ادب ہوگا اور اگر پائنچہ، سرمہ مہندی، حج، جشن عید، کباب و کوفتے، ترکی ٹوپی، کا ذکر ادب میں آئے تو وہ اسلامی ادب ہوگا؟ جہاں تک تمدنی کلچر کا تعلق ہے وہ

ملتی لندن میں بھی پہنی جاتی تھی ترکستان میں اور تقلیداً پان اسلام ازم کے طفیل میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقے میں۔ پیغمبر و اکابر اسلام سے اس ٹوپی کا کوئی تعلق نہیں البتہ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سرسید کی زینت فرق ترکی ٹوپی تھی لیکن سرسید کے چہیتے حالی نے حتاادب سمجھ کر اپنے پیر و مرشد کی نقل نہیں کی ——— اس لطیفے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ جن ملکوں کی آبادی قریب قریب سو فی صدی مسلمان ہے وہاں کی ہر چیز اور ہر بات کو ہم اسلامی سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان ملکوں کی تہذیب میں بہت سے غیر اسلامی عناصر شامل ہیں۔

جب اپنی کئی تحریروں میں میں نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اردو ادب میں ہندوستان کی تہذیب و زندگی کو زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر جلوہ گر ہونا چاہئے تو پاکستان کے کچھ دوستوں نے یہ آواز اٹھائی کہ پاکستان کے ادب کو صرف پاکستانی ادب نہیں بلکہ اسلامی ادب ہونا چاہئے۔ شاید اس لئے کہ مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ کے قریب ہندو ہیں اور وہاں کے مسلمان بھی رہن سہن اور زندگی کی ۹۵ فی صدی باتوں میں وہاں کے ہندوؤں کے جتنے قریب ہیں مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے اتنے قریب نہیں اور خود مغربی پاکستان میں پٹھانوں، پنجابیوں اور سندھیوں کی زندگی میں بہت کم مماثلت ہے۔ اسلامی ادب کے فقرے میں لفظِ اسلامی کو ایک ایسا معجزہ سمجھا گیا جو نسلی و مقامی یا جغرافی کی خصوصیتوں کو مٹا کر رنگارنگ زندگی کو ایک رنگ میں رنگ دے گا۔ شاید میرے عزیز دوست حسن عسکری اور آفتاب احمد صاحب کا بھی کچھ ایسا ہی خیال و گمان رہا ہے۔

اسلام ایک بہت بڑی حقیقت بہت بڑی قوت اور بہت بڑا انقلاب رہا ہے۔ عربی، فارسی، ترکی اور اردو ادب اسلام کی روایات سے معمور ہیں اور شاید اس حد تک معمور ہیں کہ اب انہیں غیر اسلامی عناصر سے مزید نشو ونما حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور یہی ہو بھی رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کے وہ عناصر جو اب تک اردو ادب میں نہیں آسکے یا اچھی شکل میں نہیں آسکے آئندہ نہ لائے جائیں۔ ایسے عناصر فلسفیانہ، متفکرانہ، اخلاقی ہوں گے۔ رہن سہن یا خارجی زندگی کے جزدیات سے ان کا تعلق زیادہ نہیں ہوگا اور یہ جزدیات جیسے اور جتنے آسکتے تھے آ بھی چکے ہیں۔ رہے مناظرِ قدرت سو وہ مقامی یا جغرافیائی ہوتے ہیں اسلامی نہیں ہوتے۔ پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کے مسائل اسلامی کم ہیں انسانی اور اقتصادی زیادہ ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی منظم کوششیں یا جدوجہد سیاسی، اقتصادی، صنعتی، حرفتی، علمی ہوں گی نہ کہ اسلامی۔ اس لئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ابھی بہت سی قیمتی چیزیں اسلام اردو ادب کو دے سکتا ہے تو بھی پاکستان کے اردو ادب میں مقامی اور عالمی عناصر مکانی و زمانی یا عصری عناصر کو اسلامی عناصر سے کہیں زیادہ اہمیت ہوگی اور یہ اہمیت پاکستان کے اردو ادب کو مل رہی ہے اور ملتی جائے گی۔ ہندوستان کا حقیقی جدید اردو ادب بہت حد تک یا اکثر سو فی صدی حد تک پاکستانی ادب ہوگا اور پاکستان کا اردو ادب ہندوستانی ادب ہوگا۔ بقول پاکستان ہی کے ایک شاعر کے

دوستو ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر

پاکستان کے مناظر سے مہنجوڈارو اور ہڑپا سے، پاکستان کے شہروں سے وہاں کی صنعت و حرفت سے اتنا ہی لگاؤ ہندوستانی کو ہوگا جتنا پاکستانی کو۔ دنیا اب ایک عالمی حکومت کی طرف گامزن ہے۔ ہماری جنگِ آزادی سوشلسٹ انقلاب کی شکل نہیں اختیار کر سکی اسی سے ایک قوم اور ایک ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ اب لوگ ایک زبان و ادب کو بھی دو ٹکڑے کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ حالی و اقبال ہندوؤں کی بھی ملکیت ہیں۔ ٹیگور اور پریم چند مسلمانوں کی بھی ملکیت ہیں۔

اب ہندوستان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور کیفیتوں کو اردو ادب میں زیادہ سے زیادہ جگہ دینے کی ضرورت کو لیجئے۔ اس سلسلے

میں تین نام ذہن میں لائیے۔ نظیر اکبرآبادی، پریم چند اور راقم الحروف۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی اور نام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ ہم لوگوں کی کوششیں ہندوستانی زندگی کو اردو ادب میں زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے اور اُبھارنے کی رہی ہیں۔ البتہ ایسا ہونے میں ہندوؤں کی زندگی کے مخصوص جلوے زیادہ نظر آئیں گے اس لئے ہرگز ہرگز نہیں کہ ہندو اکثریت میں ہیں بلکہ اس لئے کہ کئی لحاظ سے ہندو زندگی زیادہ رنگا رنگ اور پہلودار ہے خارجی اور داخلی دونوں لحاظ سے۔ یہ رنگا رنگی اور پہلوداری اردو ادب میں اسی طرح آ جانا چاہئے جس طرح وہ سنسکرت، پالی، بنگالی، ہندی، ماگدھی، اُڑیا، پنجابی، مراٹھی، گجراتی اور جنوبی ہند کی زبانوں میں ملتی ہے۔ ہندو زندگی جذباتی رشتوں ASSOCIATIONS سے مالا مال ہے۔ ان ASSOCIATIONS کو اپنا لینے سے مسلمان بہتر مسلمان بن جائے گا گھٹیا مسلمان نہیں بنے گا۔ اسلام کے جذباتی رشتوں کو اپنا کر ہندو بہتر ہندو بنے گا گھٹیا ہندو نہیں بنے گا۔ میری نظم جگنو نقوش ہی میں شائع ہوئی تھی ہنڈولا سیارہ میں شائع ہوا تھا روپ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ ان سب میں بہت سے ان جذباتی رشتوں کا اظہار ہوا ہے جو ہندو زندگی کی رنگا رنگی اور پہلوداری کو آئینہ دکھاتے ہیں لیکن جو مسلمانوں کو بھی وجد میں لاتے ہیں۔ ہمارا خون ایک ہے مغائرت کہاں تک ممکن ہے!

ہمارا ملک ہندوؤں کی ملکیت نہیں ہے نہ مسلمانوں کی۔ یہ ملک بنی نوع آدم کی مادرِ وطن ہے۔ آج بھی ہمارے سینوں میں تہذیب کی پہلی صبحیں سانس لے رہی ہیں ہمارے شعور پر خلقت کی دائمی ازلیت آج بھی منڈلا رہی ہے۔ ہمارا اکفرایمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے کائنات وانسانیت کی وحدت کے تصور سے آج بھی ہماری پلکیں نم ہو جاتی ہیں۔ بدھ کے جگر، کرشن کی بنسی، مندروں کے گھنٹوں کی آواز اور اذان کی آواز سے ہمارے ملک کی فضا گونجی ہوئی ہے۔ زندگی ریاستی یا سیاسی جھگڑوں سے بڑی حقیقت ہے اور ادب بھی دو قوموں کی تھیوری سے بڑی چیز ہے۔

البتہ ہندوستان یا پاکستان کے ادب کو ہم غلطی سے ہندو ادب یا اسلامی ادب بناتے اور بنانے کی کوشش کریں تو کم از کم ایک غلطی نہ کریں یعنی اس ادب کو باہم رجز خوانی کا آلہ یا حربہ نہ بنائیں۔ اس ادب کے ذریعہ سے دوسری قوموں کو چیلنج یا چنوتی نہ دیں اور اس ادب کو کا غذیا دفتی کا ایسا پردہ نہ بنائیں کہ ہم وطنوں پڑوسیوں اور دنیا کی زندگی کو دیکھنے جاننے اور اپنانے کا امکان ہی مٹ جائے۔ بڑا ادب کسی قوم کے اپنی کھال میں مست رہنے کا ادب نہیں ہوتا۔ اس میں آفاقیت و مقامیت کا سنگم ہوتا ہے۔ علیحدگی SEPARATISM قوموں تہذیبوں اور فنون کے لئے موت کا باعث بن جاتی ہے۔ ہم ہندوستانی ضرور ہیں لیکن کرۂ ارض یا کائنات کے بھی شہری ہیں۔

یہ خط خط کا ہے کہ میرا ایک وعظ بن گیا یہ سوچ کر کچھ شرم سی محسوس ہونے لگی کہ میں دوسروں کا ناصح مشفق بننے والا کون یا مانی جانی ہوئی حقیقتوں کو ایجاد بندہ کر کے پیش کرنا کہاں کی عقلمندی ہے! اس لئے معذرت کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ بعض باتیں غور طلب ہیں۔ کہئے تو غور کر لوں۔

آپ کا

فراق

(۴)

۸ بنک روڈ۔ الٰہ آباد

۳۱ دسمبر ۱۹۵۵ء

برادرم۔ آج سال ختم ہو رہا ہے۔ انگریزی میں پرانے سال کی رخصت اور نئے سال کی آمد پر ٹینی سن کی نظم مشہور ہے۔ اردو میں اس موضوع پہ کوئی نظم دھیان میں نہیں آتی۔ اتفاق سے اپنی ایک نظم "تلاش حیات" کا خیال آ گیا۔ اس نظم کے آغازی ٹکڑے سنئے ✕

مہر کے گرد یہ زمیں　　کر چکی اِک طواف اور
قلبِ زماں مکاں میں آج　　پڑ گیا اِک شگاف اور

گُنگ و جمن نے کروٹیں　　بدلیں چمکتے درد سے
ملتی ہیں رات کی رُتیں　　موجِ ہوائے سرد سے

ایک چھپی ہوئی لکیر　　شرق سے دے رہی ہے لَو
کانپتے ہیں کرن کے تیر　　پھوٹتی ہے سنہری لَو

نیند کے آبشاروں سے　　چونک کے آنکھیں کھول دیں
چشمے اُچھل اُچھل پڑے　　نہریں اُبل اُبل پڑیں

ہند کے گھونگھٹوں تلے　　کیسی سہانی آگ ہے
ماں کے دمکتے ماتھے پر　　آج نیا سُہاگ ہے

نورونہ کے تصور سے متاثر ہو کر ہمارے کچھ اور شعراء بھی اس موضوع کو میں چاہتا ہوں کہ اُجاگر کریں۔

آج ایک عجیب خیال نہ جانے کیوں میرے دماغ میں آیا۔ جرمن شاعر گیٹے نے کالیداس کی شکنتلا کی جن الفاظ میں مدح سرائی کی ہے دُنیا کے کسی ادبی شاہکار کی ایسے الفاظ میں تعریف نہیں کی گئی۔ وہ کہتا ہے۔ کہ پورے آفاق کی حقیقتوں کو ایک لفظ میں اگر میں بیان کر دینا چاہوں تو اے شکنتلا میں تیرا نام لے لوں گا اور تمام حقیقتوں کا اظہار ہو جائے گا۔

شکنتلا ایک ہمہ گیر علامتی SYMBOLIC تخلیق ہے۔ دیکھیں اس میں ہمارے زمانے کے واقعات کی پیشین گوئی ملتی ہے یا نہیں۔ رشی کے آشرم کو اشتراکی ممالک تصور کیجئے اور رشی کی ریاضت کو اشتراکی انقلاب کی جدوجہد سمجھئے۔ شکنتلا کو اشتراکیت سمجھئے۔ مہاراجہ دشینت کا شکار کے دوران میں شکنتلا کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جانا دوسری جنگِ عظیم میں امپیریلسٹ ممالک کا سرمایہ دارانہ حکومتوں کا مجبوراً رُوس کا ساتھ دینا تصور کیجئے۔ شکنتلا اور دشینت کی شادی کو جرمنی کی شکست اور روس اور اُس کے ساتھیوں کی فتح جانئے۔ پھر دشینت کا شکنتلا کو بالکل بھول جانا اور ایک بددعا کے زیر اثر شکنتلا کو دربار سے نکال دینا۔ پھر شکنتلا کا بن باس اسے وہ ٹھنڈی جنگ ColdWAR یا بین الاقوامی تناؤ (TENSION) سمجھئے جس کا مظاہرہ دنیا میں ہو رہا ہے۔ پھر بعد کو شکنتلا اور دشینت کا ملاپ ہم وجودی CO-EXISTENCE کے اصول کی امن کے آدرش کی اور اتحادِ عالم قائم کرنے کی کوششوں کی کامیابی اور فتح سمجھئے۔

اس طرح شکنتلا چند کرداروں کا ڈرامہ ہوتے ہوئے تاریخ کے سب سے اہم دَور کا ڈراما بن جاتا ہے۔

آج کے خطبہ میں کچھ ایسی ہی چلتی پھرتی باتیں کہوں گا۔ میں اس امر سے اچھی طرح واقف ہوں کہ متعدد ادبی کارناموں سے کبھی کبھی اجتماعی عمل اور جدوجہد کا سیلاب آ گیا ہے۔ جس سے قوموں کی زندگی بدل گئی ہے اور تاریخ عالم سیراب و شاداب ہوئی ہے۔ لیکن عمل کا محض خارجی

تخصیصی، یا محض مادّی لحاظ سے سیاسی و اقتصادی لحاظ سے فائدہ رساں تصوّر نامکمل اور ناقص تصوّر ہے۔ یہی دُوسرے فنونِ لطیفہ کے بارے میں کہوں گا۔ شاہکارانہ مصوّری، سنگ تراشی، بیتھوون کی نویں سمفونی، شیکسپیئر کے ڈرامے، اجنتا کا فن، یا فطرت کی فن کاری مثلاً نغمۂ طیور، قوسِ قزح، آبشاروں کا نغمہ۔ پرِ طاؤس، ہرن کی آنکھ، پھولوں کی رنگینی و خوشبو، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، ہمالہ کی تمکنت، تاروں بھری رات، صحراؤں اور ریگستانوں کی منظری عظمتیں اس لحاظ سے مقصدی یا افادی نہیں ہوتیں کہ ہم اجتماعی یا انفرادی جدوجہد میں لگ جائیں۔ جہاں مہذب عملیت سماج کے لئے ضروری ہے وہاں مہذب مجہولیت بھی سماج کے لئے ضروری ہے۔ بہر کیف وہ اثر تحریکِ عمل نہیں ہے۔ عمل کی اہمیت مانتے ہوئے بھی تاثر برائے تاثر یا خالص وجدانی کیفیت برائے وجدانی کیفیت، احساسِ جمال برائے احساسِ جمال کی اہمیت بھی ماننا پڑتی ہے۔ ادب برائے ادب، فن برائے فن کے فقرے ذرا بدنام ہو چکے ہیں لیکن تاثر برائے تاثر برائے عمل نہیں محض برائے تاثر یا اس وجدانی جمالیاتی معجزے کا احساس جیسے ورڈزورتھ یوں بیان کرتا ہے: ۔

THE LIGHT THAT NEVER WAS ON LANDOR SEA,

THE CONSECR ETATION ANDTHE POET,S DREAM.

ہماری زندگی کی ایک ایسی داخلی ضرورت ہے جس کی تشفی ضروری ہے اور جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خارجی عمل سے قطعِ نظر کر کے داخلی طور پر زندگی کو رچانے اور سنوارنے کا کام کم اہم نہیں ہے۔ احساس برائے احساس کوئی انحطاطی یا کھوکھلا سلوگن نہیں ہے اور نہ یہ نعرہ رجعت پسندانہ نعرہ ہے۔ ہم ہر طرح کی قربانی کر کے کڑی سے کڑی ایسی محنت کر کے جس سے سماج پھلے پھولے اچھے آدمی ضرور بنتے ہیں لیکن بے خارجی عمل اور بے ایثار کے بھی احساسِ جمال یا وجدانی کیفیت حاصل کر کے ہم شاید اور اچھے آدمی بن جاتے ہیں۔ عمل کی ایک نفعی حیثیت ہوتی ہے یعنی کسی برائی کو مٹانا، خارجی یا مادی کمی کو پورا کرنا یا حاجت روائی۔ وجدانی کیفیت کی اثباتی حیثیت ہے وہ اتنا برائی دُور نہیں کرتی جتنا اچھائی کو بہتر بناتی ہے۔ سماج کی وہ تمام اچھی قوتیں جو عمل کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں انسان کو اچھا بناتی ہیں بغیر فنونِ لطیفہ کی مدد کے بھی۔ فنونِ لطیفہ اس عملی اخلاق نیکی اور اچھائی میں لطافتِ احساس کا اضافہ کر دیتے ہیں۔

جان سٹوارٹ مل کی تمام زندگی بہتر سے بہتر انسانی سماج بنانے کی کوشش میں صرف ہوئی لیکن وہ اپنی خواہشوں اور کوششوں کی کامیابی کو یقینی مان کر بھی خودکشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ عین اسی وقت ورڈزورتھ کی نظموں کی جلد اس کے ہاتھ لگی جس کا اثر یہ ہوا کہ عملی لحاظ سے غیر مقصدی طور پر اسے کائنات و حیات کے جمال کا احساس ہوا اور وہ خودکشی سے باز آ گیا۔ کیا میں ایسی باتیں کر رہا ہوں جسے تصوف یا عینیت کہہ کر ٹال دیا جائے؟

بھرپور کوشش سے کوئی کمیونسٹ یا اشتراکی سماج بیس پچیس پنج سالہ منصوبوں کی جب تکمیل کرے گا تو سارے خارجی عمل اور عملی مقاصد مشین پورے کرنے لگے گی۔ انسانی خارجی عمل سکڑتا جائے گا یا بقول اسٹالن پوری قوم انجینئروں کی قوم بن جائے گی۔ اس وقت فنونِ لطیفہ ہمیں پیغامِ عمل نہ دیں گے وجدانی کیفیتیں اور احساساتِ جمال دیں گے۔

اس لئے اگرچہ ہمیں ادب کے سلسلے میں مقصد کا لفظ کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو خارجی مقصد کے علاوہ داخلی یا وجدانی یا کیفیتی مقصد کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسی داخلی مقصد کو مدِّنظر رکھ کر ادب برائے ادب یا فن برائے فن کا اصول ماننا پڑے گا یعنی ادب برائے زندگی اور ادب برائے فن کے تضاد و تصادم کو مٹانا پڑے گا۔

لاہور میں سردی کیسی پڑ رہی ہے۔ ان خطوں میں جو کام کی باتیں نکلیں۔ انہیں بے شک چھاپ دیجئے۔ میں اپنی صحت کی طرف سے مایوس ہو کر اب کچھ بے نیاز سا ہو چکا ہوں۔

آپ کا ذاکر

کنہیا لال کپور

صاحب

شخصیت نگاری کے دو جانے پہچانے اسکول ہیں۔ پہلا تو وہ جس کے متعلق ایک واضح اشارہ میرؔ کے اس شعر میں موجود ہے ؎

پرستش کی اتنی کہ اے بُت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

اور دوسرا وہ جس نے شاعر سے یہ مصرعہ کہلوایا: ؏ سرون کا، منہ بپا زکا، لنگور کی گردن!

طفیل صاحب نے کہ جو ہمیشہ نئی ڈگر پر چلنے کے عادی ہیں، ایک تیسرے اسکول کی داغ بیل ڈالی ہے۔ ان کے اسکول کے لئے داغؔ کا یہ مصرعہ موزوں رہے گا: ؏ بچ کر کہاں یہ جائیں گے ایسے کہاں کے ہیں!

طفیل صاحب آئے دن نیا طلسم توڑتے ہیں جب یہ کچھ بھی نہیں تھے تو ہم سمجھتے تھے کہ یہ ہمیشہ کچھ نہیں رہیں گے۔ دیکھتے دیکھتے یہ بہت بڑے ناشر بن گئے۔ خیال تھا کہ اب ساری عمر ناشر ہی رہیں گے لیکن یک لخت جو انھوں نے سنبھالا لیا تو اچھے خاصے کیا، معرکے کے ایڈیٹر بن گئے۔ اطمینان کا سانس لیا کہ اب اس سے زیادہ کچھ نہ بن سکیں گے لیکن ایک بار پھر مایوسی ہوئی طفیل صاحب ایک کامیاب شخصیت نگار بن گئے۔ اب ڈر یہ لگ رہا ہے کہ خدانخواستہ کسی دن شاعر بن گئے تو "ادارۂ فروغِ اردو"، "نقوش" اور "شخصیت نگاری کا یہ تیسرا اسکول" کہاں جائیں گے!

طفیل صاحب نے کتاب کا نام رکھا ہے "صاحب" بادی النظر میں کتنا عجیب نام ہے لیکن اگر آپ غالبؔ کا مشہور شعر ذہن میں رکھیں تو اتنا عجیب بھی نہیں ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

میرے خیال میں اس کتاب کے بہت سے اور نام بھی ہو سکتے تھے مثلاً:

"من خوب می شناسم"
"تکلف برطرف"

"حجابوں کا پردہ اٹھا دیجئے گا"

"پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"

"اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا"

شاید بہترین نام "نقوش" ہوتا۔ لیکن وہ اس لئے نہیں رکھا کہ نقوش طفیل صاحب کے رسالے کا نام ہے۔

طفیل صاحب نے اپنے مطالعہ کے لئے سات مشہور ادبا کا انتخاب کیا ہے۔ پانچ شاعر، ایک افسانہ نویس، ایک مزاح نگار۔ ان ساتوں ادبا سے انہوں نے جی بھر کر پیار کیا ہے اور ان کے ساتھ جی بھر کر گستاخیاں کی ہیں لیکن چونکہ ان کی گستاخیوں میں خلوص ہے اس لئے یہ گستاخیاں کہیں بھی گراں نہیں گزرتیں۔

طفیل صاحب نے جن ادبا پر مضامین لکھے ہیں ان میں سے ہر ایک منفرد شخصیت اور مقام کا مالک ہے۔ عین ممکن تھا کہ ان کی پُر وقار شخصیتوں سے مرعوب ہو کر طفیل صاحب رواداری پر اتر آتے لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں۔

طفیل صاحب کا تکنیک جیمز باوسول (JAMES BOSWELL) اور سٹریچی (STRACHEY) کے تکنیکوں کا دلکش امتزاج ہے۔ باوسول کی طرح ان کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور پرکھنے والا ذہن ہے۔ وہ اپنے ہیرو (HERO) کی ہر بات نوٹ کرتے ہیں، چاہے وہ بات اس کا تکیہ کلام ہو یا اس کی شیروانی کے بٹن۔ لٹن سٹریچی کی طرح اپنے ہیرو کی کمزوریوں اور بوالعجبیوں کو بے نقاب کرنے میں طفیل صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس معاملے میں وہ خاصے بے درد واقع ہوئے ہیں۔ وہ نہ منٹو مرحوم پر رحم کرتے ہیں، نہ فراق گورکھپوری پر——یہاں تک کہ شوکت تھانوی بھی کہ جن سے انہیں عشق کی حد تک محبت ہے ان کی دسترس سے نہیں بچ سکے۔ "شوکت صاحب" میں لکھتے ہیں:

> "ان کی شاعری سے میرا بھی ناک میں دم ہے۔ نہ جانے انہیں اللہ نے ان کی کن بداعمالیوں کی سزا دی کہ شوکت صاحب بھی شعر کہنے لگے۔ شعر موزوں کر لینا ان کا کوئی کمال نہیں یہ تو ہر یو۔ پی میں پیدا ہونے والے کا حصہ ہے اور ان پر ان کا ترنم نورٌ علیٰ نور۔ بالکل ایسے سمجھئے جیسے کوئی یورپین لیڈی اردو کی کوئی غزل گانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس پر بھی آپ مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے۔ میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنم سمیت سُن چکا ہوں۔ اور میں نے دیکھا کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوٹ ہوئے۔"

منٹو صاحب کی انانیت کے بارے میں کہتے ہیں:

> "اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری راہ پاگئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انہوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تعریف کی۔ پرسوں کراچی سے ایک صاحب آئے تھے۔ نہ جانے ان کا نام کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ منٹو صاحب میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں آپ کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔"

جگر صاحب کی ایک دلچسپ کمزوری کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> "جگر صاحب جہاں اور جس شہر میں جائیں واپسی پر وہاں سے اپنی بیگم کے لئے عمدہ عمدہ ساڑیاں اور کپڑے خریدیں گے۔ انہوں نے میرے سامنے اپنی بیگم کے لئے اتنا کپڑا خریدا ہے کہ

کئی بار مجھے خیال آیا کہ کہیں جگر صاحب کی گونڈہ میں کپڑے کی دکان تو نہیں۔ لیکن میں
گونڈہ پہنچ کر اس کی تصدیق کر چکا ہوں کہ ان کی گونڈہ میں کپڑے کی کوئی دکان نہیں اور وہ
جتنا کپڑا خریدتے ہیں بیگم ہی کے لئے خریدتے ہیں۔"

بحیثیت شخصیت نگار طفیل صاحب نے صرف ایک مقصد کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یعنی وہ اپنے ہیرو کی انفرادیت کو اُجاگر کر سکیں۔ اس مقصد میں انہیں توقع سے بڑھ کر کامیابی ہوئی ہے۔ "منٹو صاحب" یقیناً ان کا شاہکار ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایک بار فرمایا تھا کہ خدا نہ بھی آتے تو خدا کے وجود کے لئے صبح کا آنا ہی کافی تھا۔ بعینہٖ اگر طفیل صاحب منٹو کے علاوہ کسی اور ادیب پر مضمون نہ بھی لکھتے تو ان کا لوہا منوانے کے لئے صرف یہی مضمون کافی تھا۔ منٹو کی انفرادیت کو شیشے میں اُتارنا ستاروں پر کمند پھینکنے کے مترادف ہے۔ یہ طفیل صاحب کا اعجاز ہے کہ وہ منٹو کی شخصیت کو اس کی تمام تر لطافتوں، نزاکتوں، کمزوریوں اور لغزشوں کے ساتھ منظرِ عام پر لائے ہیں۔ "منٹو صاحب" کا منٹو خیالی یا مثالی منٹو نہیں۔ یہ وہی منٹو ہے جس کو ہم سب جانتے تھے، چہکنے بہکنے والا منٹو، شراب پی کر دہکنے چہکنے والا منٹو، کسی ادیب کو خاطر میں نہ لانے والا عظیم ادیب، انسان اور سماج کی دھجیاں اڑانے والا بے خوف نکتہ چین۔ منٹو جس کی باتوں میں تلوار کی کاٹ اور لاوے کی روانی تھی۔ منٹو، جو تا دمِ حیات معاشرے سے نالاں رہا اور جس سے تمام عمر معاشرہ نالاں رہا۔ "منٹو صاحب" میں منٹو کے مُنہ سے جگہ جگہ جو فقرے کہلوائے ہیں وہ اس منٹو کی غمّازی کرتے ہیں جس کی باتیں سُن کر بہروں کان بجتے تھے:

"پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اُچھالتے تھے اور فخر سے کہتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔
اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا، نہ
موجودہ پر ہے۔"

"مجھ سے کوئی پوچھے کہ منٹو تم کس جماعت میں ہو، تو عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں، ہر
معاملے میں اکیلا۔ جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔"

"منٹو صاحب" کے علاوہ اس مجموعے کے دوسرے کامیاب مضامین میں شوکت صاحب، فراق صاحب، ندیم صاحب اور جگر صاحب ان سب میں داد اور بے داد کا ایسا خوبصورت توازن ملتا ہے کہ طفیل صاحب کی مردم شناسی کی داد دینا پڑتی ہے۔ شوکت صاحب کی باغ و بہار شخصیت۔ ان کا کھلنڈرا پن، فقرے بازی، ازلی بزدلی، بسیار نویسی، غرضیکہ بحیثیت انسان اور ادیب ان کے جملہ اوصاف اور کمزوریاں ایک مختصر مضمون میں سمو دینا واقعی معنی رکھتا ہے۔ "شوکت صاحب" میں طفیل نے اپنے بے نظیر ہلکے پھلکے انداز میں جہاں بڑی وزنی چوٹیں کی ہیں وہاں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے: "اگر شوکت صاحب مزاح نگار نہیں تو پھر آج کون مزاح نگار ہے؟"

یہ چھوٹا سا فقرہ ایک پورے تنقیدی دفتر پر بھاری ہے۔ میری دانست میں ہمارے تنقید نگاروں نے شوکت تھانوی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے میں آج تک بڑے بخل سے کام لیا ہے۔ بعضوں نے انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ بعضوں نے تعریف تو کی لیکن دبی زبان سے۔ حالانکہ اگر خدا لگتی کہی جائے تو شوکت تھانوی کا مقام ان تمام مزاح نگاروں سے بلند ہے جن کی تعریف میں ہمارے نقّاد آئے دن قصیدے لکھتے رہتے ہیں۔

فراق صاحب پر قلم اٹھانا اور وہ بھی دو مختصر ملاقاتوں کی بنا پر آسان نہیں تھا۔ لیکن طفیل صاحب نے تو شکست تسلیم کرنے کی گویا قسم کھا رکھی ہے۔ فراق کو انہوں نے "من خوب می شناسم پیرانِ پارسا را" کی طرح پہچانا ہے۔ فراق کی ذہانت و فطانت، ان کی انسانیت پرستی، ان کی دختر رز سے بے پناہ عقیدت، امرد پرستی کی بے جا حمایت، بذلہ سنجی، ذرّت نگاہی اور خدا جانے کیا کیا۔ طفیل صاحب نے ایک ہی سانس (یعنی مضمون

میں سب پر تبصرہ کر ڈالا ہے اور کچھ اس انداز میں کہ ہر صفحے سے فراقؔ کی پُراسرار شخصیت اُبھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہتی ہوئی سُنائی دیتی ہے: "میں جو اس سے پہلے تمہارے لئے ایک معمّہ تھا، اب کھلی ہوئی کتاب ہوں۔ مجھے کہیں سے پڑھ لو۔ ہر جگہ فراقؔ (ایک بڑا انسان) ہی پاؤ گے۔"

احمد ندیم قاسمی پر آج تک کوئی اچھا مضمون اس لئے نہ لکھا جا سکا کہ ہر ادیب کے لئے قاسمیؔ کی مسلّمہ شرافت ایک اچھی خاصی نقاب بنی رہی۔ طفیل صاحب پہلے ادیب ہیں جنہوں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر ان کے چہرے سے نقاب سرکائی ہی نہیں بلکہ اسے تار تار کر ڈالا ہے اور نتیجہ کے طور پر ایک نہایت دلچسپ منظر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ قاسمی صاحب ہیں کہ جھینپ رہے ہیں۔ چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے ہزاروں مدّاح ان سے کہہ رہے ہیں: "شاد صاحب! کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ بے نقاب ہونے کے بعد آپ پہلے کی نسبت کتنے خوبصورت نظر آنے لگے ہیں۔ بخدا ہمیں یہ جان کر ازحد مسرت ہوئی کہ آپ کو مسکرانا بھی آتا ہے۔" "آپ کو ہاجرہ بہن سے جذباتی قسم کا لگاؤ ہے۔ آپ جب خفا ہوتے ہیں تو خفگی نبھا نہیں سکتے۔ آپ نے کسی دیہاتی لڑکی سے محبت کی تھی اور "ٹرٹ کر کی تھی" اور آپ کی محبوب غذا حلوہ ہے۔"

جگرؔ صاحب سے طفیل کچھ اس شان سے عہدہ برآ ہوئے ہیں کہ ان کا مضمون پڑھنے سے پہلے اگر جگرؔ کو تعظیم دینے کو جی چاہتا تھا تو اب محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یا یہ کہنے کو چاہتا ہے: "اگر جگرؔ انسان ہیں تو پھر فرشتہ کسے کہتے ہیں؟"

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے عابدؔ صاحب اور احسانؔ صاحب میں طفیل نے کھل کر باتیں نہیں کہیں۔ شاید عابد صاحب کی بزرگی اور احسان صاحب کے جوابی حملے کے ڈر سے انہوں نے ہتھیار ڈال دئیے۔ تاہم ان دونوں مضامین کو ناکام کسی صورت میں نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں بھی حسبِ عادت انہوں نے بڑے مزے کی چٹکیاں لی ہیں۔ احسانؔ صاحب کی غالب فہمی اور عابدؔ صاحب کی متعدد خوش فہمیوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

طفیل صاحب بڑی پیاری اُردو لکھتے ہیں میں نے اس اُردو کا نام "طفیلی اُردو" رکھا ہے۔ علامہ آرزوؔ "خالص اُردو" کے حق میں تھے۔ مُلّا رموزیؔ گلابی اُردو کے موجد تھے۔ طفیل صاحب نے طفیلی اُردو کو رواج دیا ہے۔ یہ وہ اُردو ہے جسے اپنانے کے لئے "بابائے اُردو" اکثر ندا دیا کرتے ہیں۔ ہلکی پھلکی، رواں، دواں، جس پر آمد ہی آمد کا گمان ہو۔ ایسی اُردو جسے سمجھنے کے لئے نہ سر کھجلانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ بغلیں جھانکنے کی۔ طفیل صاحب کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خوبیاں اس کا ایجاز و اختصار اور اس کی تازگی اور شگفتگی ہے۔ شاید "بے ساختگی" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ان کے ہاں شگفتہ مزاح کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے یہ مزاح نگار کیوں نہ ہوئے۔ چند چلتے اور بولتے ہوئے فقرے ملاحظہ فرمائیے:

"الہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور رہے۔ ان میں سے ایک جواہر لال نہرو، دوسرے فراقؔ اور تیسرے امرود!" (فراق صاحب)

"جب ان سے میرا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا تب میری جان میں جان آئی کہ انہیں تو مسکرانا بھی آتا ہے۔" (ندیم صاحب)

"ان کی زندگی میں بڑی یکسانیت ہے۔ یہ جیسے شریف آج سے چودہ برس پہلے تھے ویسے ہی آج بھی ہیں۔" (ندیم صاحب)

"اچھے مزاح نگاروں میں ایک پطرس نامی مزاح نگار گذرے ہیں۔ انہیں ایک بُری عادت یہ تھی کہ سوچتے زیادہ تھے اور لکھتے کم تھے۔" (شوکت صاحب)

"آپ فرسٹ کلاس بزدل ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں۔ اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رلانے پر بھی قادر ہوتے' اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے، علامہ راشد الخیری ہوتے۔" (شوکت صاحب)

"شاعر بیچارے کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ اسے روٹی نہ ملے تو گذارہ کر لیتا ہے لیکن شعروں کی داد نہ ملے تو جیتے جی مر جاتا ہے۔" (عابد صاحب)

"اور لوگ اس بدصورت شخص کی خوبصورت آواز پر آنے کی کوشش کرتے۔" (احسان صاحب)

"یہ بھی اپنے وقت کے اچھے خاصے سودا ہیں۔" (احسان صاحب)

"ایک کبوتر کو دیکھ کر اس کی چار نسلوں تک کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ اس کبوتر کے دادا کا ہاضمہ خراب تھا یا نہیں اور اس کبوتر کی پڑدادی کا اخلاق اچھا تھا یا برا۔"

(احسان صاحب)

اگر میں یہ کہوں کہ طفیل صاحب نے "صاحب" لکھ کر جدید اردو ادب میں اضافہ کیا ہے تو یہ نہایت روایتی بات ہوگی لیکن حقیقت یہی ہے۔ گنج ہائے گراں مایہ، دو ڈاکٹر، شیش محل، خدوخال (مرتبہ فکر تونسوی)، عصمت کا لافانی مضمون "دوزخی" اور "نقوش کا شخصیات نمبر"۔ یہ ہے ہمارے ادب میں شخصیت نگاری کا اوڑھنا بچھونا۔ اس پر بھی اس ستم زدہ صنف پر کسی کو ترس نہیں آتا۔ مقام مسرت ہے کہ طفیل صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود۔ عابد صاحب کے الفاظ میں "نقوش کے گرانڈیل اور بھاری بھرکم شمارے نکالنے کے باوجود" ادب کے اس بھولے بسرے کوچے کا رُخ کیا۔ خدا کرے کہ وہ اس کوچے سے تب تک واپس نہ آئیں جب تک اسے اچھی طرح آباد و شاداب نہ کر لیں۔

رباعیات

جوش ملیح آبادی

تحقیق کو جس وقت بصیرت نکلی
پردہ میں ذہانت کے غباوت نکلی
جب علم کی سطح کو ذرا سا کھرچا
اِک جَو کی مسافت پر جہالت نکلی

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں
گھڑیاں روکیں مگر گذرتی ہی رہیں
اُمیّد کا رخسار ہیں بھرتے رہے رنگ
اور یاس کی جھُرّیاں اُبھرتی ہی رہیں

دکانِ سخن

فراق گورکھپوری

خرید و مرکاں، لامکاں بیچتا ہوں — شہنشاہیِ دو جہاں بیچتا ہوں
حقائق عیاں اور نہاں بیچتا ہوں — یونہی چند وہم و گماں بیچتا ہوں
میں نغموں کی جنسِ گراں بیچتا ہوں — ترے حسن کی داستاں بیچتا ہوں
اشاراتِ قلبِ تپاں بیچتا ہوں — یقیں بیچتا ہوں گماں بیچتا ہوں
جو آسودہ خواب ہے اُن لبوں پر — وہ رنگینیٔ داستاں بیچتا ہوں
جھپکنے لگیں آفتابوں کی آنکھیں — ترے رُخ کی تابانیاں بیچتا ہوں
جو لپٹی ہیں اس گیسوئے عنبریں سے — میں ان نکہتوں کا دھواں بیچتا ہوں
دلِ باطل کو چیرتی جا رہی ہے — صداقت کی نوکِ سناں بیچتا ہوں
جو چشم و چراغِ شبِ زندگی ہے — میں اشکوں کی وہ کہکشاں بیچتا ہوں
کبھی وقت بے وقت کام آ رہے گا — خرید و غمِ رائگاں بیچتا ہوں
کوئی نرخ اُٹھائے متاعِ سخن کے — میں دل بیچتا ہوں زباں بیچتا ہوں
زمینِ سخن بیچنے کے بہانے — خیالات کے آسماں بیچتا ہوں
خیاباں خیاباں چمن می فروشم — میں ہر برگ کو گلستاں بیچتا ہوں
جو چھیڑوں تو لو دے اُٹھے سازِ ہستی — میں وہ سوزِ دل سوزِ جاں بیچتا ہوں
زمانے میں جو غم ملے دوستوں سے — انھی کو میں اے مہرباں بیچتا ہوں
جو ہیں غنچہ و گل کے پردوں میں نہاں — میں وہ نغمۂ بلبلاں بیچتا ہوں
انھی میں ہیں آسانیوں کے بھی نسخے — محبت کی دشواریاں بیچتا ہوں

برابر کریں جو حسابِ زمانہ
میں کچھ ایسے سُود و زیاں بیچتا ہوں

جھپک جائیں مہرِ قیامت کی آنکھیں
وہ قامت کی برقِ دماں بیچتا ہوں

ازل سے جو پنہاں ہے رازِ بہاراں
وہی گلستاں گلستاں بیچتا ہوں

بہ اعجازِ فن قدر و قیمت بڑھا کر
نشاط و غمِ دیگراں بیچتا ہوں

جو آئے نہیں ہیں کتابوں میں اب تک
اُن ابواب کی سرخیاں بیچتا ہوں

دو عالم بھی دے کر لیں تو ہیں سستے
حقائق کے گنجِ نہاں بیچتا ہوں

جو اس دور کے فتنۂ بے اماں کو
سلا دے وہ خوابِ گراں بیچتا ہوں

جہاں بال جلتے ہیں رُوح الامیں کے
میں اس دل کے سوزِ نہاں بیچتا ہوں

مفر ہو تو جس سے قضا و قدر کو
خریدو کہ وہ امتحاں بیچتا ہوں

جو بے چینیِ دنیا میں جانِ سکوں ہے
میں وہ دردِ آرامِ جاں بیچتا ہوں

وجود و عدم تنگ گوشے ہیں جس کے
میں وہ وسعتِ بیکراں بیچتا ہوں

مرے شعر تر ہیں گلستاں کے آنسو
غمِ خاطرِ شادماں بیچتا ہوں

جنوں خیز ہے تارِ تارِ گریباں
میں اس جیب کی دھجیاں بیچتا ہوں

شفا ہو نہ جس کو مسیحا دموں سے
عزیزو وہ زخمِ نہاں بیچتا ہوں

صفیں رنگ و بو کی غزل میں سجا کے
گلوں کی دکاں کی دکاں بیچتا ہوں

فضائے جناں گرد ہے جن کے آگے
ان اشعار میں وہ سماں بیچتا ہوں

وجود ایک سوزِ مسلسل ہے جس سے
میں اس عشق کی گرمیاں بیچتا ہوں

مرے سازِ دل میں صدائے جرس ہے
جسے کارواں کارواں بیچتا ہوں

چراغِ سخن ہیں کہ کچھ نقشِ پا ہیں
تری رہگذر کے نشاں بیچتا ہوں

بنے شوقِ دیدار ذوقِ شہادت
میں وہ جلوۂ جانستاں بیچتا ہوں

اک اک لمس جس کا شعاعوں سے نازک
میں وہ فنِ شیشہ گراں بیچتا ہوں

وہ دوست اس کی جو قدر و قیمت نہ جانیں
انھی کو غمِ دوستاں بیچتا ہوں

حقائق ہیں کچھ، خامشی و سخن کے
جنھیں درمیاں درمیاں بیچتا ہوں

مرے اک فسانے میں لاکھوں فسانے
جنھیں داستاں داستاں بیچتا ہوں

سبھی برق وش جس کی چنگاریاں ہیں
میں وہ آگ اے جانِ جاں بیچتا ہوں

اسے مول لے کر خدائی کرو گے
خرید و زمین و زماں بیچتا ہوں

سراسر ترے حسن کا پردہ رکھ لیں
میں وہ چاک دامانیاں بیچتا ہوں

کئی راز ہیں جو یقیں در یقیں ہیں
انھی کو گماں در گماں بیچتا ہوں

جسے چاندنی رات بھی ڈھونڈتی ہے
میں وہ جلوۂ مہوشاں بیچتا ہوں

جو ہیں کارفرما ضمیرِ بشر میں
وہ رحمان و شیطان بیچتا ہوں

جو ہے جان و ایماں سے بھی بڑھ کے مجھ کو
میں اس دل کے ٹکڑوں کو ہاں بیچتا ہوں

حیاتِ بشر کے ہیں کچھ رمز جن کو
شر و خیر کے درمیاں بیچتا ہوں

زمیں کو بناتی ہے جو رشکِ جنت
خرید و وہ سرگرمیاں بیچتا ہوں

جو آتی ہے فرسودہ نظمِ جہاں پر
میں وہ آفتِ ناگہاں بیچتا ہوں

پیام انقلابوں کا جھنکار جس کی
وہ زنجیرِ زندانیاں بیچتا ہوں

ملے تھے یہ غم مجھ کو اے دوست تجھ سے
جنھیں شادماں شادماں بیچتا ہوں

بہت سی محبت کی ناکامیاں ہیں
جنھیں کامراں کامراں بیچتا ہوں

یہ ہیں خطِ روشن جبینِ وطن کے
میں تقدیرِ ہندوستاں بیچتا ہوں

مرے دل پہ لہرا کے جو ٹوٹتی ہیں
اداؤں کی وہ بجلیاں بیچتا ہوں

پڑیں لمحہ لمحہ پہ مہریں ابد کی
میں وہ وقفہ ہائے نہاں بیچتا ہوں

کمندِ چمن ہے لچک خوشبوؤں کی
خمِ زلفِ عنبر فشاں بیچتا ہوں

زمینِ سخن گل کھلاتی ہے کیا کیا
جنھیں آسماں آسماں بیچتا ہوں

فراق اک حشرِ بیدار پر ہیں نگاہیں،
میں یکمشت دونوں جہاں بیچتا ہوں

فیض احمد فیض

اے حبیبِ عنبر دست!

[ایک اجنبی خاتون کے نام
خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر]

کسی کے دستِ عنایت نے کنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دلنواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا، زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گلبدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست

لئے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی یہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست
یہ شعرِ حافظِ شیراز، اے صبا کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

سنٹرل جیل۔ حیدرآباد
۲۹ / اپریل۔ ۱۹۵۳ء

○

سید عابد علی عابد

رنگ سے رمزِ نور تک پہنچے
دیدہ ور تھے کہ دور تک پہنچے

چلو اچھا یونہی سہی، سچ ہیں
جو فسانے حضور تک پہنچے

ساقیا عمر بھر کہا تو نے!
اب مقامِ سرور تک پہنچے

غمِ دوراں کی راہ سے ہم لوگ
غمِ دل کے شعور تک پہنچے

یہی حسرت رہی کوئی ہمدم
رمزِ طبعِ غیور تک پہنچے

راہ گم کردگانِ دشتِ وفا
منزلِ نخلِ طور تک پہنچے

بڑی مشکل سے آج نغمہ گرو!
ہم دلِ ناصبور تک پہنچے

وہ بھی آج آئے مجھ کو سمجھانے
چارہ گر آج دُور تک پہنچے

جو پرافشاں رہے جبینوں میں
وہی سجدے حضور تک پہنچے

○

صوفی تبسّم

وفا کی آخری منزل بھی آ رہی ہے قریب
جو اس جگہ بھی نہ تُو مل سکے تو میرے نصیب

فغانِ حق و صداقت کا مرحلہ ہے عجیب
دبے تو بند و سلاسل اُٹھے تو دار و صلیب

ترے خیال کا مسکن چمن چمن کا سفر
مری وفا کا نشیمن فقط دیارِ حبیب

نظر سے بچ کے ملے ہیں وہ بارہا مجھ کو
ہزار بار ہُوا ہے یہ دل نظر کا رقیب

اُلجھ نہ جائیں کہیں اور دل کے افسانے
کہاں حدیثِ محبّت، کہاں بیانِ خطیب

نہ جانے کونسی شے چشمِ غمگسار میں تھی
کہ جس کو دیکھ کے لرزاں ہُوا ہے دستِ طبیب

ابھی فسردہ ہے ساقی ترا تبسّمِ لب
کسی کی یاد کو لے آؤ میکدے کے قریب

○

عدمؔ

جس نے دیکھی جناب کی صورت — بن گیا خود شراب کی صورت
ہائے اُس آفتاب کی گرمی — ہائے اُس ماہتاب کی صورت
ہو گئی اور بھی حسیں شبنم — دیکھ کر آفتاب کی صورت
جس کو تم نے سمجھ لیا موسیٰ — جلتے جلتے خطاب کی صورت
وہ تو تھا اک نقاب کا پرتو — وہ تو تھی اک حجاب کی صورت
آپ خود ہی تو آئینے میں ہیں — آئینہ اور جناب کی صورت
اُس کی آنکھیں ہیں اس طرح جیسے — خامشی میں رباب کی صورت
عاشقی آفتاب کا عالم — دلبری ماہتاب کی صورت
جانے کس کی حسین نادانی — بن گئی ہے حباب کی صورت
پڑھنے والا اگر نگاہ کرے — زندگی ہے کتاب کی صورت
موت کیا اور زندگی کیسی — ایک لطفٔ اک عتاب کی صورت
اِک ترے اختلاط کا نقشہ — اک ترے اجتناب کی صورت
کاکلِ یار بھی نظر آئی — دلِ خانہ خراب کی صورت
دیکھ لو ایک پھول کے رُخ میں — خاندانِ گلاب کی صورت

اے عدمؔ حشر نام ہے جس کا
وہ بھی ہے اک حساب کی صورت

قطعات

اختر انصاری

جفائے چرخ

تیرے قرباں بختِ خفتہ! قوتِ بیداد ہوں
تیرے صدقے اے خزاں! جانِ گل و گلزار ہوں
ٹوٹ پڑے اے آسماں اور چھید لے اپنا جگر
خیر تیری دشمنی کی، ہیں کھنچی تلوار ہوں

جہانِ مظلوم

ستم رسیدہ ہے حد درجہ یہ جہانِ خراب
مکیں ہیں اس کے بہت جبر و قہر کے مارے
مجھے یہ ڈر ہے کسی روز غیظ میں آ کر
یہ خود کو گنبدِ افلاک پر نہ دے مارے

آسماں بردوش

کسی نے میرے مقدّر سے کر دیا منسوب
جنونِ عشق کو بھی، گردشِ جہاں کو بھی
غرض اٹھائے ہوئے ہوں میں اپنے شانوں پہ
زمین ہی کو نہیں، ہفت آسماں کو بھی

○

غلام ربانی تاباں

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا — وہ بوئے گل تھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا

دیا جو ساتھ تو پھر کس بلا کا ساتھ دیا — شکستِ غم نے ہر اک مدعا کا ساتھ دیا

فروغِ بادہ نے رنگِ حیا کا ساتھ دیا — غرض اسی بتِ کافر ادا کا ساتھ دیا

خیالِ یار ترا شکریہ رہِ غم میں — بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا

نگاہِ شوق کے یہ حوصلے کوئی دیکھے — کہ ہر نظارہ صبر آزما کا ساتھ دیا

میں کس طرح سے کروں کم نگاہیوں کا گلہ — تری جفاؤں نے ذوقِ وفا کا ساتھ دیا

دلِ خراب کی یہ سادہ لوحیاں توبہ — جفا کے بعد بھی اہلِ جفا کا ساتھ دیا

تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے — کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا

اب اس سے آگے وہ مسجد یہ میکدہ تاباں

بہت تو ہم نے کسی پارسا کا ساتھ دیا

گفتگوئے بہار

امتیاز علی عرشی

فضا میں گونجی ہے کچھ ایسی ہاؤ ہوئے بہار
کہ خشک و تر کی زباں پر ہے گفتگوئے بہار

خرد فریب ہے اس درجہ رنگ و بو کا ملاپ
کہ جس کو دیکھو کھنچا جا رہا ہے سوئے بہار

یہ کون جھانک رہا ہے گلوں کے پردے سے
چل، اے ندیم، اٹھائیں نقابِ روئے بہار

جمالِ گل کے تلاشی جلالِ خار تو دیکھ
کہ اس کی نوک سے ہے حفظِ آبروئے بہار

عروسِ گل کو نکالو خزاں کے پردے سے
کہ مجھ بہار زدہ کو ہے جستجوئے بہار

نسیمِ صبح کی جھولی میں کچھ نہیں جز بو
یہ کم نصیب ہے ادنیٰ گدائے کوئے بہار

خزاں سہی پہ مجھے باغ ہی میں رہنے دو
مرا دماغ ہے اب تک خرابِ بوئے بہار

چلو گلوں کے کٹوروں میں بھر کے پی ہی لیں
روش روش ہے رواں آبِ مشکبوئے بہار

خزاں نے لوٹ لیا گر چمن تو کیا غم ہے
بہار ہم کو عطا کر گئی ہے خوئے بہار

سفینہ ہوش کا پھر ڈوبنے کو ہے عرشی
کہ ان دنوں ہے تلاطم پہ آبِ جوئے بہار

○

میکش اکبر آبادی

وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے
اُن سے بھی یاں نبھ نہ سکی جو عاقل تھے فرزانے تھے

آپ یہ طے کرتے رہئے کچھ تھا کہ نہ تھا کچھ ہے کہ نہیں
کٹ ہی گئی اپنی تو اِن میں خواب تھے یا افسانے تھے

سنّاٹا سا محفل میں ہنگامہ سا برپا دل میں
کیا کہتے کیا چپ رہتے کچھ جانے کچھ انجانے تھے

حسن کی فطرت ہرجائی اور دل کو ذوقِ رسوائی
مسجد میں تھے مے خانے اور کعبے میں بت خانے تھے

موجِ صبا سے اُس نے چھیڑا بوئے گل سے یاد کیا
ہم بدقسمت پھر بھی نہ سمجھے کہنے کو فرزانے تھے

اگلی پچھلی باتوں کا کیا ذکر ہے اب جانے دیجے
آپ کے در پر آ ہی پڑے ہم۔ تھے جب تک بیگانے تھے

مغروروں کو دیکھ کے ہم نے یہ سیکھا ہے اے میکش
جس سے ملے اس طرح ملے جیسے جانے پہچانے تھے

○

شاد عارفی

ہم سے وہ دادِ وفا چاہے گا — یوں بھی ہو گا جو خدا چاہے گا
رہنما اور تو کیا چاہے گا — ترکِ منزل کا صلہ چاہے گا
شر پرستوں کے علاوہ ہر شخص — آدمیت کا بھلا چاہے گا
بھی نظریں یہی تیور رہیں اگر — حالِ دل کون کہا چاہے گا
ہ جو بے وجہ ستایا جائے — غور فرمائیے۔ کیا چاہے گا
ہم کو دیکھے گا تو شاید ہی کوئی — دولتِ ذہنِ رسا چاہے گا
نجمن اور ہے شخصیت اور — جام ہر رند جدا چاہے گا
پ کی بام نشینی کے طفیل — کون پستی میں رہا چاہے گا
عندلیبوں سے بھلائی کر کے — باغباں اپنا برا چاہے گا!
لستانوں کو۔ بہاروں کی قسم — کوئی ہم سے بھی سوا چاہے گا

حضرتِ شاد مگر مستقبل
ہم ادیبوں کا بھلا چاہے گا

○

فضل احمد کریم فضلی

کچھ تو مجھے محبوب ترا غم بھی بہت ہے
کچھ تیری توجہ کی نظر کم بھی بہت ہے

اشکوں سے بھی کھلتا ہے وہ دل جو ہے گرفتہ
کلیوں کے لئے قطرۂ شبنم بھی بہت ہے

ہم خود بھی نہیں چاہتے صیاد سے بچنا
سازش نگہ و دل کی منظم بھی بہت ہے

ہے رشتۂ دزدیدہ نگاہی بھی عجب شے
قائم یہ ہوا پر بھی ہے محکم بھی بہت ہے

ہاں نیم نگاہی سے یوں ہی کام لئے جا
یہ تیری عنایت کی نظر کم بھی بہت ہے

اب ظرف کی یہ بات ہے جو بھی جسے مل جائے
دنیا میں خوشی بھی ہے بہت غم بھی بہت ہے،

ڈھائے دلِ نازک پہ بہت اس نے ستم بھی
پھر لطف یہ ہے مجھ پہ وہ برہم بھی بہت ہے،

یہ طرفہ تماشہ ہے، کیا قتل بھی مجھ کو
اور پھر مرے مرنے کا انھیں غم بھی بہت ہے

کچھ بانگِ دہل کے بھی یہاں کان ہیں عادی
کچھ لے مرے اشعار کی مدھم بھی بہت ہے

پڑتے ہیں ستمگر کے ذرا وار بھی اوچھے
اور فضلیؔ بسمل میں ذرا دم بھی بہت ہے،

عبدالمجید حیرت

سب کہاں منتقل سفینوں میں
لے گئے لوگ راز سینوں میں

ہم ہیں یا آپ، سوچئے تو سہی
کون ہے کس کے خوشہ چینوں میں

کی نہ تھی آہ بھی ابھی کہ وہاں
شکنیں پڑ گئیں جبینوں میں

جب ملے تھے، تو ہم یہ سمجھے تھے
مے بھی ہو گی ان آبگینوں میں

بات اکثر سمجھ نہیں پاتے
ہیں غبی بھی بہت ذہینوں میں

جوہری ہی نکال سکتا ہے
فرق اچھے بُرے نگینوں میں

اس قدر ربط و ضبط تھا جن سے
نظر آتے ہیں اب مہینوں میں

یا مکاں ہی نہیں قرینے کے
یا سلیقہ نہیں مکینوں میں

دلق پوشوں کو کم نہ سمجھیں آپ
کیا نہیں اُن کی آستینوں میں

ذہن ہوتا ہے دل نہیں ہوتا
آج کے نکتہ آفرینوں میں

حیرتؔ آساں نہیں غزل کہنا،
اس قدر مختصر زمینوں میں

تبسم کی چوری

مخمور جالندھری

وہ گلعذار نہ تھی اور مہ جبیں بھی نہ تھی
نگاہ سجدہ کرے ایسی نازنیں بھی نہ تھی
بہار جس سے ہویدا ہو رنگ و بو پیدا
وہ بات اس کے سراپا میں اب کہیں بھی نہ تھی
مگر جمال پہ اپنے وہ شرمگیں بھی نہ تھی
وہ کاؤنٹر پہ تبسم فشاں نہیں کل سے

وہ کاؤنٹر کی فضا خوشگوار رکھتی تھی
وہ اپنے عشووں اداؤں پہ دھار رکھتی تھی
تبسم اپنا سدا بادہ بار رکھتی تھی
لباس میں متنوع نکھار رکھتی تھی
وہ ہر طرح سے دکاں کامگار رکھتی تھی
ملازمت کے تقاضوں سے کی وفا اس نے

وہ سیلز گرل تھی چھ سال پہلے حور بھی تھی
سرود و نغمہ بھی تھی بادہ و سرور بھی تھی
کمالِ صنف تھی، تخلیق کا غرور بھی تھی
بیاضِ شعر بھی تھی اور کتاب نور بھی تھی
وہ سب کے پاس بھی تھی اور سب سے دور بھی تھی
وہ کاؤنٹر پہ تبسم فشاں رہی برسوں

وہ ایک ایک ادا اس کی سیم بار بنی
رو پہلے سکوں کا ضوریز آبشار بنی
دکاں کے آقا کی ہفتوں میں یوں کار بنی
اور اس کی بیوی کی گردن میں سات ہار بنی
اور اس کا شہر میں ناموس و اعتبار بنی
خلافِ طبع عمل بارہا کیا اس نے

زباں سے بات جو نکلے وہ اک ترنم ہو
لبوں پہ لمحہ بہ لمحہ نیا تبسم ہو
ہر ایک عشوہ غزل، ہر ادا تکلم ہو
لباس اڑتے ہوئے عطر کا تلاطم ہو
کہ جو بھی آیا خریدار ہوش تاب گم ہو
ملازمت کے تقاضے یہی رہے اس سے

ہزار غم ہیں تو ہوں غم کو تم چھپاؤ مگر
جو دل اداس ہے ہونے دو مسکراؤ مگر
نصیب میں نہیں ریشم پہن کے آؤ مگر
بجھا بجھا سہی دل کا دیا جلاؤ مگر
یہ زندگی ہے محال اس کو کیوں جتاؤ مگر
خلافِ طبع عمل اس سے کتنے دن ہوتا

وہ خون بھی تو بہے جو شباب لاتا ہے
وہ برق تو ہو بدن جس سے جگمگاتا ہے
وہ رنگ بھی تو ہو جس سے تبسم آتا ہے
سینچے نہ باغ تو دو دن میں سوکھ جاتا ہے
بدن ڈھلا تو دکاں کے وہ کام کی نہ رہی
وہ کاؤنٹر پہ تبسم فشاں نہیں کل سے

○

ناصر کاظمی

ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے
گو باغباں یہ کنجِ چمن مجھ سے چھین لے

یارب غرورِ دردِ غریبی کا واسطہ!
میں بے وطن ہوں یادِ وطن مجھ سے چھین لے

یا برگ و ساز دے مرے شایانِ آرزو
یا میری زندگی کا چلن مجھ سے چھین لے

منظر دل و نگاہ کے جب ہو گئے اداس
بیکار ہے علاقۂ تن مجھ سے چھین لے

گر احترامِ رسمِ وفا ہے تو اے خدا!
یہ احترامِ رسمِ کہن مجھ سے چھین لے

گُل ریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ
گلچیں کا بس چلے تو یہ فن مجھ سے چھین لے

سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے

پہروں آنکھیں نم رہیں دل خوں ہوا
جب کہیں اک شعرِ تر موزوں ہوا

رنگ لایا آخر اُس گُل کا خیال
لکھتے لکھتے صفحہ سب گلگوں ہوا

دل میں جو کانٹا تھا اُس کی یاد کا
لب پہ آتے ہی گُلِ مضموں ہوا

مدّتوں جب تیرے غم نے آگ دی
شیشۂ دل پھیل کر گردوں ہوا

کون گزرا پھر فضائے یاد سے
بیٹھے بیٹھے دل پریشاں کیوں ہوا؟

خاک ہو کر اس کے در سے جا لگے
یار سے ملنا ہوا پر یوں ہوا

مجھ سے میری داستانِ غم نہ پوچھ
تُو بتا یہ حال تیرا کیوں ہوا

تُو نے پھر ناصر کو دیکھا پیار سے
کیا کہوں دل کس قدر ممنوں ہوا

○

شاعر لکھنوی

عقل جب تک جنوں شناس رہی
روشنیِ دل کے آس پاس رہی

چھپ کے آئی ہزار پردوں میں
آرزو پھر بھی بے لباس رہی

اُن کی اک جنبشِ نظر کے لئے
ہر نظر محوِ التماس رہی

ذکر جب تک رہا ترے غم کا
گردشِ دہر بدحواس رہی

بجھ گئے سیکڑوں چراغ مگر
اُن سے ملنے کی دل کو آس رہی

ایک لمحے کو آئے تھے وہ قریب
دیر تک زندگی اُداس رہی

جتنی پی اُس نگاہ سے شاعرؔ
اور اتنی ہی دل کو پیاس رہی

○

اقبال صفی پوری

غرورِ تشنہ لبی کام آ ہی جاتا ہے
مری طرف بھی کوئی جام آ ہی جاتا ہے

ہزار طرح وہ افسانۂ وفا بدلیں
کہیں کہیں سے مرا نام آ ہی جاتا ہے

وہ اپنی زلف کی خوشبو چھپا نہیں سکتے
نسیمِ صبح کا پیغام آ ہی جاتا ہے

پکار لیتے ہیں خود وہ بھی کہہ کے دیوانہ
کبھی کبھی تو جنوں کام آ ہی جاتا ہے

ہزار ضبطِ محبت کے باوجود اے دوست
مرے لبوں پہ ترا نام آ ہی جاتا ہے

ہم اہلِ درد بہر حال جی ہی لیتے ہیں
ترے بغیر بھی آرام آ ہی جاتا ہے

شفق کا حسن ہو یا گلستاں کی رنگینی
ہمارے دل کا لہو کام آ ہی جاتا ہے

حریمِ حسن میں کتنی ہی باادب ہو نظر
مذاقِ دید پہ الزام آ ہی جاتا ہے

نہ جانے کیا ہے کہ ملتا ہے جب سکوں اقبال
خیالِ گردشِ ایام آ ہی جاتا ہے

نور بجنوری

ہر طرف اندھیرا ہے   واہ کیا سویرا ہے

مہر و ماہ اُن کے ہیں   دل کا داغ میرا ہے

دشمنوں کو بلواؤ   دوستوں نے گھیرا ہے

واقعی یہ سرخی ہے   یا لہو بکھیرا ہے

جگنوؤں سے کیا ہوگا   غم بہت گھنیرا ہے

سب خطائیں میری ہیں   ہر کمال تیرا ہے

پھر اُسی کے عاشق ہیں   پھر وہیں پہ ڈیرا ہے

ہائے اپنی پامالی

عرش پر بسیرا ہے

آسمانوں سے اُتر کر دیکھو   ذرہ ذرہ ہے منوّر دیکھو

گدگداتی ہے شگوفوں کو نسیم   کسمساتے ہیں گُلِ تر دیکھو

جیتے جی صبر بھی کر لیتے ہیں   یوں بھی ہو جاتا ہے اکثر دیکھو

دیکھنے کیا ہو کلی کی جانب   آؤ کانٹوں کے بھی تیور دیکھو

سر ٹپکتی ہیں مسلسل موجیں   چاند ہنستا ہے برابر دیکھو

اس قدر پیار سے کیوں ملتے ہو   زخم رہ جائے گا دل پر دیکھو

یہ ٹھکانا تھا کسی وحشی کا   ہر طرف ڈھیر ہیں پتھر دیکھو

سنسناہٹ سی فضا میں ہے سنو

ڈگمگانے لگے محور دیکھو!

○

حمایت علی شاعر

اب بناؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
پھر ہیں برق کی نظریں سوئے آشیاں یارو

اب نہ کوئی منزل ہے اور نہ رہگزر کوئی
جانے قافلہ بھٹکے اب کہاں کہاں یارو

پھول ہیں کہ لاشیں ہیں باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے دار کا گماں یارو

موت سے گذر کر یہ کیسی زندگی پائی
فکر پا بہ جولاں ہے گنگ ہے زباں یارو

تُربتوں کی شمعیں ہیں اور گہری خاموشی
جا رہے تھے کس جانب، آ گئے کہاں یارو

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھُل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو

صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غمِ محبت ہو، کچھ غمِ جہاں یارو

وقت کا تقاضہ تو اور بھی ہے کچھ لیکن
کچھ نہیں تو ہو جاؤ میرے ہم زباں یارو

ایک میں ہوں جس کو تم مانتے نہیں شاعر
اور ایک میں ہی ہوں تم میں نغمہ خواں یارو

خلاؤں سے اُترو

احمد ریاض

فضاؤں میں حوروں کے پیچھے نہ بھاگو
خلاؤں کی پریوں کے نغمے نہ گاؤ
مثالی حسیناؤں کے بُت نہ پُوجو
خیالی غزالاؤں کا غم نہ کھاؤ

جواں مشتری کی دمک پر نہ مچلو
ستاروں میں زہرہ کا مسکن نہ ڈھونڈو
سجاؤ نہ مہتاب کی رہگزاریں
حسیں کہکشاں کا نشیمن نہ ڈھونڈو

شکستِ تمنّا ہیولوں کا جادُو
فریبِ نظر جنّتوں کا دلاسا
فسانوں کی دنیا حقائق سے عاری
قیافے نہیں زندگی کا مداوا

نہ خوابوں سے بہلاؤ محرومیوں کو
کہ خوابوں کا حاصل بھی سوزِ تپاں ہے
خلا میں نہ گھورو فضا میں نہ جھانکو
خلا بھی دھواں ہے فضا بھی دُھواں ہے

فضاؤں سے نکلو خلاؤں سے اُترو
مری حق پسندی کو ٹھکرانے والو
دیارِ مہ و کہکشاں کے اسیرو
زمیں کی خبر لو۔ بشر کو سنبھالو

زمیں کی بساطِ حسیں کو بھی دیکھو
زمیں ہمسرِ وادیٔ کہکشاں ہے
یہاں حسن ہے جہد ہے ارتقا ہے
یہاں کی فضا جاوداں ہے جواں ہے

زمیں پر بھی بکھرے ہوئے ہیں ستارے
یہاں بھی کئی چاند کجلا رہے ہیں
یہاں کتنی لیلاؤں نے جان واری
یہاں کتنے فرہاد ٹکرا رہے ہیں

یہاں زندگی زہرِ غم پی رہی ہے
یہاں زندگی کو بچاؤ تو جانیں
یہاں آدمی پیار کا ہے بھکاری
یہاں پیار کو آزماؤ تو جانیں

واپسی

خلیل الرحمٰن اعظمی

گھوم گھام کے ساری بستی آج بھکاری لوٹ آیا
اپنے آپ سے پوچھ رہا ہے بولو تم نے کیا پایا
لمبے رستوں پہ چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں
گھر کے باہر دھوپ کڑی ہے اور بھی چہرہ سنولایا
گھونگھر والے بال سفر میں اور بھی دھول سے اٹ جاتے ہیں
گورے مکھڑے پر پڑتی ہے اور بھی گہری دکھ کی چھایا
دکھڑا کہنے سے یہ دیوتا اور بھی پتھر بن جاتے ہیں
اپنا بھید زباں پر لا کر جانے کتنا پچھتایا
اپنے غم کی دیواروں سے ٹکرا کر مر جانا تھا
من مورکھ ہے کس کس کی چوکھٹ پر جا کر سر کو جھکایا
دنیا داری کر کے یہ دل اور بھی کچھ کنگال ہوا
اپنی جھولی میں جو کچھ تھا اسے بھی جا کر کھو آیا

دُوری

منیر نیازی

دُور ہی دُور رہی بس مجھ سے
پاس وہ میرے آ نہ سکی تھی
لیکن اُس کو چاہ تھی میری
وہ یہ بھید چھپا نہ سکی تھی

اب وہ کہاں ہے اور کیسی ہے
یہ تو کوئی بتا نہ سکے گا
پر کوئی اُس کی نظروں کو
میرے دل سے مٹا نہ سکے گا

اب وہ خواب میں دلہن بن کر
میرے پاس چلی آتی ہے
میں اس کو تکتا رہتا ہوں
لیکن وہ روتی جاتی ہے

سحرِ بعید

عبدالعزیز فطرت

کنارِ بحر کی بے نام ساحرہ !
آبھی ——
کہ وقتِ شام ہے، اور اک مسافرِ مہجور
پھر آج مملکتِ خواب سے پلٹ آیا

سفینہ اس کا نگاہوں سے ہو چکا اوجھل
وہ خستگی کا، تھکن کا، فسردگی کا شکار
تری ہی یاد میں لیٹا ہوا ہے ساحل پر
کنارِ بحر کی بے نام ساحرہ !
آبھی ——

کنارِ ابر پہ رنگوں کا رقص جاری ہے
دماغ اور نظر تو اگرچہ ہیں خورسند
نصیب جسم نہیں ہے مگر ذرا بھی سکوں
دماغ ——
تیری طربناک یاد سے مسحور
نگاہ ——
ابر کی نیرنگیوں میں کھوئی ہوئی
مگر ہے جسم ——
تھکاوٹ سے خوار و زار و زبوں

غنودگی کے سے عالم میں بادلوں کی گرج
سکوتِ شام کو سو سو طرح ڈراتی ہے
اداس اداس لبادوں میں یہ گھری ہوئی شام
کنارِ بحر پہ میں اور مری یہ حسرتِ خواب
پپوٹے نیند سے بوجھل ہیں،
باوجود اس کے،
یقین ہے کہ مجھے نیند آ نہیں سکتی
یہ نکتہ تو نے ہی شاید مجھے سمجھایا تھا،
کہ ایسے وقت میں عورت ہی کیوں ہے محورِ شوق؟

ترے جمال کے سحرِ بعید کی سوگند
تری رفاقتِ رنگیں میں میں نے دیکھے ہیں
صدف بھی ریت کی لہروں میں
کف کے طوفاں بھی،
مزاجِ موج کی رنگینیاں بھی،
ہیجاں بھی،
کہیں درخت،
کہیں دشتِ ریگ و ریزۂ سنگ
کہیں کہیں لبِ ساحل کا سبزۂ خوش رنگ
کبھی تلاطمِ وحشی،
کبھی سکوتِ گراں،

ہر اک نظارے کو میری نظر نے چوما ہے
غضب تھا تیری نگاہِ جنوں فزا کا فسوں

کنارِ بحر کی بے نام ساحرہ ! تجھ کو
ترے جمال کے سحرِ بعید کی سوگند
یہ بادلوں کی گرج،
یہ حجابِ شامِ سیاہ،
یہ خوابناک مناظر، یہ رات کی آمد
مری تھکن،
مری تنہائی،
میری مہجوری،
ہر ایک ہے متمنی کہ التفات ترا
پھر آئے بن کے وہی خوابناک سا جادو
کہ جس نے ساحل و موجِ رواں کو بخشا تھا
جمال کی ہمہ گیری کا جانفزا ادراک

جمال کی ہمہ گیری کا آئینہ ہے تو
کنارِ بحر کی بے نام ساحرہ !
آبھی ——
تجھے مسافرِ ملکِ امید کی سوگند

○

فارغ بخاری

حدِ نظر کو جان کے منزل گرمِ سفر ہیں ہم
پہلے بھی ہم ہی ہم تھے اور بارِ دگر ہیں ہم

کون افق کے پار سے جھانکا کس نے فردا دیکھا
اَن دیکھی راہوں کیلئے بے چین مگر ہیں ہم

خود بھی نہ دیکھا اپنے دل کی شہ راہوں کو ہم نے
جو برسوں سے ویران ہے وہ راہگذر ہیں ہم

اکثر اُلٹی ہو جاتی ہیں تدبیریں اپنی
جانے کس موہوم اثر کے زیرِ اثر ہیں ہم

ہمدردی کے جذبے میں ہے خود غرضی کی لہر
اپنے ہی محدود جہاں کے شمس و قمر ہیں ہم

نیند کے ماتو اٹھو اپنی آنکھیں مل کر دیکھو
رات کا قصہ ختم ہوا انوارِ سحر ہیں ہم

○

اختر ہوشیار پوری

جب عشق کی راہ پر گئے ہم — ذرّوں کی طرح بکھر گئے ہم
کیا کیا ہمیں تجربے ہوئے ہیں — اس زلف سے اب تو ڈر گئے ہم
تجھ سے بچھڑے تو تیرگی ہیں — کیا جانے کدھر کدھر گئے ہم
صحرا کو چلے تو گلستاں سے — مانندِ صبا گذر گئے ہم
کوئی بھی سمجھ سکا نہ اُس کو — جو بات نظر سے کر گئے ہم
کچھ تو ہی بتا غمِ زمانہ — زندہ ہیں ابھی کہ مر گئے ہم
ڈھونڈو اب ان کو ساتھ لے کے — اے نورِ رُخِ سحر گئے ہم
شاید ترا ناز بھی تھا شامل — آپ اپنی ادا پہ مر گئے ہم
اکثر ترے ساتھ چلتے چلتے — اپنے سائے سے ڈر گئے ہم
اس کارگہِ غمِ وفا میں — کس کس سے نباہ کر گئے ہم
منہ دیکھتا رہ گیا زمانہ — ساتھ اُن کو لئے گذر گئے ہم

اک شخص سے لَو لگا کے اختر
دنیا سے چال کر گئے ہم

بشیر منذر

وصل کی شب بھی غم میں بیٹھے ہیں
ہم کہیں آپ کہیں بیٹھے ہیں

جس جگہ دل میں ہوئے تھے ناسور
غیر کے تیر وہیں بیٹھے ہیں

کوئی ارمان نہیں، جیتے ہیں
کوئی امید نہیں، بیٹھے ہیں

دھڑکنیں دل کی پتہ دیتی ہیں
چھپ کے وہ دل میں کہیں بیٹھے ہیں

ملتفت ہوں گے کبھی تو منذر
در پہ ہم رکھ کے جبیں بیٹھے ہیں

جمیل ملک

حسن میرے ہی دلِ آئینہ بردار میں ہے
تجھ میں وہ بات کہاں ہے جو مرے پیار میں ہے

تیرا ہر زخم امانت ہے مرے سینے میں
تیرا ہر اشک مرے دیدۂ خونبار میں ہے

عشق کی راہ کٹھن ہے مگر اے ہم سفرو
جانِ گلزار بھی اس وادیٔ پُرخار میں ہے

تابِ دیدار اگر ہو تو نظر آتی ہے
وہ حقیقت کہ ابھی پردۂ اسرار میں ہے

رنگ بن کر چمنستاں کو جلا دیتی ہے
آتشِ شوق جو پوشیدہ خس و خار میں ہے

کیا عجب میرے لبوں پر بھی مچل جائے جمیل

پنجابی

سدراں دی موت

احمد ظفر

کِتنیاں گلاں دل وچ رہئیاں
کِتنیاں گلاں بُلاّں اُتے آ کے ہاسے بنیاں
کِتنیاں ہوکے بنیاں
گلاّں فیر وی گلاں رہئیاں
کہیاں تے ان کہیاں

کہیاں فیر وی کہیاں
چناں ورگا متھا
وچ ہنیریاں لتھا

کہیاں دل تے سہیاں
تے ان کہیاں ہنجو
کچے کوارے ہنجو
لمیاں کالیاں پلکاں اتے تارے ــــ ہنجو
چُنی اُتے ڈِگن

کہیاں کہیاں گلاں
کہیاں تے ان کہیاں رہئیاں

کِنھے دِتاّ بھن
ٹوٹے ٹوٹے چن
خال مخولی باہواں
سنجیاں سنجیاں راہواں
کدے نہ چوُڑے چھنکن
مُکی دل دی دھڑکن
مڑیاں سکھیاں سئیاں
دل دیاں دل وچ رہئیاں

رات چور اور چاند

بلونت سنگھ

(یہ ناول بالاقساط نقوش میں پیش کیا جائے گا)

جب بالا سنگھ بابے کی بوسیدہ سمادھ کے قریب پہنچا تو اس کے قدم رک گئے۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور چند ہلکی ہلکی سُرخ بدلیوں کو چیر کر آسمان کے دوسرے سرے تک پہنچتی ہوئی کرنیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی ڈوبتا ہُوا شخص سہارے کے لیے بازو پھیلا دے۔ کھیتوں میں اُگے ہُوئے پودے ساکت کھڑے تھے۔ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں جیسے دھوپ کی تمازت سہہ سہہ کر نڈھال ہو چکی تھیں۔ درختوں کے سائے مضحکہ خیز حد تک طویل ہو گئے تھے۔

لاری سے اترنے کے بعد بالا سنگھ کو پانچ کوس کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا۔ وہ تھکاوٹ کی وجہ سے نہیں رکا تھا ——— وہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان شخص تھا۔ ہاتھ میں لٹھ لیے دھوتیں کے مرغولے کی طرح بل کھاتا، لہراتا اور گاتا ہوا وہ یہاں تک چلا آیا تھا۔ طویل عرصے کے بعد ایک مرتبہ پھر سے اپنا گاؤں دکھائی دینے لگا تھا۔ بہت دور درختوں کے جھنڈ میں کچھ پوشیدہ اور کچھ عیاں گاؤں کا مبہم خاکہ دکھائی دیا، تو وہ ٹھہر گیا اور بابے کی سمادھ کے سامنے بنے ہوئے چبوترے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ پتھر کے مجسمے کی طرح جامد کھڑا تھا۔ اس کے لٹھ کی برنجی شام رخصت ہوتی ہوئی دھوپ میں جگمگا اُٹھی۔ اس کا کھدر کا تہمد ایک مرتبہ لہرایا اور پھر اس کے جسم سے لپٹ کر بے حس ہو گیا۔ اس کے مضبوط چہرے کا رنگ میلے تانبے کے مانند تھا۔ چڑھتی جوانی کا عالم تھا۔ اس لیے چہرہ ابھی مکمل طور پر بھرا نہیں تھا۔ اس کی اونچی آبدار ناک چہرے کے مقابل کچھ لمبی ہی معلوم ہوتی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں خاصی ابھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ڈاڑھی کے باریک بال اُگ آئے تھے لیکن کلوں اور ٹھوڑی کی درمیانی جگہ ہنوز خالی تھی۔ اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی ہلکے گلابی رنگ کے تاگوں کی جالی سے جوڑے کا حجم نمایاں ہو رہا تھا۔ گدی کے چند چھوٹے چھوٹے بال جو لمبے بالوں کے ساتھ سمٹ نہ سکنے تھے ہوا میں لہرانے تھے۔ اور اگر کبھی وہ سر ادھر ادھر گھماتا تو یہ بال کانوں کی لوؤں کو چوم لیتے تھے۔ اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں افق پر جمی ہوئی تھیں۔ اگرچہ وہ ناک ہی کے راستے سانس لے رہا تھا لیکن حسبِ معمول اس کا منہ اب بھی ذرا سا کھلا تھا۔ اس کے اُجڈ بشرے سے سرخ بلا کے آثار ہویدا تھے۔

سامنے کے مناظر کا مجموعی تاثر پہلے تو اس قدر شدید تھا کہ وہ سمجھے ہوئے انداز سے کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ اس کی زندگی کا ایک مکمل باب اس کی نظر کے سامنے تھا۔ لیکن سردست وہ تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا تھا ابھی وہ محض مجموعی تاثر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

ہر چیز تعجب انگیز طور پر ویسی ہی تھی جیسی اُس نے چھ سات سال پہلے دیکھی تھی۔ فی الحقیقت وہ حیران ہو رہا تھا کہ وہ ایسی دلفریب جگہ سے اس قدر طویل مدت تک علیحدہ کیوں کر رہ سکا۔ وہ اپنے پُر فضا گاؤں کا تصور اپنے حافظے سے دُور رکھنے میں کامیاب ہی کیوں کر ہوا۔ سطح زمین کے ہر نشیب و فراز ——— پگڈنڈیوں کے ہر پیچ و خم سے وہ کس قدر مانوس تھا۔ پھر اسے یوں سجھائی دینے لگا جیسے وہ کہیں گیا ہی نہیں۔ نہ اس نے کلکتے میں کبھی آوارہ گردی کی، نہ کبھی موٹر ڈرائیور ہی بنا، نہ کبھی غنڈوں کی ٹولے کی رہنمائی کی، نہ کبھی اُس نے لڑائیاں ہی لڑیں، نہ کبھی اس پر مقدمہ چلا اور نہ کبھی اُس نے ایک برس قید بامشقت ہی جھیلی وہ تو یہیں پر تھا۔ محض چند روپوں کے لالچ میں آکر سیدھی راہ سے بھٹک گیا تھا۔

سامنے گوردوارہ نظر آرہا تھا۔ گوردوارے کی عمارت گاؤں سے تقریباً نصف میل پرے ہی بنی ہوئی تھی۔ وہی سطح زمین سے دو ہاتھ اونچا رہٹ ۔ عورتوں کے نہانے کے لئے چار دیواری، بڑ کے گھنے درخت کی چھائیں۔ وہی انگور کی بیلیں، ہوا میں لہراتا ہوا گوردوارے کا مٹیالے زرد رنگ کا جھنڈا، ادھر گوبر کے ڈھیر ادھر سرکنڈوں کے جھنڈ۔

وہ رہا قبرستان کے قریب چھوٹا سا میدان جہاں لڑکپن میں وہ دیگر لڑکوں کے ساتھ کھدو کھونڈی کھیلا کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ کپڑے کی گیند عموماً قریب والی چھوٹی سی نہر میں گر پڑتی تھی اور بھیگ کر اس قدر بھاری ہو جاتی تھی کہ کھونڈی کی ٹھوکر سے دو قدم لڑھک کر بھد سے رُک جاتی۔ گیند بیچاری کس قدر کس کر باندھی جاتی لیکن پھسپھسی ہو کر رہ جانا تو ازل ہی سے اس کے نصیب میں لکھا تھا۔ بیچاری لڑھکتی بھی تو کہاں تک ؟

..... اور وہ مدرسہ ! توبہ !! خوب مار پڑتی تھی کم بختوں کے وہاں۔ نہ مدرسہ شروع ہونے کا وقت مقرر تھا اور نہ چھٹی کا۔ بس منہ اندھیرے اونگھتے ہوئے وہاں پہنچ جاؤ۔ سارا دن مار کھاؤ اور سورج ڈوبے گھر واپس آؤ۔ چھٹیاں تو ہوتی ہی نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ اتوار کے روز بھی دو چار گھنٹوں کے لئے جانا پڑتا تھا۔ اور اگر کبھی چھٹیاں ہو بھی جاتیں تو پھر منشی لوگ گھر کے لئے اس قدر زیادہ کام دے دیتے تھے کہ چھٹیوں کا مزا ہی کرکرا ہو جاتا۔ لیکن جبھی وہ تو من مانی چھٹیاں منا لیا کرتا تھا۔ غیر حاضر رہنے کے بعد جب وہ مدرسے میں جاتا تو اسے مرغا بننا پڑتا۔ اور اسی حالت میں بیٹھ پر دو اینٹیں اٹھا کر اسکول کے گرد چکر لگانے پڑتے ۔ اور بیٹھ پر بید برستے ہائے کیا مصیبت تھی۔ وہ پڑھائی بھی۔ لڑکے ہی مدرسے کا فرش دھوئیں، وہی ٹاٹ بچھائیں، وہی مدرسے کی کیاریوں میں آب پاشی کریں۔ وہی کتابیں پڑھیں سبق یاد کریں، امتحان دیں اور پھر وہی مار کھائیں ——— اور وہ منشی دینا ناتھ کس قدر ظالم شخص تھا۔ کیسی بے جسی کے ساتھ لڑکوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیتا تھا۔ اسی کی مار سے ڈر کر اس نے لکھنا پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ مدرسہ چھوڑ دینے کے بعد بھی جب کبھی منشی دینا ناتھ سے راستے میں مٹھ بھیڑ ہو جاتی تو وہ اس کی نظروں سے بچنے کے لئے ایک طرف کو سٹک جاتا۔ لیکن اب کہیں دینا ناتھ اسے دیکھ پائے تو مارے دہشت کے گھگی بندھ جائے۔ بچہ کی تصور میں دینا ناتھ کی گھگی بندھی دیکھ کر اس کے دل کو گونا گوں تسکین حاصل ہوئی ۔

بالا سنگھ نے دل ہی دل میں خوش ہو کر حسبِ عادت اپنے اگلے دو دانتوں کی دراڑ میں سے لعاب دہن کی پچکاری چھوڑی۔ اور اب چونکہ اس کی ایک ٹانگ نسبتاً زیادہ بوجھ پڑنے کے باعث تھک سی گئی تھی اس نے ذرا پہلو بدل کر بوجھ دوسری ٹانگ پر ڈال دیا، اور ایک مرتبہ پھر ذہن کو آزاد چھوڑ دیا ——— ——— وہ کھیت، وہ رہٹ، وہ قبرستان، وہ مرگھٹ، وہ پیر جی کا مزار، وہ جوہڑ، وہ درخت ——— غرض وہ چپے چپے سے آشنا تھا۔ لڑکوں کی ٹولیوں کے ساتھ وہ قبرستان میں بیر توڑنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ پاؤں اور ہاتھوں کی انگلیوں میں کانٹے چبھ جاتے، شرطیں بد بد کر دوڑیں لگا کرتی تھیں ۔ اور قبرستان سے ذرا ہٹ کر وہ رہٹ ! ——— جہاں ایک مرتبہ خربوزے چرانے پر شیر و نے انہیں خوب مارا تھا۔ وہ انہیں کنوئیں میں گرا دینے کی دھمکی دیتا تھا۔ اور وہ خوف کے مارے رو رہے اور ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ تعداد میں وہ تین چھوٹے چھوٹے لڑکے ہی تو تھے۔ بیچاروں کا بس بھی کیا چلتا۔ ان سب کے جوڑے تو اس نے قابو میں کر رکھے تھے حکم ملا۔ کان پکڑ لو۔ انہوں نے کان پکڑ لئے۔ حکم ہوا مرغے بنو۔ وہ مرغے بھی بنے۔ پھر حکم صادر ہوا ناک سے زمین پر لکیریں نکالو یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ ہر چند انہوں نے اس ذلت سے بچنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ بالآخر انہوں نے روتے روتے ناک سے لکیریں بھی نکالیں ۔ تب اُس نے ان کے جوڑے چھوڑ دئے اور کڑک کر کہا آئندہ اگر ادھر کا رُخ بھی کیا تو گردن مروڑ کنوئیں میں پھینک دوں گا۔ یہ جان چھڑا کر پہلے تو ایسے سرپٹ

بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور جب بہت دُور آ گئے اور سمجھے کہ اب زد سے باہر ہیں۔ تو پھر رُک کر زور زور سے آوازیں دینے لگے" اوئے شیرو لنگیا! تیری کھین دی ——— تیری اوئے بے بے دی ——— اسی آؤں گے (ہم آئیں گے) اسی آؤں گے اوئے ——— جا کمر دسے اپنی بھین نوں" پھر مُٹھیاں بھینچ کر اور بازو ہلا ہلا کر انھوں نے کئی شرمناک حرکتیں کیں۔ شیرو کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن لاچار تھا۔ ایک ٹانگ کمزور تھی۔ دوڑ کر انہیں پکڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

شیرو کچھ ایسا جوان تو نہیں تھا۔ مگر بات یہ تھی کہ وہ بچارے خود ہی کم سن تھے۔ ان دنوں گاؤں میں اچھے اچھے جوان موجود تھے۔ ممکن ہے اب انھوں نے گھر بسا لئے ہوں اور بھلے آدمیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگے ہوں۔ بھیم جوڑ! آہا ہا کیا کڑیل جوان۔ چوڑی سل کی مانند یہ فراخ سینہ۔ پھولے ہوئے نتھنے لٹھ چلانے میں اُستاد۔ اس کے خوف سے چور گاؤں میں گھسنے کا حوصلہ نہ کرتے تھے۔ بھیم جوڑ کی دھاک بھی دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بھیم جوڑ کی طرح جسیم نہیں تھا۔ بدن اکہرا اور تازی کتے کی مانند تنا ہوا۔ جسم پر چیکلی بھر ماس ناممکن۔ چاق و چوبند۔ سوہنجی کے کھیل میں تو بڑوں بڑوں کے دم ٹوٹ جاتے تھے اس کے سامنے۔ اور وہ مجھیل سنگھ کلائی پکڑنے میں سب کا گورو۔ مگر وہ بھی خوب بلا تھا۔ کیسی تیز اور متجسس آنکھیں تھیں اُس کی۔ مگر کچھ نہیں اس نے عورتیں بھگانے میں زندگی خراب کر لی۔ شراب اور عورت تو مرد کو یوں کھا جاتے ہیں۔ جیسے پتنے کو گھن۔ ایک وہ مسلمان ساہنسی تھا۔ تاڑ کے درخت کی طرح لانبا۔ دوڑ لگانے میں اوّل نمبر۔ جنگلی بلّے پکڑنے میں عجب مہارت حاصل تھی۔ اوہو ——— ایک مرتبہ خوب تماشہ ہوا ——— کہاں گیا وہ بیری کا درخت! ——— ارے وہ رہا۔ بلا چڑھ گیا درخت پر۔ اور نیچے کتوں نے درخت کو گھیر لیا۔ بلا سہما ہوا۔ کتے بے چین۔ جھنجھلا جھنجھلا کر بھونکتے تھے، بھونکنے کی آوازیں بھی مختلف تھیں۔ ایک تو موٹے بھوٹانی کتے تھے۔ بڑی بھاری آوازیں وقار کے ساتھ کبھی "بھوں" کر دیتے۔ ڈگ کتے خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر بھونکتے تھے۔ سب سے زیادہ بے چین "ہلپتہ" کتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جلدی جلدی دُمیں ہلاتے کبھی اُچک کر ادھر آتے کبھی اُدھر۔ بھونکتے تو گھڑی کے الارم کی طرح ٹرکنے ہی میں نہ آتے تھے کبھی کبھار لگتا کہ وہ حلق میں سے نئے ہی سُر میں آواز نکالنے لگتے۔ جیبیں باہر نکالے تازی کتے علیحدہ کھڑے تھے۔ وہ بھونکتے نہیں تھے۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ بھونکنا ان کا کام نہیں وہ بس عملی کام کے لئے بہ دل و جان آمادہ کھڑے تھے۔ مگر بلا تھا کہ اُوپر سے اُترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آخر ساہنسی نے اپنے لٹھ کے کچوکوں سے اسے اس قدر پریشان کیا کہ وہ دفعتاً پلٹ کر ساہنسی پر ٹوٹ پڑا۔ ساہنسی تو پھرتی سے پیچھے کی طرف سرک گیا اور کتوں نے دیکھتے دیکھتے بلّے کو جا دبوچا۔

گاؤں کے کچے مکانات مٹیالے دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن وہ بھی ہر نظر آنے والے دھبے کو پہچانتا تھا۔ سب مکان آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور وہاں سے ذرا ہٹ کر دو چیزیں ایسی نظر آتی تھیں جیسے ایک بڑی چٹان کے پاس ہی دو چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پڑے ہوں۔ ایک تھی دھرم شالہ اور دوسرا تھا رہٹ۔ یہ رہٹ گاؤں والوں کے لئے بہت مفید تھا۔ آبادی کا زیادہ حصہ یہیں سے پانی بھرتا تھا۔ البتہ جانور بھی اسی جگہ نہلائے جاتے تھے اور کپڑے بھی یہیں دھوئے جاتے تھے۔ عورتوں کے نہانے کے لئے گُردوارے کی طرح ایک چار دیواری علیحدہ بنی ہوئی تھی۔ گُردوارہ گاؤں سے ذرا دُور تھا اس لئے عورتوں کی سہولت کے لئے ان کے نہانے کا انتظام یہیں پر کر دیا گیا تھا۔

دھرم شالہ کے پاس ایک جوہڑ تھا۔ جوہڑ کے دوسرے کنارے پر ٹنڈے پیر جی کی قبر تھی۔ دھرم شالہ میں زیادہ رونق نہیں ہوتی تھی۔ گاؤں کی آبادی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک تو خواص اور دُوسرے عوام۔ خواص میں نمبردار، پٹواری، ساہوکار اور ان کے مصاحبین شامل تھے اور باقی لوگوں کو عوام میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ موٹی اسامیاں اپنے فالتو وقت کا زیادہ حصہ دھرم شالہ میں کاٹتے تھے۔ حقہ پیتے، گپ لڑاتے یا چوپڑ کھیلتے۔ باقی لوگ فالتو وقت گاؤں کے دُوسری جانب دھریک کے درختوں کے ایک جھنڈ تلے گزارتے تھے۔ اس جگہ کو "باغیچی" کہا جاتا تھا۔ اور قدرتی طور پر یہاں رونق بھی زیادہ ہوتی تھی۔ گرمیوں کے دنوں میں لوگ اپنی اپنی چارپائیاں اٹھائے باغیچی میں پہنچ جاتے اور حقے تازہ کر کے بیٹھ جاتے۔ ایسے موقعوں پر بوڑھے جوان بچے سبھی بلا لحاظ عمر وہاں یکجا ہوتے تھے۔ لڑکے عموماً تنری کوڈیوں کے کھیل کھیلتے تھے۔ اس کھیل میں ہار جیت ہونے پر ایک دوسرے کے ہاتھ کی پشت پر چٹکی مارتے تھے۔ یا پھر دو ٹیمیں کانٹوں میں دھریک کی گول گول ممولیوں کو جوڑ کر "پنگوڑے" بناتے اور ایک لمبا کانٹا زمین میں گاڑ کر اس کی نوک پر

گھماتے۔ شام کے وقت سوہا گلی ڈنڈا، کھدو کھونڈی یا اور کئی کھیلوں میں حصّہ لیتے اور راتوں کو آنکھ مچولی!

جوان بیٹھے رانیں کھجایا کرتے۔ ان کا کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ ان میں سے جنہیں کسرت کا خاص شوق تھا وہ اپنے بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولتے، منڈی ہوئی رانوں پر سے تہمد ہٹا دیتے اور ان پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کی سختی کا جائزہ لیا کرتے۔ ادھر ادھر کے طاقت ور نوجوانوں کی باتیں شروع کر دیتے "بھئی مہنگا سنگھ بڑا کرارہ جوان ہے"

"ولایت حسین بڑا دبنگ ہے"

"سجن سنگھ بوڑھا ہونے کو ہے لیکن اب بھی بڑا اکڑ ہے"

"جیتی نرا آدمی ہے"

بسیار خور اشخاص کے واقعات کا ذکر بڑے فخر سے کیا جاتا۔ ڈاکہ زنی کے قصّے سنائے جاتے۔ عورتوں کے بھگائے جانے کے افسانے دہرائے جاتے پھر باتوں باتوں میں آپس میں جھڑپیں بھی ہو جاتیں۔ اگر بات زیادہ بڑھ جاتی تو نوبت دھینگا مشتی اور لٹھا پٹی تک جا پہنچتی۔ یا کلائی پکڑنے کے مقابلے ہونے لگتے۔

ایسے موقعوں پر بڑے بوڑھے اپنی شطرنج چھوڑ کر، اور ننگ دھڑنگ بچے اپنے کھیلوں کو بھول کر بغلیں کھجاتے لڑنے والوں کے قریب سمٹ آتے بڑا شور و غل مچتا۔ تماشائی حریفوں کو شہ دے دے کر ابھارتے، چیختے، پگڑیاں اچھالتے اور گالیوں کے دریا بہا دیتے۔ اور اگر دھینگا مشتی میں کوئی فریق دوسرے کے نیچے آجاتا تو پھر تماشائی نیچے والے فریق کو اٹھ کھڑے ہونے کے سو سو داؤ بتاتے "او ئے اڑک دکھنی) نتے ہتھ پا ——— او ئے اڑک تے مار ہچکا ——— شابا جوان دے ——— بلّے بلّے"

ایک تو نیچے والے کے یونہی گھٹنے چھل جاتے دوسرے اوپر سے رائے دینے والوں کی آوازیں اسے اور بھی بوکھلا دیتیں۔ اگر کبھی نیچے والا فریق سچ مچ اوپر والے کے چنگل سے نکل کر اٹھ کھڑا ہوتا اور الٹا حریف ہی کو دے پٹکتا تو بس پھر قیامت ہی آجاتی۔ بچے ناچتے اور تالیاں بجانے لگتے۔ "او ئے او دعڑ و پھلی کڈھی ہوئی سؤ" کسی بوڑھے کے یہ الفاظ سن کر ننگا لڑکا شرما جاتا۔ دونوں ہاتھ آگے رکھ، رانیں سکیڑ آگے کو جھک جاتا۔ اس پر اس کا کوئی شریر ساتھی پیچھے سے پاؤں کی ایک ٹھوکر مار کر بھاگ جاتا۔ اس پر بوڑھے منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنستے اور داڑھیاں پھٹکارتے ——— لڑکے چلچلاتی دھوپ میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے دور دور تک نکل جاتے۔

دھرمشالہ کی پارٹی میں یہ زندہ دلی نہیں تھی۔ ان لوگوں پر متانت سی طاری رہتی۔ ہنستا کم۔ نشست و برخاست میں تکلف اور عوام سے کھل کر بات کرنے میں بھی کچھ رعونت آمیز جھجک۔ البتہ جب کبھی اس طرف سے داروغہ جی کا گزر ہوتا تو ان لوگوں میں ہلچل سی مچ جاتی ——— داروغہ جی گاؤں کی اکلوتی کرسی پہ بیٹھے ہیں۔ اور سب لوگ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ انڈے اکٹھے کئے جا رہے ہیں۔ اگر داروغہ جی سکھ ہیں تو مرغیاں جھٹکہ کی جاتی ہیں۔ اگر رسولؐ کے نام لیوا ہیں تو انہیں اسلامی طریقہ پر ذبح کیا جاتا غرض مرغی بہر صورت جان سے ہاتھ دھوتی گاؤں کے سبھی لوگ کیا چھوٹے کیا بڑے آجا رہے ہیں۔ جس شوق سے لوگ داروغہ جی کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں اس شوق سے تو مداری کے بندر کو بھی نہیں دیکھتے۔ جتنے روز تک داروغہ جی گاؤں میں قیام کرتے سب لوگ گویا سولی پر لٹکے رہتے۔

ایک مرتبہ ایک بڑا نامی ڈاکو گرفتار کر کے ان کے گاؤں میں لایا گیا۔ اقبال جرم کروانے کے لئے ڈاکو کو پیٹ کے بل لٹا کر اس پر جوتے برسائے جاتے تھے۔ لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے۔ اس کو پٹتے ہوئے دیکھا کرتے۔ مار کھاتے وقت سکھ ڈاکو کی داڑھی گرد میں مل کر دھول میں اٹ جاتی اس کے سر کے بال کھل کر پریشان ہو جاتے۔ پالا سنگھ ان دنوں بہت چھوٹا تھا اور اسے ڈاکو کا حلیہ بخوبی یاد تو نہ تھا لیکن اتنی بات اچھی طرح یاد تھی کہ ڈاکو بہت بھاری ڈیل ڈول کا شخص تھا۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر مار کھانے کے بعد بھی جب وہ کھڑا ہوتا تو خاصہ معزز آدمی دکھائی دیتا تھا اور اپنے رفتار میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیتا۔

نہ چیختا نہ چلاتا، چپ چاپ مار کھائے جاتا۔ اور ڈھیٹ ایسا کہ کسی صورت میں جرم کا اقبال کرنے میں نہ آتا۔

انہیں دنوں ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ دھرم شالہ کے قریب ٹنڈے پیر جی کی قبر تھی جس پہ ہر سال ایک دو روزہ میلہ لگتا تھا۔ ان دنوں میلہ لگا تو سارا دن خوب چہل پہل رہی۔ ساہوکاروں نے داروغہ جی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دنگل کا انتظام کیا۔ شام کے وقت دھرم شالہ کے قریب والے کھیت میں تماشائی اور پہلوان جمع ہو گئے۔ پہلے تو ادھر اُدھر کے چھوکرے پکڑ دھکڑ کرتے رہے۔ پھر دو چار اچھی کشتیاں بھی ہوئیں۔ لیکن ان میں ایک جوان ایسا تھا جس سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں ہوا۔ ان کے گاؤں میں اچھے اچھے جوان موجود تھے۔ لیکن وہ پہلوان اس قدر قوی ہیکل تھا کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بیر کدو سا سر۔ بال مشین سے منڈے ہوئے۔ سر کے بیچوں بیچ آٹھ دس بالوں کی ننھی سی چٹیا ہوا میں لہراتی ہوئی، کان ٹوٹے ہوئے، گردن یہ موٹی۔ سر بمشکل گھومتا تھا۔ یہ بھاری بھر کم رانیں اور ان پر اُبھری اُبھری مچھلیاں ———— بڑے بوڑھے سر ہلاتے اور کہتے بھئی اکھاڑوں کا لڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جوڑ یہاں نہیں مل سکے گا۔ گاؤں والوں کی ہیٹی تھی۔ لیکن وہ بچارے کر ہی کیا سکتے تھے۔

ادھر پہلوان تکبر سے نتھنے پھلائے۔ لنگر ہوا میں گھماتا ہوا اکھاڑے میں مست ہاتھی کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ گا ہے بگا ہے مجمع پہ نگاہ ڈالتا اور سانڈ کی طرح ڈکارتا "کیوں" "ہے کوئی مائی کا لال؟"

ادھر وہ ڈاکو برآمدے میں پیٹ کے بل لیٹا جوتے کھا رہا تھا۔ کہیں اس نے پہلوان کی للکار سُن لی۔ وہ چلایا "ٹھہر و بھئی ٹھہرو ———— ملیں تھانے دار کے پاس لے چلو:"

سپاہی سمجھا کہ شاید اقبال جرم کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے ہاتھ روک لیا۔ اور اسے داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ڈاکو نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھتے ہوئے کہا "سے بھائی تھانیدار! ہم نے اکبال نہ کبھی کیا ہے نہ کریں گے۔ اور یہ جوتے بازی بھی ہوتی ہی رہے گی۔ اگر کہو تو اس چھوکرے سے دو دو ہاتھ ہو جائیں ہمارے"

تھانیدار بھی زندہ دل شخص تھا۔ اس کی بات سُن کر ہنسا اور اسے کشتی لڑنے کی اجازت دے دی۔ کہاں تو مار کھا رہا تھا اور کہاں خم ٹھونک کر پہنچا پہلوان کے مقابل کرتا اتار پرے پھینک دیا۔ تہمد سمیٹ کر باندھ لیا۔ اور ایک فراٹے کے ساتھ ہاتھ سے ہاتھ چھوا کر دیا گردن پر جھانپڑ۔

مجمع میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ادھر دونوں میں لگی چھینا جھپٹی ہونے۔

ڈاکو کا جوڑا بھی کھل گیا۔ لیکن تھوڑے سے بال تھے اس نے پرواہ نہیں کی۔ دیکھنے میں تو وہ یونہی گنوار کا لٹھ ہی معلوم ہوتا تھا لیکن کشتی کے اس نے وہ وہ ہاتھ دکھائے کہ حضرت پہلوان ہانپنے لگے۔ اب موقع تاڑ کر جو داؤ مارا ہے ڈاکو نے تو پہلوان کی ساری لاش اٹھا کر زمین پہ پٹخ دی۔ اسے خوب خوب رگیدا۔ اور بالآخر چیت کر دیا۔ اس پہ جو شور مچا ہے کہ بس چپ ہی بھلی۔ "شاباش شاباش" کے ڈونگرے برس گئے۔ لوگوں نے ڈاکو کو کندھوں پہ اٹھا لیا اور اس کی پگڑی بطور جھنڈے کے ہوا میں لہرا دی۔ ڈھول پیٹ ڈالے۔ دو چار آدمی بھاگے بھاگے گئے۔ اور گھی شکر سے بھری ہوئی ہانڈی لا کر ڈاکو کے ہاتھ میں تھما دی۔ ڈاکو سب کچھ کھڑے کھڑے ہضم کر گیا۔ اور خالی ہانڈی برآمدے کے فرش پہ دے ماری۔ مونچھیں پونچھ کر داروغہ جی کی طرف بڑھا اور اپنی گردن کو دناک کو الٹے ہاتھ سے رگڑتا ہوا بولا "سے بھائی تھانیدار! اب تم خواہ ایک مہینہ اور جوتے برسائے جاؤ ———— آپاں ٹس تو مس نہیں ہونا"

پالا سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

دھرم شالہ سے ہٹ کر اس کی نظر رہٹ پہ جا پڑی۔ رہٹ کے قریب کھڑے ہوئے بلند و بالا ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ پہلے بھی اس کی یہی حالت تھی۔ سال بھر میں ایک سبز پتی تک اس پہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس کی مڑی مڑی سوکھی شاخیں دُور دُور تک ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ تنے پہ جا بجا انسانی آنکھوں کی سی گانٹھیں دکھائی دیا کرتی تھیں۔ وہ اس درخت سے بخوبی واقف تھا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ درخت کبھی کا گر چکا ہو گا۔ لیکن وہ جوں کا توں کھڑا تھا۔ چاندنی راتوں میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے تو اس درخت کو داتی مانتے۔ جس کسی کی باری ہوتی وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ باقی ساتھی اس دوران میں بھاگ بھاگ کر

ادھر اُدھر چھپ جاتے۔ بعض دھرم شالہ کی پچھلی جانب، بعض رہٹ کی چوبچی کے پیچھے، بعض چار دیواری کے اندر، اور بعض قریب کے کھیتوں میں دبک جاتے اور جب وہ چلّاتے "آ جاؤ" تو پھر درخت کے قریب کھڑا ہوا لڑکا ہاتھ آنکھوں سے ہٹا لیتا۔ ویسے انگلیوں کے بیچ میں سے تاڑتے رہنا کہ کون کہاں چھپا ہے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بشرطیکہ دوسروں کو اس بات کا علم نہ ہونے پائے ورنہ وہ سب اس کے سر ہو جاتے "چور" کو لڑکوں کی تلاش میں گدھے کی طرح ادھر اُدھر جھانکتے دیکھ کر بعض لڑکوں کی ہنسی نکل جاتی اور ان کی کھی کھی کی آواز سے اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کس کس جگہ چھپے کھڑے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اس قدر معصوم تھے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ "چور" کا دھیان ان کی طرف نہیں ہے۔ جب بھاگ کر دائی کو چھونے لگتے تو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ان کی ہنسی نکل جاتی۔ اور اپنی اس کمزوری کے باعث پکڑے جاتے ——

بالا سنگھ کچھ دیر تک ان خیالات سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر وہ سوچنے لگا ممکن ہے اس سوکھے درخت کی طرح کئی بوڑھے بھی ابھی تک زندہ و سلامت ہوں۔

لمبے لمبے پٹوں والا ایک بوڑھا تو ابھی تک اسے یاد تھا۔ وہ خود ان دنوں بہت چھوٹا تھا۔ اس کی ماں اسے اپنے ہمراہ لے کر اس جگہ نہانے کے لئے آیا کرتی تھی۔ اسے یہ کہہ کر کہ لڑکے چار دیواری کے اندر عورتوں کے ساتھ نہیں نہایا کرتے بلکہ باہر مردوں میں نہاتے ہیں خود چار دیواری کے اندر چلی جاتی۔ وہ نہانے سے کتراتا تھا۔ چنانچہ کپڑے ورپڑے اتار کر دھوپ میں کھڑا رہتا۔ اتنے میں وہ بوڑھا بھینس کو پانی پلانے کے لئے وہاں آتا۔ اس کے سر پر چھوٹی سی ڈھیلی ڈھالی پگڑی بندھی ہوتی تھی۔ کانوں کے پیچھے گدی سے نیچے تک لٹکے ہوئے پٹے۔ لبوں پر سے مونچھیں کٹی ہوئی۔ ڈاڑھی بھی قینچی سے کتری ہوئی۔ یا اللہ یا اللہ کا ورد کرتا رہتا تھا۔ اس پر نظر پڑتی تو بڑی شفقت سے بلاتا "بالی! بیٹا ادھر آؤ —— بولو ہمارے بیٹے نہیں تم۔ ادھر آؤ ہمارے پاس ——" لیکن وہ شرمایا کرتا اسے بوڑھے کی سوکھی سوکھی باہوں سے ڈر لگتا تھا۔ اس کی باہوں کی پھولی پھولی رگیں کینچوؤں کی طرح نظر آتی تھیں پھر بوڑھا اپنے کرو دانتوں سے گنے کی ایک پوری چھیل کر اس کی طرف بڑھا دیتا۔ جیسے وہ معمولی سی کشش و پنج کے بعد ہاتھ بڑھا کر لے لیتا اس پر بوڑھا ہنسنے لگتا۔ اس کے منہ کے دانت بہت کم تعداد میں رہ گئے تھے۔ اس لئے اس کے منہ میں چوہے کے بل کی تاریکی دکھائی دیتی تھی۔ نہ معلوم اب وہ بوڑھا زندہ ہے یا مر گیا بیچارہ۔ اب اگر وہ اپنے ننھے بالی کو دیکھے تو یقیناً بہت خوش ہو۔ اور وہ دونوں آپس میں خوب دل کھول کر باتیں کریں ——

—— جب اس کی ماں گیلی دھوتی بدن سے لپیٹے اندر سے جھانک کر اس کی طرف دیکھتی تو کہتی "کیوں رے ابھی نہایا نہیں" اور وہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ اس کی ماں چپت دکھا دکھا کر دھمکاتی اور گھور گھور کر دیکھتی۔ مگر اتنا بھی وہ سمجھتا تھا، کہ اس حالت میں وہ باہر آنے والی نہیں۔ آخر تنگ آ کر وہ اسے اندر چلے آنے کے لئے کہتی تو وہ انکار کر دیتا۔ "تم مارو گی" ماں سخت پریشان ہوتی۔ اسے گھر جانے کی بھی جلدی ہوتی تھی۔ پھر وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگتی "نہیں —— ہرگز نہیں ماروں گی۔" لیکن وہ کنوئیں کی منڈیر پر ڈھیٹ بن کر بیٹھ جاتا۔ آخر ہزار خوشامدوں اور ایک پیسہ انعام کے وعدے کے بعد وہ اندر جاتا —— ماں اس کا منہ چومتی —— "جھی جھی لو پھاطمہ۔ بی بی دیکھو تو اس لڑکے کو شرم نہیں آتی۔ اتنا بڑا ہو گیا۔ اکل تام کر نہیں —— عورتوں میں ننگا کھڑا ہے۔

—— گیٹی کبھی سر میں جوئیں —— "بانگرو دا پُتر" بچاری پھاطمہ بی بی نئی نویلی دلہن وہ کیا جواب دے بس ہنسے جاتی۔ لیکن موٹی بھدی ساہوکارن بھاری بھرکم کولہے ہلا کر کہتی "ہے بہن کل کا بچہ ہے تجھے ابھی سے شرم کی پڑی ہے" اچھی طبیعت تھی بیچاری ساہوکارن کی۔ گیلی دھوتی نچوڑ کر کندھے پر ڈال لیتی اور اسے بازوؤں میں لے کر کہنے لگتی "کیوں رے تجھے شرم نہیں آتی —— جو عورتوں میں ننگ دھڑنگ گھس آیا ہے —— اسے تو لڑکا ہے کہ لڑکی؟" وہ خود کو اس کے گیلے بدن سے بچانے کے لئے پیچھے پیچھے ہٹتا لیکن وہ آگے بڑھ بڑھ کر باتیں بنائے جاتی۔ کم عمر لڑکیاں کپڑے ڈنڈوں سے کوٹے جاتیں اور خوب ہنستیں۔ ماں کہتی "دیکھو سرنی کو کیسی اچھی بٹیا ہے۔ کیسے سنہرے بال ہیں اس کے دیکھ تو تیری طرح بہتی ہے اس کی ناک کیسا گورا چٹا صاف ستھرا چہرہ ہے جیسے مکھن کا پیڑا!"

سرفوتیا یا سرنی جس کا اصلی نام سرن کور تھا اپنی عمر کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ بن بن بیٹھتی۔ ہر کام بڑے اہتمام سے کرتی۔ خود کو بڑی دانا اور سگھڑ سمجھتی۔

وہ اس کی ماں کی منہ بولی بہن کی بچی تھی۔ جس قدر زیادہ ان دونوں کی ماؤں کی آپس میں بنتی تھی اتنی ہی ان دونوں کے بچوں کی آپس میں ٹھنتی تھی۔ اگر کبھی سترنی اکیلی اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ بڑے اُجڈپن سے اپنی گرد آلود باہوں میں اسے جکڑ لیتا "مکھن کا پیڑا مکھن کا پیڑا" سترنی بڑی کراہت سے پیچھے کی طرف ہٹنے لگتی "ہٹ ہٹ۔ گندا بچو ہڑا کہیں کا" لیکن اس کے دل پر دھتکار کا نفسیاتی ردِ عمل کچھ بھی نہ ہوتا وہ سترنی کے سر کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ کر بڑی بے جگری سے اپنی طرف کھینچتا اور اس کے ہونٹ سترنی کے پھیکے پھیکے ٹھنڈے گال سے چھو جاتے اور جب وہ منہ پیچھے ہٹاتا تو اس کی بہتی ہوئی ناک سترنی کے گال پر تھپ جاتی اور ایک لمبی سی تار کھنچتی چلی آتی وہ انتہائی کراہت سے زمین پر تھوکنے لگتی۔ کرتے کے دامن سے گال رگڑ رگڑ کر پونچھتی اور ایک ہاتھ چپت مارنے کے انداز سے اوپر کو اٹھاتے ہوئے کہتی "بدمعاش!"

اور اب؟

بالا سنگھ کی دوسری ٹانگ بھی تھک گئی تھی۔ اس نے سمادھ کی دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹکا کر دونوں ٹانگیں اچھی طرح اکڑا کر ڈھیلی چھوڑ دیں۔ تب وہ آگے کو جھک کر ٹانگوں کو سہلانے لگا۔ اس سے اسے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولا، چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، انگلیوں کی ہلکی ٹھیسوں سے مونچھوں کا رُخ اوپر کی طرف موڑ دیا۔ گردن کو چھو کر انگلیوں پر پھونک ماری پھر انگلیاں دبا دبا کر اُن کے کڑاکے نکالنے لگا ——— اب تو اس کی ناک نہیں بہتی تھی۔

وہ خود بخود ہنسنے لگا۔ اس نے کُرتے کی آستینوں کو درست کیا اور اسے آگے پیچھے سے جھٹکے دے کر اس کے بل درست کئے۔ تہمد ڈھیلا کر کے اس کے دونوں سرے از سرِ نو بٹنے اور انہیں مضبوطی سے دونوں طرف اڑس لیا۔ دیر تک ہلا ہلا کر تہمد کے گراؤ کو دیکھتا رہا۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں سبھی طرف سے اس کا جائزہ لیا۔ کمر سے صافی اتار کر نئے جوتوں کی گرد جھاڑی، ٹخنوں کی میل پونچھی اور پھر منہ کا پسینہ بھی خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ پگڑی کو دائیں بائیں گھما پھرا کر اور سامنے کی نکڑ میں انگلی پھنسا کر اسے ٹھیک ٹھاک کیا۔ پگڑی کے نیچے اوپر کے دونوں شملوں کی خبر بھی لی۔

وہ بڑے بھائی کے بچوں کے لئے جوڑے ریوڑیاں اور سنگترے لیتا آیا تھا۔ ان میں سے کچھ سترنی کے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی دئیے جا سکتے تھے لیکن افسوس تو اس بات کا تھا کہ وہ سترنی کے لئے کوئی چیز نہیں لایا تھا۔ یقیناً اس سے یہ بہت سخت غلطی سرزد ہوئی۔ اب تو بڑی ہو گئی ہوگی سترنی۔ نہ معلوم اب کیا صورت نکالی ہوگی۔ کہیں شادی نہ ہو گئی ہو۔ جاٹوں میں لڑکیوں کی شادی کے معاملے میں عجلت سے کام تو نہیں لیا جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی منگنی کہیں ہو چکی ہو۔ ماں اپنی چٹھیوں میں اور تو سب باتیں لکھواتی رہی صرف اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال اسے چاہئے تھا کہ وہ سترنی کے لئے کوئی نہ کوئی چیز تو لے جاتا۔ خیر اب دو چار دن کے بعد جب وہ شہر میں جائے گا تو سترنی کے لئے اس کے پسند کے مطابق کوئی چیز لیتا آئے گا۔

دو تین مرتبہ اس نے بڑے اہتمام سے کھانس کھانس کر گلا صاف کیا۔ اور پھر لاٹھی سنبھالی اور ایک چھوٹی سی گٹھڑی بازو سے لٹکا کر وہ شتر مرغ کے سے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ سیدھی پگ ڈنڈی گاؤں کو جاتی تھی لیکن کپڑوں اور جوتوں کے خراب ہو جانے کے خوف سے اس نے نہر کی پٹڑی پٹڑی چلنا مناسب سمجھا۔

اب دھوپ بالکل ہلکی ہو چکی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر ببول کے درخت ایستادہ تھے۔ ان کے زرد زرد بھُربھُرے پھول اور کانٹے جھڑ کر زمین پر بکھر گئے تھے۔ وہ کانٹوں اور پھولوں کو جوتوں تلے روندتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ وہ ان درختوں سے مانوس تھا۔ شاخوں میں سے باہر کو بہنے والی گوند دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ لوگ بچپن میں گوند نوچ نوچ کر کھایا کرتے تھے۔ گوند ان کے مسوڑھوں اور دانتوں سے چپک جاتی اور وہ اس کو چبانے وقت کتے کے پلّوں کی طرح جبڑے ہلایا کرتے تھے۔ کلکتے کی طرف اسے ببول کا پیڑ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس نے کبھی ببول کی داتنوں ہی کا استعمال کیا تھا۔ ایک مرتبہ جب اس کی ماں اس سے ملنے کے لئے کلکتے گئی تھی تو اپنے ہمراہ ببول کی داتنیں لیتی گئی تھی۔ اور اسے ایک مرتبہ پھر پنجاب یاد آ گیا تھا۔ لڑکپن میں وہ چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں ہاتھوں میں لئے داتنیں کاٹنے کے لئے دُور تک نکل جاتے تھے۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ببول کی نازک ٹہنیاں کاٹتے اور جب شاخیں نیچے گر جاتیں تو چاقو سے ان

کے کانٹوں کو صاف کرتے۔ یہ سارا کام بڑے پریم سے کرتے۔ ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرتے۔ عمدہ عمدہ داتونوں کے چھوٹے چھوٹے گٹھے بنا کر انہیں باریک چھال سے باندھ لیتے۔

چلتے چلتے اسے اپنے سامنے لسوڑی کا ایک درخت نظر آیا یہاں بھی وہ کئی مرتبہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آچکا تھا۔ میٹھی میٹھی لسوڑیاں توڑ کر کھاتے۔ جب میلی چادروں کی جھولیاں ان کے گلے میں ڈال کر انہیں رب رسوکھی گھاس، چننے کے لئے بھیجا جاتا تو پہلے وہ سب اکٹھے ہو کر لسوڑی کے اس درخت تلے ڈھیر کر دیتے۔ تھک جانے پر وہ درخت تلے بیٹھ کر سستانے لگتے۔ اردگرد مارے کئی بیر اُگے ہوئے تھے۔ وہ ان کے پتوں پر بیٹھے ہوئے سبز رنگ کے ٹڈوں کو پکڑ لیتے اور پھر ان کو آپس میں لڑاتے۔ جب کبھی انہیں نہانا ہوتا تو بھی وہ اسی جگہ آیا کرتے تھے۔

ان دنوں کی یاد تازہ ہو جانے پر اس کے دل میں ایک مرتبہ پھر نہانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اب پرانے لنگوٹیا یار دوستوں کی دھما چوکڑی کہاں۔ تاہم وہ اکیلا بھی کافی لطف لے سکتا تھا۔

یہ سوچ کر اُس نے لاٹھی درخت کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کر دی اور اس کے قریب ہی گٹھڑی بھی دھر دی۔ اور کپڑے اتارنے لگا۔ سکھی شریعت کے مطابق اُس نے کچھ تو کبھی پہنی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ تہمد کے سوا سب کپڑے اتار دینے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی کو نزدیک نہ پا کر اُس نے پھرتی سے تہمد اتار پھینکا اور غڑاپ سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ اک دم تہ تک بیٹھتا ہی چلا گیا۔

نرم نرم ریت جو تہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بوجھ سے دب کر ادھر ادھر پھیلنے لگی۔ اس کی نرمی اور چپ لن سے اسے جسم کے مختلف اعضا میں عجیب گدگدی کا احساس ہوا۔ یہ گدگدی بڑی لذت انگیز تھی۔ اس نے گیلی ریت ہاتھوں میں لے کر سارے بدن پر مل لی۔ پھر خوب مل مل کر نہایا۔ اُس نے اپنے گرم گرم کانوں کو خاص طور پر پانی سے تر کیا۔ پیٹ کو سہلاتا رہا۔ پھر بغلوں کو ملتے وقت اسے ایک پرانی بات یاد آگئی۔ وہ گیلی بغل میں ہاتھ رکھ کر اوپر سے زور سے بازو دبا دیتے اور پھر موٹر کے ہارن کی سی آواز سُن کر خوب چہچہاتے لیکن وہ بچپن تھا اب اسے ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کا دل اتنا مسرور تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایسا کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔

چہرہ پانی کے اندر ڈبو کر وہ اندر ہی اندر سانس چھوڑ کر پانی کی سطح پر بلبلے اُبھارنے لگا۔ بار بار وہ دفعتاً چہرہ پانی سے باہر نکالتا سانس لے کر پھر منہ ڈبو کر سر زور زور سے دائیں بائیں طرف ہلاتا۔ اس کے تکان زدہ جسم کو ٹھنڈے پانی میں بہت راحت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سر بھی اندر ڈبو دے لیکن بالوں کے بھیگ جانے کے خوف سے وہ ایسا کرنے سے باز رہا۔ اس کے بال بھی کچھ کم نہ تھے۔ اس کا جوڑا دو ہاتھوں میں بھی بہ مشکل سما سکتا تھا ——

وہ ایک بڑے مگر مچھ کی طرح دونوں ہاتھ ریت پہ ٹیکے آہستہ آہستہ کبھی آگے اور کبھی پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ تیرنے کے لئے اس قدر اتھلا پانی بے کار تھا۔ وہ بچپن میں اسی طرح ہاتھ ٹیک ٹیک کر چلنے ہی کو تیرنا سمجھتے تھے۔

سورج بالکل غروب ہو گیا۔ گاؤں کے مکانوں سے دھواں اٹھ اٹھ کر فضا میں پھیلنے لگا۔

بالا سنگھ نہر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے ہاتھ پاؤں جھٹک جھٹک کر بدن سکھایا۔ کپڑے پہن کر پگڑی باندھنے لگا۔ ابھی آخری سرا ٹھونسا ہی تھا کہ اسے احساس ہوا کہ کوئی شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ نظر اٹھائی دیکھا کہ دو ہٹے کٹے مرد ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے کھڑے ہیں۔ اور ان کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں وہ دونوں پُر معنی لہجے میں کھانسنے لگے۔ اسے تعجب تو ہوا لیکن اُس نے بظاہر کچھ توجہ نہ دیتے ہوئے اپنی لاٹھی کی طرف قدم بڑھایا۔ انھوں نے اس سے بھی پہلے بڑھ کر لاٹھی اپنے قابو میں کر لی۔ اس کی آنکھیں دوبارہ ان کی آنکھوں سے ملیں۔ ان میں سے ایک نے بڑی سنجیدگی سے کہا "بھائی تمہاری جیب میں جو کچھ بھی ہو نکال کر رکھ دو۔"

"کیا کہا؟" بالا سنگھ کی پیشانی پر بل پڑ گئے

اس آدمی نے کچھ برہم ہو کر پہلو بدلا "جو پیسہ دھیلا تمہاری جیب میں ہو نکال کر دھر دو۔"

پالا سنگھ نے آتش بار نظروں سے سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا۔ اکھڑ صورتیں، مجرمانہ تیور۔ پھر اس نے اپنے اگلے دانتوں کی دراڑ میں سے لعاب دہن کی پچکاری چھوڑ دی "کیوں؟"

"اس لئے" اور اس کے ساتھ ہی پیچھے سے ایک بھاری ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ اس کی پگڑی پرے جا گری وہ لڑکھڑا گیا پھر اس نے دیکھا کہ اسی اثنا میں ایک تیسرے بھینگے آدمی نے پیچھے اس کے دونوں بازوؤں کو کہنیوں سے پکڑ کر اسے لاچار کر دیا ہے۔ اور سامنے کے دونوں نوجوان لٹھ اٹھائے گویا وار کرنے پر آمادہ ہیں۔

اس نے جدوجہد نہیں کی۔ سامنے والے دونوں آدمیوں نے اس کی تلاشی لی۔ خوش قسمتی سے اس نے اپنا سارا روپیہ بذریعہ منی آرڈر ماں کو بھیج دیا تھا۔ اس وقت اس کی جیب میں سے تین روپے سوا سات آنے برآمد ہوئے۔ وہ اس دوران میں مسکراتا رہا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے لینے کے دینے پڑے۔

تلاشی لے کر وہ لوگ تو اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن وہ خود ڈھیٹ پن سے اپنی جگہ پر اینٹھا کھڑا رہا۔ ہاتھ کی ضرب سے اس کی بائیں آنکھ کے گوشے کے نیچے رخسار پر سرخ رنگ کا ابھار پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا جوڑا ڈھیلا ہو گیا تھا، کچھ بال پریشان ہو گئے تھے۔ اس کی صورت کسی حد تک مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔ اس نے چار قدم پرے گری ہوئی پگڑی کی طرف دیکھا اور پھر ذرا تحکمانہ لہجے میں بولا "میری پگڑی اٹھا دو"

وہ تینوں یہ بات سن کر ہنس پڑے۔ ان میں سے ایک نے لاٹھی کے سرے سے پگڑی اس کی طرف اچھال دی۔

پالا سنگھ نے پگڑی جھاڑ کر بغل میں دبا لی۔ پھر دیکھا کہ قمیص کے دامن پر بھی مٹی لگ گئی ہے۔ اس نے کرتا اتارا اور میلا حصہ پانی میں دھو کر نچوڑا۔

اس اثنا میں وہ لوگ اس کے جسم کی خوبصورت بناوٹ دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں اسے سراہتے رہے۔ دبا ہوا پیٹ، چھاج کی مانند پھیلا ہوا سینہ، اور بھوکے بھیڑیے کی طرح نمایاں پسلیاں۔

کرتا پہن کر اس نے ایک مرتبہ پھر بڑے اہتمام سے پگڑی باندھی شملے درست کئے۔

وہ تینوں شخص دل ہی دل میں تعجب کر رہے تھے کہ یہ نوجوان جس کے مضبوط جسم میں نسیں اور پٹھے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے پتھر میں لوہے کے تار کھینچ دئے گئے ہوں کیوں اس قدر حلیم ثابت ہوا —— خیر انہوں نے اس کی لاٹھی اس کی جانب پھینکتے ہوئے کہا "نوجوان! سنبھالو اپنا لٹھ"

پالا سنگھ نے لاٹھی ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا "لیکن بھئی آپ لوگ کہاں کو چل دئے"

تینوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ پالا سنگھ نپے تلے قدم بڑھاتا ہوا ان کے سامنے پہنچا، اپنے لمبے جسم کو سرو کی طرح سیدھا کیا اور ٹانگیں پھیلا کر سپاہی کی طرح ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چھوٹی چھوٹی تنی ہوئی مونچھیں متحرک تھیں۔ لمحہ بھر اس نے ان کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کی حقیر رعایا ہوں۔ اور پھر بزرگانہ انداز سے بولا "بھائیو! جو پیسہ دھیلا تمہاری جیب میں ہو نکال کر میرے حوالے کر دو"

بھینگے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "کیوں؟"

اس سوال کے جواب میں پالا سنگھ نے ایک خرانٹ جرائم پیشہ استاد کی طرح الٹے ہاتھ کی ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کی اس کا سر گھوما تو ایک ہاتھ اس کی گدی پر دیا۔ وہ سرنگوں ہو گیا اور پھر اس کی ایک ہی بے رحم ٹھوکر سے سیدھا نہر کے اندر جا گرا۔ یہ سب کچھ آنکھ جھپکتے میں ہو گیا۔ بھینگے سے فارغ ہو کر وہ اس کے دونوں ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا جو پاگل کتوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے تھے۔ پالا سنگھ سرک لگا کر پہلے تو ان سے پرے ہو گیا۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر لاٹھیاں برساتے گئے اور وہ مسکرا مسکرا کر روکتا چلا گیا۔ اور قدم بقدم پیچھے ہٹتا گیا۔ جب اس نے جانا کہ حریفوں کے بازوؤں میں تھکاوٹ کے آثار نظر آنے لگے ہیں تو پھر وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ میں لاٹھی یوں گھومنے لگی جیسے تنکا پانی کے بھنور میں گھومتا ہے ——

چند لمحوں بعد اس نے لاٹھیاں ان کے ہاتھوں سے رکھوا لیں۔

اب وہ تینوں مجرم اور لاچار [illegible] اس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ چاہتے تھے وہ اپنے روپے پیسے لے کر ان کا پیچھا چھوڑ دے لیکن وہ کہاں ماننے والا تھا۔

لگ بھگ چھبیس روپے ہاتھ لگے۔ جب وہ روپے گننے لگا۔ تو ان لوگوں نے ٹل جانا مناسب سمجھا۔ لیکن اُس نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے غرّا کر کہا "اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو دو کر تو میں رکھ لوں گا۔ یہ بھاگنے واگنے کا خیال دل ہی سے نکال دو"

بچارے اور زیادہ گھبرائے۔ سمجھے کہ اب ظالم نے کپڑے بھی اتروا لئے۔

پالا سنگھ نے اپنے کپڑوں کو درست کیا۔ پانی سے نہ صافی سے اپنی چھلی ہوئی کہنی صاف کی۔ کوئی خاص زخم نہ آیا تھا۔ پگڑی وگڑی ٹھیک کرنے کے بعد اُس نے ان لٹیروں پہ نگاہ ڈالی۔

تھوڑی دیر کے تامل کے بعد اُس نے زمین پہ تھوکا۔ اور ان روپوں میں سے تین روپے سوا سات آنے نکال کر باقی بھینگے کے ہاتھ پہ رکھ دئے۔

یہ دیکھ کر وہ تینوں دم بخود رہ گئے۔

پالا سنگھ نے کہا "بلیار نتنیہ! تم میرے لنگوٹئے یار ہو۔ تم سے روپیہ چھیننا ذرا ——— بھدی بات ہے"۔

اب تو تینوں کی صورتیں سوالیہ نشان بن کر رہ گئیں۔

پالا سنگھ نے تینوں کی طرف باری باری دیکھا اور پھر اپنی لاٹھی پہ جھک کر بولا "میں سنتا سنگھ کا بیٹا پالا سنگھ ہوں"

ان سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ رتنا دیکھ رہا تھا۔ پالا سنگھ کی طرف لیکن پتلیاں ایسے زاویے پہ تھیں کہ جیسے وہ ببول کی سب سے اوپر والی کونپل کی طرف دیکھ رہا ہو۔ لمحہ بھر تک تو وہ لوگ بول ہی نہ سکے اور پھر دفعتاً چلا اُٹھے۔

اے پالی! تیری ماں کو لے جائیں چور ——— اے آگیا تو ——— اے تو؟ کتے کے پلے ———"

اس کے بعد لشنا کشنا اور رتنا اس سے بغلگیر ہونے لگے پھر گالیوں کی بوچھاڑ اور دھپ پہ دھپ' اے کمینے چور! حرامی کے بچے!!

جب بچپن کے دوستوں کی آپس میں علیک سلیک ہو چکی تو وہ اس کے بازوؤں میں بازو ڈالے اپنے رہٹ کی طرف لے چلے۔ مارے جوش اور خوشی کے ان کے منہ سے بات مشکل سے نکلتی تھی۔

"حرامزادو! تم لوگوں نے آتے ہی میری تواضع خوب کی"

یہ کہہ کر پالا سنگھ نے دانتوں کی دراڑ میں سے تھوک کی پچکاری چھوڑی ——— اور جھاگ کے دو تین ننھے ننھے بلبلے اس کی ڈاڑھی پہ چمکنے لگے۔

رہٹ کے قریب پہنچ کر ان میں سے دو تو زمین میں دھنسے ہوئے گنے کے بیلن پہ چڑھ بیٹھے اور دو قریب پڑے ہوئے درخت کے تنے پہ بیٹھ گئے۔

بشن سنگھ بلند آواز میں پوچھنے لگا "یار پالی تو نے ہمیں پہچانا کیسے۔ بھئی ہمیں تو جب تک تو نے خود نہیں بتایا پتہ ہی نہیں چلا کہ تو ہے کون"

پالا سنگھ نے قہقہہ لگایا "کھو پھر مانتے ہو نا ہمیں ——— دراصل میں نے رتنے کو پہچانا اس کے بھینگے پن سے ———" یہ کہہ کر پالا سنگھ نے اخلاق اور آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رتنے کے دیکھنے کے انداز کی بھونڈی نقل اتاری "جب میں نے اس بھان چو کو اس انداز سے دیکھتے پایا تو سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ رتنا ہی ہے۔ پھر طوطے کی چونچ کی سی چوٹی ہوا میں لہراتی دکھائی دی تو مجھے اس بات کا بالکل ہی یقین ہو گیا ——— اس کے بعد میں نے غور کرنے پر سب کو پہچان لیا"

اس پر سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ اور رتنے کا مذاق اڑانے لگے۔

شام کی خاموشی میں پالا سنگھ نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی دیہی گارے اور مٹی کا بنا ہوا طویلہ جس کے دکھن کی طرف اب ایک نیچی چار دیواری بڑھا دی گئی تھی۔ مویشیوں کو چارہ کھلانے کے لئے دیہی کھرلیاں۔ طویلے کے ایک گوشے میں دو ہل اور پنجالیاں ٹکی ہوئی تھیں۔ اس لئے رہٹ چل نہیں رہا تھا۔ دونوں بیل ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر سینگ ہلا رہے تھے۔ کتنی ہی مرتبہ وہ یہاں آ چکے تھے۔ رہٹ پہ چھائے ہوئے دونوں پھلاہ کے درختوں سے وہ بہت مانوس تھا۔ ان کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے چارپائی ڈال کر سونے کا کتنا لطف آیا کرتا تھا۔

بالا سنگھ کو خیالات میں مگن دیکھ کر کشن سنگھ نے اس کی پیٹھ پہ دھول جماتے ہوئے پوچھا "یار کیا سوچ رہے ہو؟"

"پرانی باتیں یاد کر رہا ہوں۔ اتنے دنوں پردیس میں رہا اب جو وطن میں آیا ہوں تو یوں محسوس کرتا ہوں جیسے یہاں کی ہر چیز سے میرا نامعلوم سا تعلق ہے۔ کلکتے میں اس قدر طویل عرصے تک رہنے کے باوجود اس جگہ وہ اپنے پن کا احساس نہ ہو سکا ——"

کشن سنگھ نے کہا "یار کیا خوب جوان ہو۔ ہم نے تم پر حملہ کرنے سے پہلے تاڑ تو اندازہ لگا لیا کہ صورت سے خرانٹ اور ڈیل ڈول سے طاقتور جوان معلوم ہوتا ہے اس لئے اس پہ قابو پانا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ چنانچہ اسی لئے ہم نے رتنے کو تمہارے پیچھے سے ہو کر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔" یہ کہہ کر کشنا ہنسنے لگا اور پھر رتن کی طرف مخاطب ہو کر بولا "کہو یار زیادہ چوٹ تو نہیں آئی نا!"

رتنے نے جبڑے سہلاتے ہوئے منہ بچکایا "اُف یار! منہ زیادہ ٹھونکوں تو درد محسوس ہوتا ہے"

اس پہ بالا سنگھ نے فلک شگاف قہقہہ لگایا "بھئی آخر رتنا میرا بیٹا ہے نا" یہ کہہ کر وہ ہلین سے اٹھ کر رتنے کی بغل میں جا بیٹھا۔ اس کے رخسار پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "دیکھو بیٹا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تم نے خود ہی پنگا لیا تھا۔"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ لبشا کہنے لگا "یار آج سے پہلے تم ایسے شخص سے ہماری ٹکر نہ ہوئی تھی۔"

"تو کیا یہی تم لوگوں کا پیشہ ہے" بالا سنگھ دل ہی دل میں ہم پیشہ پاکر خوش ہو رہا تھا۔

"نہیں پیشہ تو نہیں —— لیکن تم جانتے ہی ہو یہ جگہ سنسان ہے کوئی شکار آن پھنسے تو ہم اسے چھوڑتے بھی نہیں —— کبھی کبھی مٹھی بھی خاصی گرم ہو جاتی ہے ورنہ اتنا فائدہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ہاتھ صاف رہتا ہے۔"

کشنا بولا "لیکن بھئی تم ایسے آدمی سے پالا نہیں پڑا تھا۔ ہم یہ بات مانتے ہیں کہ تم واقعی جی بھر کر جوان ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اسی میدان کے پرانے شہسوار ہو۔ ہم اپنے آپ کو پرانے کھلاڑی سمجھتے تھے۔ مانا کہ ہم طاقت میں تمہاری برابری نہیں کر سکتے۔ لیکن کچھ ایسے ہیٹے بھی تو نہیں —— پھر بھلا تم نے چٹکی بھر میں ہمیں نیچا کیوں کر دکھایا۔"

بالا سنگھ جواب میں مسکرایا "ابھی بچے ہو عقل کے کچے ہو۔ یہ سینہ کے راز ہیں رفتہ رفتہ تم پر ظاہر کر دئے جائیں گے —— بھئی اب مجھے گاؤں کا کچھ حال بتاؤ۔ پرانے ساتھیوں میں کون زندہ ہے اور کون مر چکا۔ جوانوں کا کیا حال ہے۔ ہمارے زمانے میں تو اچھے اچھے جوان موجود تھے۔ ان میں سے کون کون قائم ہے۔ لنگوٹ کا سچا بھی ہے کوئی یا سب ——"

لبشنے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "پہلے تو پرانے جوانوں کا حال سنو کہ مجھیل جو کلائی پکڑنے اور مگدر ہلانے میں استاد تھا۔ اس کا بُرا حال ہو گیا ہے۔ بچارے کو گرمی ہو گئی تھی۔ سارے بدن پہ پھوڑے نکل آئے تھے۔ بہت علاج معالجے کے بعد اب چلنے پھرنے کے قابل ہوا ہے۔ نہ کلائی پکڑتا ہے نہ مگدر ہلاتا ہے۔ اب اس کی جگہ جیورا سنگھ نے لے لی ہے۔ وہ تو شہروں میں بھی جاتا ہے اس کی لاش مجھیل سے بھی بھاری ہے۔ اس نے اپنا خاص مگدر بنوایا ہے۔ جو پانچ من پکے سے بھی کچھ اوپر وزنی ہے۔ سہاگا اٹھانے میں بھی وہ بڑھا ہوا ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو سرنچی کھیلنے میں فتح سنگھ کا ہمسر کوئی نہیں تھا لیکن اب نواب دین اس سے بھی تیز نکلا ہے۔ نواب ابھی بھرپور جوانی میں داخل نہیں ہوا۔ اس کے کس بل کے کیا کہنے! ان دونوں کی جوڑی جس کھیل میں شامل ہو جائے بس مزا آ جاتا ہے۔ بھتیج سنگھ نے ڈاکے ڈالنے بھی شروع کر دئے ہیں۔ نواب نیک اور دین دار نوجوان ہے واگھورو اسے سب عیبوں سے بچائے رکھے۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ نواب ان دو تین نوجوانوں میں سے ہے جو آئندہ گاؤں کی ناک اونچی رکھیں گے۔ اور بھئی پھیرو جٹ لٹھ باز اب تک ویسا ہی طاقتور ہے۔ آج کل لڑکیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ آنکھوں سے نہیں دیکھا کانوں سے سنا ہے۔ ان کے علاوہ تیجا سنگھ پیارا سنگھ اگروال دتہ اور ہیرا اچھے جوان ہیں۔ دیگر تم جانتے ہی ہو چپ چاپ ہل چلانے بچے پیدا کرنے اور واگھورو واگھورو جپنے والے تو سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں —— اور باقی رہا جوالا سنگھ سو تم جانتے ہی ہو رسلا کا عیبی —— آج کل اسے گرو کا درجہ حاصل ہے۔"

یہ کہہ کر بسنتا چپ ہو گیا لیکن پالا سنگھ لڑکیوں خصوصاً سرنوں کے بارے میں کچھ سننا چاہتا تھا۔ کشنے نے پگڑی کے اندر ہاتھ ڈال کر کھجاتے ہوئے کہا "ہاں بھئی بسنتا بھی خاصا جوان سمجھا جاتا ہے ———"

پالا سنگھ سے پوچھے بنا نہ رہا گیا "لڑکیوں کے بارے میں بھی کچھ کوئی ہے منہ ماتھے کی ——— یا بس ———"

"بھئی یہ تو رتنے سے پوچھو۔ یہی گوپیوں کے کنہیا ہیں ———"

رتنے نے آڑھی ترچھی نظروں سے کشنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "سالے! خود بال برہمچاری بنتے ہو دن رات رہٹ کے چکر لگاتے ہو۔ پر خیر ہمیں بتائے دیتے ہیں اس میں شرمانے کی بات ہی کیا ہے" پھر اُس نے پالا سنگھ کی طرف دیکھا "سنو بالگر سنگھ جی! یوں تو پیما، آشا، زنتی، بیگماں ایک سے ایک بڑھ کر لڑکیاں موجود ہیں لیکن متوالی اور چنچل سرنوں کی بات اب کیا کہیں اور کیوں کر کہیں ———"

پالا سنگھ کا دل اُچھل کر حلق میں آن رہا۔

"لیکن بے چاری چپ چاپ رہتی ہے۔ یوں ہے تو منہ سوڑا اور چنچل لیکن اس کے ظالم بھائی اور ماں باپ اس پہ پابندیاں لگا کر رکھتے ہیں بس اسے بھتے چڑھانا آسان نہیں"

بشنے نے چلّا کر کہا "ابے بک بک بند کر۔ بٹیا! کسی دن اس کے بھائیوں کے ہاتھوں بے طرح پٹو گے۔ جب بھی اس کا ذکر آتا ہے بکنے لگتے ہو" پالا سنگھ کے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ ان تینوں نے کھیتوں کو نہر کا پانی لگانا تھا اس لئے ان کا وہاں رُکنا ضروری تھا۔ لیکن پالا سنگھ لاٹھی پہ دیا دے ڈال تاڑ کے پیڑ کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اس کو دوستوں سے بڑے جھمیلے کے بعد چھٹکارا ملا۔ وہ ایک بار پھر سے بگولے کی سی تیزی سے گاؤں کی جانب چل کھڑا ہوا۔ ———

(۱)

پالا سنگھ کے گاؤں کا نام تھا ڈِنگا۔

پنجابی زبان میں ڈنگا سے مراد ہے ٹیڑھا۔ اس گاؤں کے نام کی وجہ تسمیہ کا کسی کو علم نہیں۔ بعض کہتے تھے کہ چونکہ یہاں کے لوگ اکثر قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ اور حکومت انتہائی کوشش کے باوجود ان میں اصلاح نہیں کر سکی۔ اس گاؤں کے ترچھے بانکے نوجوانوں نے بیدوں اور تیل میں بھیگے ہوئے جوتوں کی ماریں کھائیں۔ کئی کئی برس کی طویل قیدیں بھگتیں، پھانسی کی رسیوں سے لٹکے لیکن پھر بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ اور اب تک اگر کسی نوجوان کے اس قسم کے کارنامے کا ذکر کر کے کوئی اُجڈ جاٹ اپنی لمبی ڈاڑھی پھٹکار کر کہتا "شاباد ے ڈِنگا ڈنگا ای رہیا" یعنی ٹیڑھا ٹیڑھا ہی رہا، سیدھا نہ ہو سکا۔ بعض کہتے تھے کہ ڈنگا نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اسے بسانے والے کا نام ڈِنگا سنگھ تھا۔ لیکن اپنے رویہ کے لحاظ سے وہ بڑا نیک شخص تھا۔ گورکھ کا سیوک تھا۔ گوربانی کا پاٹھ بڑے پریم سے کرتا تھا۔ لیکن بہت کم لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ اس طرح ان کے معتقد میں فرق پیدا ہوتا تھا۔ کہتے "ارے بھائی! یہ تو گوردوارے کے بھائیوں (گرنتھیوں یعنی پجاریوں) کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں۔ بھلا کہاں سردار ڈنگا سنگھ اور کہاں یہ نیکیاں اور پاکبازیاں۔ اجی ڈنگا سنگھ وُہ شخص تھا جس نے پھرنگی کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلے پہل جب گوریوں نے دھوکے سے سکھوں کو لڑائی میں ہرا دیا۔ شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ سے کئے ہوئے وعدوں سے مکر گئے اور سارے پنجاب پر اپنا قبضہ جما لیا۔ تو سردار ڈِنگا سنگھ نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ پنجاب پہ سکھوں کی بجائے پھرنگی کی حکومت قائم ہو گئی ہے اس نے صاف کہہ دیا کہ یہاں اب بھی سکھ کا نون ہی چلے گا۔ میں نہیں جانتا پھرنگی کا کانون کیا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے قول کی صداقت ثابت کرنے کے لئے ایک ٹیلے پہ ڈیرا جما دیا۔ اور آنے جانے والے مسافروں، اور سوداگروں سے اس راستے سے گزرنے والے مال سے لدے ہوئے ہر چھکڑے، اونٹ، گدھے اور گھوڑے وغیرہ پہ اپنا لگایا ہوا محصول وصول کیا کرتا تھا۔ لوگوں نے بہت واویلا کیا پھرنگی کے دربار میں دہائی دی۔ تو پھرنگی نے اپنے آدمی ڈِنگا سنگھ کا مجاج درست کرنے کے لئے بھیجے۔ ڈِنگا سنگھ بھی بڑا اگرا ان ذیل انسان تھا اور پھر سچے بادشاہ گورو گوبند سنگھ جی مہاراج نے جو پھرمایا ہے کہ ——

سوا لاکھ سنگ ایک لڑاؤں　　　تبھے گوبند سنگھ نام دھراؤں

ڈنگا سنگھ جی نے اسٹے انہی کے مجاج ٹھکانے لگا دیے۔ اور وہ ایسے سرپٹ بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس پہ پھرنگی کو بڑا طیش آیا۔ اُس نے اور زیادہ سپاہی (سپاہی) بھیجے۔ ادھر ڈنگا سنگھ نے بھی کئی نہنگ سنگھوں کو جمع کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھرنگی کے سپاہی مقابلہ کئے بغیر ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی نے پھرنگی سرکار کو سمجھایا کہ یونہی سوتے شیروں کو جگا کر پھر سے انہیں مت للکارو۔ چنانچہ پھرنگی نے آئندہ کے لئے کان پکڑ لئے اور جو کوئی شکایت کرنے کے لئے جاتا تو اسے یہی مشورہ دیا جاتا کہ یا تو ڈنگا سنگھ کو محصول دے دیا کرو۔ یا پھر اس راستے سے گزرنا ہی ترک کر دو۔"

خیر حقیقت جو کچھ بھی ہو اس میں شبہ نہیں تھا کہ یہاں کے لوگوں کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کیا تعجب یہ داستان صداقت سے بکسر خالی نہ ہو۔ کیونکہ اب بھی انگریزی سرکار نے ڈنگا کے قریب دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس بات کا ڈھنڈورہ بھی پیٹا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ ارد گرد کے دیہات کے لوگوں کو بہت سی آسانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن ڈنگا کے جوانوں میں اتنا صبر کہاں۔ ایک مرتبہ تو ٹکٹ بابو کی لاش ٹیلیفون کے کھمبے کے ساتھ لٹکتی ہوئی پائی گئی اس کے منہ میں لال جھنڈی ٹھنسی ہوئی تھی اور باچھوں پہ خون جم کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اسٹیشن توڑ دیا گیا۔ پھر چند برس بعد دیگر گاؤں کے لوگوں کی عرضداشتیں پہنچیں تو دوبارہ اسٹیشن قائم کر دیا گیا۔ اب کے وہاں ایک کانسٹیبل اور ایک اسسٹنٹ بھی مقرر کر دیا گیا۔ لیکن دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک روز دیکھا گیا کہ اسٹیشن پر ان تینوں میں سے ایک شخص بھی موجود نہیں۔ تلاش کرنے پہ سپاہی کی لاش اسٹیشن کی دو کمروں پہ مشتمل عمارت کی پچھلی طرف دیوار کے سہارے ٹکی ہوئی ملی۔ سپاہی کا ہاتھ اس انداز سے اٹھا کر اسٹول پہ رکھ دیا گیا تھا جیسے وہ سامنے کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ اس رُخ پہ کچھ دُور جانے کے بعد کھیتوں میں اسسٹنٹ کی لاش بٹھا دی گئی تھی۔ وہ بھی ہاتھ سے آگے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ آگے جا کر جوہڑ میں بڑے بابو کی لاش پانی پی رہی تھی۔ اور زمین پہ گورمکھی حروف میں لکھا تھا:۔

ایتھے ٹیشن نہ بنا پھرنگیا　　　لنڈن دی کُرسی ہل جاؤ گی

یعنی اے فرنگی اس جگہ اسٹیشن نہ بنا کیونکہ اس طرح لنڈن کا سرکاری تخت ہل جائے گا۔

پہلی بار تو ڈنگا کے چند آوارہ جوانوں نے اسٹیشن کو محض لوٹنے کے خیال سے بابو کو قتل کیا تھا۔ اور دوسری مرتبہ محض ضد کی وجہ سے۔ اس اُجڈ پن کی منطق بس یہی تھی کہ جب ایک مرتبہ ڈنگا والوں نے طے کر لیا ہے کہ یہاں اسٹیشن قائم نہیں ہونے دیں گے تو اب خواہ زمین اِدھر سے اُدھر ہو جائے اس عہد کو پورا کیا جائے گا۔ اس بے رحمانہ قتل و خون کی بڑی تندی سے تفتیش کی گئی۔ چند بدنام بدمعاشوں کو بُری طرح مارا پیٹا گیا۔ لیکن کافی ثبوت نہ ملنے پہ ہائی کورٹ نے ملزموں کی اپیل منظور کر کے انہیں بری کر دیا۔ اس کے بعد وہاں جانے پر کوئی بابو رضا مند نہ ہوتا تھا چنانچہ پھر اسٹیشن قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ ڈنگا والوں کی بڑی بھاری فتح سمجھی گئی۔ جرائم پیشہ بوڑھوں کی آنکھوں میں اس کارنامے کا ذکر چھڑنے پہ اب بھی بھیڑیے کی آنکھوں کی سی تیزی اور چمک پیدا ہو جاتی تھی ——— اگرچہ جب کبھی انہیں گاڑی پہ سوار ہونے کی ضرورت پیش آتی تو پہلے نو دس میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ لیکن اس خوشی میں کہ انہوں نے وہاں اسٹیشن قائم نہیں ہونے دیا تھا وہ بخوشی یہ سب تکالیف جھیل لیتے تھے۔

ڈنگا بہت بڑا گاؤں تھا۔ ہندو مسلمان سکھ سبھی رہتے تھے۔ اگرچہ سکھوں کی آبادی چالیس فی صدی سے بھی کچھ اوپر ہی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ ان لوگوں کی بابت دُوسرے خواہ کچھ بھی خیال کریں لیکن آپس میں بلا لحاظ مذہب و ملت وہ مِل جُل کر رہتے تھے۔ مذاہب کی تخصیص تو ضرور کی جاتی تھی لیکن اس بنا پہ کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ سارا گاؤں ایک بڑے کنبے کی مانند تھا۔ ان میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے پڑوسیوں کو دھوکہ دے سکتے تھے یا مخبری کا کام بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے مصداق تھی۔ اور وہ لوگ بھی باغیوں سے اس قدر خائف تھے کہ گاؤں والوں کی مرضی کے خلاف ذرّہ برابر اِدھر سے اُدھر نہ ہو سکتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ گاؤں میں ساہوکار بھی موجود تھے۔ بظاہر وہ علیحدہ کھچڑی پکاتے اور اپنے

آپ کو عوام سے کچھ بلند ہی سمجھتے تھے لیکن یہاں ان کی دال نہیں گلنے پاتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر زیادہ چوں چراں کی تو ایک ہی شب کے اندر اندر ان کو ایسے طریقے سے ٹھکانے لگا دیا جائے گا کہ ان کی ہڈی پسلی تک ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ گاؤں والے ان سے قرض بھی لیتے تھے۔ سُود تو درکنار وہ اصل ہی وصول کر کے جان کی خیر مناتے تھے۔ دراصل ان کا کاروبار ادھر اُدھر کے گاؤں والوں کے سر پہ چل رہا تھا۔ ورنہ ان کی آمدنی اگر اپنے گاؤں ہی پہ موقوف ہوتی تو کبھی کے دیوالہ نکال کر وہاں سے چلے گئے ہوتے۔

پالا سنگھ کے خاندان کو کسی زمانے میں گاؤں بھر میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ روپے پیسے اور دبدبے کے لحاظ سے۔ لیکن جب بُرے دن آئے تو سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا۔ خاندان کے بچے کھچے افراد کی ٹیں تو رہی تھی۔ یعنی وہی بڑے ٹھسے سے گفتگو کرنا۔ ذرا ذرا سی بات پہ سر دھڑ کی بازی لگا دینا اور لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے لیکن دراصل مالی طور پہ بالکل کھوکھ ہو چکے تھے۔ اس کا بڑا سبب تو یہی تھا کہ ان کے بڑے بوڑھوں نے اپنے زمانے میں ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ مختلف لڑائیوں میں مرکھپ گئے۔ کچھ پھانسی پا گئے کچھ جیلوں میں سڑ رہے تھے۔ لے دے کے پالا سنگھ رہ گیا تھا یا اس کا بڑا بھائی۔ زمین کا زیادہ حصہ مقدمے بازی میں بک بکا چکا تھا۔ اور جو تھوڑی بہت بچی تھی اسے پالا سنگھ کے بڑے بھائی لہنا سنگھ نے سنبھال لیا تھا۔ شروع شروع میں اس کے مزاج میں بھی فتور آنے لگا تھا۔ لیکن بعد میں جب اس کی شادی ہو گئی اور بچے بھی پیدا ہو گئے تو وہ امن امان سے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

پالا سنگھ چھوٹی عمر میں کلکتے بھاگ گیا۔ اس کی ماں جو صورت اور جثے کے لحاظ سے راکشسنی دکھائی دیتی تھی گلی میں کھڑی ہو کر خوب زور زور سے رویا کرتی۔ لیکن اس کے تن و توش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یوں وہ منہ بسور کر ہر کسی سے شکایت کرتی کہ جب سے میرا پالی گم ہوا ہے میرے تن کو روگ سا لگ گیا ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہوں نہ پیتی ہوں۔ اگر کھاؤں بھی تو تن کو لگتا نہیں ——— " لوگ اس کا ڈیل ڈول اور پھر اس قسم کی باتوں کا موازنہ کر کے اس کی پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ کیونکہ اس کے روبرو اس کی کسی بات پہ شبہ کا اظہار کرنا گویا بیٹھے بٹھائے مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ وہ بڑی آتش مزاج اور منہ پھٹ عورت تھی۔ اسے مردوں کے مقابلہ میں لٹھ لے کر لڑنے سے بھی گریز نہیں تھا۔ ایک مرتبہ گاؤں ہی کے ایک بدمعاش کی سازش سے چند ڈاکو آئے اگرچہ انہیں کامیابی نہیں ہوئی لیکن گاؤں کے چند آدمی زخمی ہو جانے کی وجہ سے تھانے دار سپاہیوں سمیت آن پہنچے۔ پالا سنگھ کی ماں سنداں کو بھی گواہی کے سلسلے میں طلب کیا گیا۔ وہ حسبِ معمول اپنے بڑے بڑے ہاتھ گھما گھما کر بلند آواز میں کہنے لگی " جب لہنے کا باپو (باپ) زندہ تھا۔ تو کیا مجال جو کوئی چور اچکا اس گاؤں میں گھسنے کا نام لے ——— " یہ سن کر حاضرین کے لبوں پہ پُرلطف مسکراہٹ پیدا ہوئی کیونکہ دنیا جانتی تھی کہ لہنے کا باپو (پالا سنگھ کا باپ) خود ڈاکو تھا۔ جسے آخر کار پھانسی پہ لٹکا دیا گیا تھا۔ لیکن سنداں نے سب مسکراہٹوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا " واہگورو! واہگورو ——— اب تو کلجگ آ گیا ہے (یعنی پالی کے باپو کے زمانے میں ست جگ تھا) لوگ ڈاکے ڈالنے کے لئے ہمارے گاؤں ہی پہ چڑھ دوڑتے ہیں ——— اور جب لہنے کا باپو ——— "

حاضرین میں سے کسی نے تمسخرانہ انداز میں کہا " ہاہا ——— بڑا ہی نیک تھا بچارا لہنے کا باپو ——— "

سنداں نے مشکوک نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھا لیکن اسے سنجیدہ پا کر پھر یہ بڑا منہ کھولا " ہاں جی اس کی کیا بات تھی۔ وہ گاؤں میں نا تو ڈاکو کو گھسنے دیتا تھا اور ——— " یہ کہہ کر اُس نے ایک لمحہ کے لئے تیز نظروں سے تھانے دار کی طرف دیکھا " اور ——— نا ——— نا تھانیدار کو ——— "

اس بات پہ سب لوگ تھانے دار سمیت قہقہہ لگا کر ہنسے۔

یہ تھا بھی درست۔ لہنے کے باپو کے زمانے میں تو ڈنگا گاؤں چوروں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ بنا ہوا تھا لیکن کیا مجال جو گاؤں والوں میں سے کسی کی ایک دھیلے تک کی چوری ہو جائے۔ صرف ایک مرتبہ موتیو ماچھی نے اس قسم کی حرکت کی تھی۔ لہنے کے باپو کو جس وقت اس بات کی خبر ہوئی تو وہ پیپل کے نیچے ایک مگدر کے پاس بیٹھا ران کھجا رہا تھا۔ یہ خبر ملتے ہی اس نے تین من کا مگدر اٹھایا اور سیدھا موتیو ماچھی کے پاس پہنچا۔ اور پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکل سکے یا وہ فرار ہونے ہی کی سوچ سکے اس نے مگدر اس کے سر پہ دے مارا اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ یہ

سب کچھ بھرے گاؤں میں ہُوا۔ لیکن پھر بھی اس کے خلاف موثر کارروائی نہ ہو سکی۔ چھ سات ماہ کے اندر اندر سارا جھگڑا چکتا ہو گیا۔ اور یہ بات بھی درست تھی کہ ان دنوں پولیس بھی اس گاؤں میں داخل ہونے سے کتراتی تھی۔ ان بدمعاشوں کے پھیلے ہوئے جال میں پولیس کے اچھے اچھے افسر بھی بعض اوقات پھنس جاتے تھے۔ لہنے کے باپو نے ایک مرتبہ ہتھکڑیوں کے باوجود دونوں ہاتھوں میں جو تا پکڑ کر تھانیدار کو پیٹ ڈالا۔ اس کی طاقت اور ہمت کو تو دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈنگا سنگھ اور چھماں ڈاکو کے بعد لہنے کے باپو نے ہی اپنے نام کا ڈنکا بجایا۔

باہر والے لوگوں کے دلوں میں تو سنداں کے نام کی بھی دھاک بیٹھی تھی۔ اپنی گلی میں تو وہ کسی اجنبی بدمعاش کو ایک سیکنڈ کے لئے نہ ٹکنے دے۔ سنداں ڈاکے چوری کو برا نہ سمجھتی تھی اگر برا سمجھتی تو اس بات کو کہ ان کے خاندان کے سوا یا زیادہ ان کے گاؤں والوں کے علاوہ بھلا کوئی ایسی جرأت ہی کیوں کرے۔ اگر بہت ہوا تو وہ ایک جاٹ کی بدمعاشی بھی نظرانداز کر سکتی تھی۔ ایک مرتبہ جب گاؤں کا ایک ہندو لڑکا جوان ہو کر بڑھ بڑھ کر لڑائیوں میں حصّہ لینے لگا تھا۔ تو اس نے عجیب انداز میں ناک منہ چڑھا کر کہا "بانگو رو بانگو رو۔ گھور کل جگ آگیا ہے اب تو بنئے بھی لاٹھیاں گھمانے لگے"۔

لہنے کے باپو کی موت اس وقت ہوئی تھی جبکہ پالی کی عمر دو ڈھائی برس کی تھی۔ بچارے پالی کو باپ کی صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔ اس کی موت کے بعد جب سنداں نے بڑھاپے میں قدم رکھا تو پہلے کی سی آن بان تو نہیں رہی تھی۔ اس لئے اس کے دل پہ مظلومیت کا جذبہ طاری ہونے لگا۔ لیکن وہ کسی سے دب کر نہیں رہتی تھی اسے باگورو کا کال پورکھ پہ بہت زبردست بھروسہ تھا۔ پالی کے باپ کے زمانے میں تو لوگوں پہ ان کا بہت دبدبہ تھا۔ اور پھر جب اس دبدبے میں کچھ کمی نظر آنے لگی تو سنداں کو یہ احساس ہونے لگا کہ لوگ اس سے بے انصافی کر رہے ہیں۔ اور اس کی وہ قدر نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ لہنا بڑا ہو چکا تھا۔ اور پھر اسے ماں سے اتنا لگاؤ بھی نہیں تھا اس لئے سنداں کی توجہ زیادہ تر پالی کی طرف رہنے لگی۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ وہ مکھن کی گولیاں اس کے حلق میں سے زبردستی نیچے اتارنے لگی۔ اسے پالی کی خوراک کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ننھے پالی کو یتیم سمجھتی تھی۔ بچارے کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اس کے سوا کون تھا جو مسوم (معصوم) کی دیکھ بھال کرے۔ چنانچہ مکھن دہی ملائی، دودھ سے پالی کے پیٹ کا تنور بھرپور کئے رکھتی حالانکہ پالی کی صورت سے مظلومیت کا اظہار ہوتا تو ایک طرف وہ الٹا اپنے باپ کی طرح خونخوار دکھائی دیتا تھا۔ بھیڑیئے کی سی چری ہوئی باچھیں تھیں اس کی۔ اس قدر ضدی اور منہ توڑ کہ ذرا ہاتھ پاؤں نکالتے ہی اُس نے ماں کی چوٹی پکڑ کر اسے صحن میں گھمانا شروع کر دیا۔ چھوٹی سی عمر میں اُس نے گلی اور پھر گاؤں بھر کے لڑکوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ہٹ چھٹ ایسا کہ ذرا سی گرمی آئی تو تڑاخ سے تھپڑ مقابل کے منہ پہ۔ بسیار خوری کے سبب وہ ناک کی بجائے منہ سے سانس لیتا تھا۔ اور جب اپنے حریف پہ جھپٹتا تھا تو ایسی مجنونانہ تندی کے ساتھ کہ جیسے دوسرے کی جان لے کر رہے گا۔ بڑے بوڑھوں کو اس چھوکرے کے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن ایک روز وہ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ کئی روز سے وہ چین لال پنساری سے تقاضہ کرتا رہا کہ وہ اسے شہر کی سیر کرا لائے۔ چین لال بھی وعدہ کرتا رہا لیکن کئی دنوں تک اُسے بھی شہر کی طرف جانے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ اس پہ غالباً پالی کو اور زیادہ انتظار کرنا مشکل معلوم ہوا وہ خود ہی غائب ہو گیا۔ پھر کیا تھا سنداں نے سارا گاؤں سر پہ اُٹھا لیا۔ بیچ میدان کھڑے ہو کر بھوری بھینس کی طرح ننھا نے بلا بلا کر اور بھوں بھوں کر کے جو رونے پہ آئی تو بس دریا بہا دیئے۔ چین لال نے یہ حال دیکھا تو پرمیشر کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ اگر وہ ایسے نٹ کھٹ چھوکرے کو اپنے ساتھ شہر میں لے جاتا اور کہیں وہ غائب ہو جاتا تو یقیناً اسے چین کی بلسری بجانی بھول جاتی بلکہ پنجابی محاورے کے مطابق دنیا میں اس کا "دانہ پھکا" ہی ختم ہو جاتا۔ سنداں کے واویلا کرنے پہ چند لوگ شہر کو دوڑائے گئے۔ انھوں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن برخوردار پالی کو ملنا تھا نہ ملا۔

سنداں نے بھی اپنے چہیتے بیٹے کی جدائی میں اپنا یہ معمول بنا لیا کہ صبح کے وقت اُٹھ کر باسی روٹی پہ مکھن کا گولہ دھرا اور چٹ کر گئی۔ پھر کچھ دیر لیٹی رہی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پھر تھوڑا بہت رو دھو کر پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور سو گئی۔

سنداں کے دل کو کافی چوٹ پہنچی تھی۔ ذہنی کرختگی میں بھی زیادہ نہیں لیکن انیس بیس فرق ضرور دکھائی دینے لگا۔ بڑھاپے کے سبب قویٰ میں بھی

اضمحلال پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے زبانی بانگرو بانگرو کہنے پر اکتفا کرنے کی بجائے اس نے روزانہ تو نہیں البتہ سنکرات کے سنکرات گردوارے میں جا کر گربانی سننی بھی شروع کر دی۔ گرنتھی جی کے خوبصورت لمبی لمبی مونچھوں میں پوشیدہ منہ سے نکلتی ہوئی سچے گورو کی سچی بانی کا اگرچہ وہ ایک لفظ تک نہ سمجھ پاتی تھی لیکن وہ بغور اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہتی تھی اور ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ وہ واقعی اچھی باتیں ہی کہتا ہے۔

——— کئی برس بعد جب اسے کلکتے سے اپنے بیٹے پالا سنگھ کی چٹھی آئی تو بس وہ باؤلی ہو گئی۔ اُس نے کئی آدمیوں سے وہ چٹھی پڑھوائی۔ تاکہ کسی غلطی کا کوئی امکان نہ رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر اسے ساری چٹھی زبانی یاد ہو گئی۔ اس نے گاؤں کی ہر عورت کو یہ خبر سُنائی۔ راستہ چلتے وہ کسی عورت کو دیکھ کر رُک جاتی۔

"ہا بھین ——— میرے بیٹے پالی کی چٹھی آئی ہے کالے کُتے سے"

وہ عورت رُک جاتی "بھلا ہو اچھین تو نے پہلے بھی بتایا تھا"

کئی عورتوں کو وہ یہ خبر دوبارہ سہ بارہ سنا چکی تھی۔ لیکن وہ ہر مرتبہ یہی سمجھتی کہ وہ پہلی مرتبہ یہ خبر سنا رہی تھی۔ یہ معلوم کر کے کہ اس نے یہ خبر دوبارہ سُنا دی ہے وہ اپنی گدلی آنکھیں اُٹھا کر مقابل والی عورت کے چہرے پہ گاڑ دیتی۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں کی جھریاں اور بھی گہری ہو جاتیں۔ اور اس کے چہرے پہ درد و کرب کے ہلکے آثار دکھائی دینے لگتے اس پہ وہ عورت پوچھ لیتی۔

"تو بھین وہاں کیا کام کرتا ہے؟"

اس پہ سنداں کی خوفناک باچھوں پہ پھیلتی ہوئی مسکراہٹ بڑی عجیب سی دکھائی دیتی۔ تشکر اور یگانگی کے جذبات کے ہجوم میں وہ گدلی آنکھیں پانی کی باریک تہ میں ڈوب کر اوپر سے چلی جاتیں۔

"کالے کتے میں ڈرے بر (ڈرائیور) ہے ——— بوٹر چلاتا ہے"

سننے والی عورت کو دل میں بڑا تعجب ہوتا کہ پالی اور کام کرے۔

چند ہی دن بعد سنداں نے فیصلہ کیا کہ وہ پالی کو ملنے کے لئے کالے کُتے (کلکتے) ضرور جائے گی۔ ہر چند اس کے پاس دام تھے لیکن اُس نے بلاٹکٹ ہی جانا مناسب سمجھا۔ راستے میں ریل سے اتاری بھی گئی لڑائی جھگڑے بھی ہوئے۔ لیکن وہ لڑتی بھڑتی کلکتے تک پہنچ ہی گئی ——— وہاں پہنچ کر جب اُس نے پالی کو دیکھا تو اسے پہچان نہ سکی۔ کہاں وہ چھوٹا سا لڑکا اور کہاں اب اس کی پگڑی کا اُٹھا ہوا شملہ چھت کو چھوتا تھا۔ جب اُس نے اُسے پہچان لیا تو وہ رونے لگی۔

وہ چند دن بیٹے کے پاس رہی۔ وہ اسے اپنے ہمراہ گاؤں لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن پالا سنگھ نے کہا کہ وہ کچھ عرصہ ٹھہر کر آئے گا۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو پالی نے اسے ٹکٹ خریدنے کے لئے پیسے نکالے جو اس نے اس سے لے کر اپنی گرہ میں باندھ لئے کہنے لگی میں آگے جا کر خود ہی لے لوں گی۔ بیٹا تو فکر مت کر۔

واپسی پہ پھر بلاٹکٹ ہی آئی۔ اور آتے ہی اس گناہ کی تلافی کے طور پہ سنکرات کے دن سوا روپیہ کا کڑاہ پرشاد کروا دیا۔

گاؤں بھر میں گھوم پھر کر اس نے گھر گھر اپنے بیٹے کی بابت کُل تفاصیل بہم پہنچائیں۔ اور اپنے مخصوص انداز میں اُس نے بیٹے کی شکل و صورت، اور طاقت و جرات کا بھی ذکر کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ عنقریب ہی گاؤں واپس آ جائے گا۔ در پردہ لوگوں کو یہ ایک قسم کی دھمکی تھی کہ تم جو آج کل ہمارا دبدبہ تسلیم نہیں کرتے میرا بیٹا آ کر سب باتیں مٹھ کے زور پہ منوا لے گا۔

گاؤں میں پہنچ کر سنداں نے خطوں کا تانا بانا باندھ دیا اور ہر خط میں بیٹے کو گاؤں واپس آنے کی تاکید ——— بار بار تاکید کی جاتی تھی۔

لیکن اُس کا نور نظر اس دوران میں جیل کی ہوا کھانے چلا گیا۔ اس کی چٹھیوں کا جواب بھی نہ آتا تھا۔ آخر جب وہ ایک مرتبہ پھر "کالے کُتے" جانے کو تیار ہو رہی تھی تو پالی کے ایک دوست کی چٹھی ملی۔ جس میں لکھا تھا کہ پالا سنگھ فوج میں بھرتی ہو کر برما چلا گیا ہے۔ چٹھی ملنے پہ گاؤں پہنچ جائے گا۔ یہ چٹھی غالباً پالی

کی ہدایت کے مطابق ہی لکھی گئی تھی۔"

اس پر سنداں چپ ہو رہی۔ دن میں دو گھڑی ہاتھ باندھ کر واہگورو کا ورد کر کے دعا مانگتی کہ اس کا بیٹا لڑائی سے صحیح و سلامت واپس پہنچ جائے۔ چنانچہ ایک دن واقعی اس کی دعا قبول ہو گئی۔

اتفاق کی بات اس روز بہو نے اٹھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ جوہڑ سے تین چار تسلے گیلی مٹی کے لے آئی۔ اور اپنے مکان کی کچی دیواروں میں جو رخنے پیدا ہو گئے تھے انہیں گیلی مٹی سے بھر دیا۔ اور پھر اپنی ساس کی مدد سے بھس ملے تپلے گوبر سے سب دیواریں لیپ ڈالیں۔ کہیں دوپہر تک یہ کام ختم ہوا تو پھر جلدی سے روٹی کھا کر گھر کے سب برتن مانجھ کر چمکا ڈالے اور پھر انہیں قرینے سے ٹکا دیا۔ اس دوران میں سنداں چرخہ گھماتی رہی۔ جو عورت بھی ملنے کے لئے آتی تو کہتی "سبھے! آج تو گھر جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ آخر یہ کس بات کی تیاریاں ہیں؟"

اس قسم کی باتیں سن کر بہو کی ناک مارے خوشی کے سرخ ہو جاتی لیکن سنداں بڑی سنجیدگی سے کہتی "اری تیاریاں کس بات کی ہوتیں۔ کئی دنوں سے لپائی نہیں ہوئی تھی تم جانو بہو ٹھہری جوان ـــــــ آج جو کام کرنے پہ آئی تو دیکھو دوپہر تک سارا گھر اندر باہر سے لیپ ڈالا ـــــ اب ہمارا کیا ہے ایک سانس آیا دوسرے کی خبر نہیں ـــــ"

"تم تو سدا سے یہی کہتی آئی ہو۔ آخر تمہیں ہوا کیا۔ دھرم نال جیسی صحت تمہاری ہے گاؤں بھر میں کسی کی نہ ہوگی۔ اپنی عمر تو سوچو کتنی ہے اور پھر بھی کیسا دم خم ہے ـــــــــــ"

بڑھیا دل میں خوش ہوئی لیکن بظاہر ناک بھوں چڑھا کر بولی "اب کیا ہے ہمارا کھایا پایا تن کو لگتا نہیں جب سے میرا پالی ـــــــــــ"

شام کے وقت جب سنداں تنور گرم کرنے کے لئے چھت پہ سے کپاس کی چھڑیاں لینے کے لئے گئی ہوئی تھی اور اس کی بہو اپنی چندھی آنکھوں سے صحن میں بیٹھی چرخے کا تکلا سیدھا کر رہی تھی تو ڈیوڑھی میں بھاری بھاری قدموں کے دھمکوں کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ ڈیوڑھی کے دروازے میں سے ایک بلند و بالا مرد سر جھکا کر گزرا اور صحن میں آن کھڑا ہوا۔

بہو نے اجنبی کو دیکھتے ہی چھوٹا سا گھونگھٹ نکال لیا اور کنکھیوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ آخر یہ کون ہے۔ گاؤں کے مردوں کو تو وہ پہچانتی تھی لیکن اس گھنی بھنووں، عقاب کی سی تیز آنکھوں والے شخص کو وہ نہ پہچان سکی۔ اس کا شوہر باہر گیا ہوا تھا۔ بچے گلی میں شور و شرابا کھیل رہے تھے۔ وہ یہ دریافت کرنے ہی کو تھی کہ بھائی تم کون ہو ـــــ کہ چھت سے سنداں نے صحن کی طرف جھانک لیا اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور اس کے حلق میں سے انسان اور حیوان کی ملی جلی سی آواز نکلی "وے پالی"

شکر ہے سنداں نے چھت ہی سے صحن میں چھلانگ نہیں لگا دی۔ بلکہ سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ اور یوں آواز آئی جیسے سیڑھیوں سے کسی نے بھاری سِل لڑھکا دی ہو۔ نیچے اترتے ہی وہ بگولے کی طرح اڑ کر بیٹے کے گلے کا ہار ہو گئی۔

اس وقت بہو کو یاد آیا کہ اس روز صبح سے شام تک کوا منڈیر پہ کائیں کائیں کرتا رہا تھا اور اس کی آنکھ بھی پھڑکتی رہی تھی۔

جب سنداں کے حواس ٹھکانے آئے تو اس نے اپنا مردنما کرخت ہاتھ پھیلا کر بہو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہیں وے! تو نے پہچانا نہیں۔ یہ ہے تیری بھابی ـــــ ناہاں؟"

پالا سنگھ کو بھابی کے پاؤں چھوتے وقت آسمان سے زمین پر اترنا پڑا۔ بھابی نے بھی اس کی پیشانی چومنے کی فکر میں منہ جو بڑھایا تو جلدی میں اس کی لمبی ناک کی نوک ہی اس کی پگڑی کے سرے کو چھو پائی پھر اس نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنی کنپٹیوں پہ جمائیں گویا اس کی سب بلائیں اپنے سر لے لیں۔

پھر جلدی سے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک چارپائی گھسیٹ کر صحن کے بیچ میں ڈال دی گئی۔ مارے خوشی کے سنداں کے پاؤں زمین پہ نہ

پڑستے تھے۔ تاباں بھی کچھ کم خوش نہ تھی۔ شکل وصورت تو اس کی واجبی ہی تھی لیکن وہ دل کی صاف اور کھوٹ سے یکسر مبرا تھی۔ اس نے بھی سنداں کی زبانی ان کے آباؤ اجداد کے کارناموں کی مبالغہ آمیز داستانیں سنی تھیں جنہیں سن کر وہ پہلے پہل تو واقعی مسرت محسوس کرتی رہی لیکن بعد ازاں اس کا جوش وخروش کم ہو گیا تھا۔ اس کا شوہر پکا اجڈ اور موٹی عقل کا آدمی تھا۔ کسی پر رعب گانٹھنا تو جانتا ہی نہیں لڑ پڑے تو بے مطلب کی بات پہ اور اگر خوش ہوئے تو وہ بھی بے معنی بات پہ۔ اسے خواب میں بھی خیال نہیں تھا کہ اس کا دیور ایسا کرارا جوان ہوگا۔ اگرچہ بچپن میں پالی کی آنکھوں میں حیوانی چمک موجود تھی لیکن اس کے باوجود چونکہ اس نے مکمل طور پہ ہاتھ پاؤں نہیں نکالے تھے اس لئے گاؤں کی عورتوں نے اسکا ذکر گرم جوشی سے کبھی نہ کیا تھا۔ وہ تو اسے صحن میں کھڑا دیکھ کر سچ مچ ڈر گئی تھی۔ کیسے ترشے ترشائے خدوخال اور کیسی جسم سے آر پار ہوتی ہوئی متجسس آنکھیں تھیں اس کی۔ کیا ہی بلند و بالا قد اور مردانہ تیور تھے۔

تھوڑی دیر میں بچے بھی شور مچاتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔ صحن میں ایک اجنبی آدمی کو دیکھ کر وہ چپ ہو گئے اور جب انہیں دلاسہ دلایا گیا کہ یہ آدمی ان کا حقیقی چچا ——— کالے کتے" والا چچا ہے ——— کوئی چور اچکا یا قاتل نہیں) تو وہ شرما شرما کر اس کے قریب آنے لگے پالا سنگھ نے بھی اپنی گٹھڑی کھولی اور اس میں سے مٹھائی نکال نکال کر بچوں میں بانٹنے لگا مٹھائی کھا کر بچوں کو اس کے حقیقی چچا ہونے کا یقین آ گیا۔ اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ اس کی مضبوط پیٹھ پہ چڑھ بیٹھنے پر بھی وہ ان کا ٹیٹوا نہیں دباتا تو پھر وہ بالکل ہی مانوس ہو گئے۔

صبح کی دال بنی پڑی تھی۔ گھر والوں کا پروگرام یہ تھا کہ چولھا گرم نہ کیا جائے صرف تنور پہ روٹیاں پکا لی جائیں اور دال ہی کھا پی کر سو رہیں۔ لیکن اب چونکہ پالا سنگھ آ گیا تھا اس لئے تاباں نے تو مڑکے اپلے توڑ تاڑ کر چولھے میں ٹھونس کر نیچے سے کپاس کی چند نازک چھڑیاں جلانی شروع کر دیں اور بڑی لڑکی کو بڑیوں کی ہانڈی اٹھا لانے کے لئے کہا۔

سنداں مارے خوشی کے گھر کے اندر باہر گھوم رہی تھی۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے آگے سے گزرنے والے ہر مرد اور عورت کو پالی کے آنے کی خوشخبری سناتی تھی۔ لوگوں کو پالی سے کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے بچپن کے ساتھیوں کے بڑے بوڑھوں میں سے بعض کو اس کی صورت تک یاد نہیں تھی۔ لیکن چونکہ عورتیں ان معاملات میں زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ اندر چلی آتیں۔ اسے ایک نظر دیکھ کر واقعی اس کی شخصیت سے متاثر ہوتیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد دعائیں دیتی چلی جاتیں۔

پھر اس کی ماں لہنا سنگھ کو ڈھونڈنے کے لئے گھر سے باہر چلی گئی۔ پالا سنگھ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اسے فضا کی اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے پرلے سرے پہ آباد ایک بہت بڑے شہر میں کئی برس گزارنے کے بعد وہ واپس لوٹا تھا۔ اور گاؤں کی نسبتاً خاموش فضا، صحن کے گوشے میں ٹمٹماتا ہوا دیا۔ اور وہ میلے کچیلے بچے ——— اسے یوں احساس ہوتے لگا جیسے وہ کسی اجنبی ماحول میں آ گیا ہو۔ اور اسے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا کہ وہ سچ مچ اس جگہ رہ بھی سکے گا یا نہیں۔ دراصل وہ ماں کے اصرار کے باوجود آنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن پھر دفعتاً اسے سرنی کی یاد آ گئی رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا دل سرنی کی فرقت میں تڑپ رہا ہے۔ جیسے وہ اس کی اپنی امانت ہو دولت ہو۔ جس کی خبرگیری کرنا جسے دوسروں کے چنگل سے بچانا اس کا اولین فرض ہو۔

وہ اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف ٹیکے کھوئی کھوئی نظروں سے بھابی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بھائی کی شادی بھی اس کی غیر موجودگی میں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں بھابی کا جو تصور تھا، وہ قطعاً اس کے برعکس نکلی اس کی بھابی تاباں کا جسم دیہاتی لڑکیوں کی مانند خوب مضبوط تھا۔ لیکن منہ تپلا تھا۔ قدرے لمبوترا۔ ناک گویا سارے چہرے کو پیچھے چھوڑ کر آگے کو بھاگ نکلی تھی۔ آنکھیں چندھی جن کے گوشے سرخ اور پرنم۔ اگر کوئی چیز خوب صورت تھی تو اس کے بال اور چھاتیاں گھنے اور لمبے بالوں کی لمبی چوٹی اس قدر بوجھل تھی کہ اس کے سر کی معمولی حرکت سے تو اس میں جنبش ہی پیدا نہ ہوتی تھی۔ اس کی چھاتیاں خوب تنی ہوئی اور ان کی نوکیں آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ دفعتاً بھابی نے چولھے کی آگ کی روشنی میں جھلملاتا ہوا چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا اور اس کی جانب چندھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے

پوچھنے لگی۔ "کیا دیکھ رہے ہو میری طرف ؟" بڑے بڑے کے دہانے کی طرح پالا سنگھ کا منہ کھل گیا اور اس کے سامنے کے ایک دانت میں جڑی ہوئی سونے کی کیل جگمگا اٹھی۔

"کیوں تمہاری طرف دیکھنا گناہ ہے کیا" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"کوئی دیکھنے کی چیز بھی ہو ؟" یہ کہہ کر بھابی نے بڑے حلم سے سر نیچے جھکا لیا۔

"ہا ہا —— بھابی دیکھنے کے لئے آنکھ چاہئے آنکھ —— کیوں ٹھیک کہتا ہوں نا"

تاباں کا جی اس قسم کی چہلوں کے لئے ترس گیا تھا۔ بھابی دیور کے رشتے ہی میں اس قسم کی ہنسی ٹھٹھول کی باتیں کی جا سکتی تھیں۔ اور وہ تو بچپن ہی سے بڑی نٹ کھٹ اور ہنسوڑ لڑکی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو اپنے گھر چلے آئے۔ ہائے تم کس قدر سنگ دل ہو۔ تمہارا گھر آنے کو جی تک نہ چاہتا تھا ؟"

"کیوں نہیں —— واہ بھابی یہ بھی خوب کہی ——"

پالا سنگھ نے طبعی خوش مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا "تمہیں دیکھنے کو تو جی ترس گیا تھا میرا ——"

تاباں اصل نکتہ سمجھ کر زور سے ہنس پڑی۔

"تم تو بکتے ہو بکتے —— یاد کرنے کی بات تو کچھ ہمارے دل سے پوچھو —— تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور میں ہر روز بے بے کے منہ سے تمہاری ہی کتھا سنا کرتی تھی۔ تم کیا جانو تمہیں دیکھنے کو کس قدر دل ترستا تھا ہمارا۔"

پالا نے ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا "لیکن بھابی مجھے دیکھ کر تو ساری چوکڑی بھول گئی ہوگی ایک دفعہ —— میرے درشن پا کر تو اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں بھلا تم کس کھیت کی مولی ہو ——"

اس پر تاباں ہاتھ میں بیلن پکڑ کر اسے دکھا دکھا کر دھمکی کے طور پر اسے ہلانے لگی۔

"نہیں بھابی سچ کہو —— دھرم سے —— بس میری قسم تمہیں جو جھوٹ بولو ایک لفظ بھی ——"

اس پہ تاباں نے بیلن ایک طرف رکھ دیا۔ "نہیں سچ پوچھو تو واقعی میں ڈر گئی تھی —— آخر کس باپ کے بیٹے ہو۔"

"نہیں بھابی سچ سچ بتاؤ تم کیا سمجھ بیٹھیں۔"

"کہہ تو دیا بس ڈر گئی تھی ——"

"نہیں بھابی —— ذرا تفصیل سے"

"ہٹاؤ بس ——"

"بھئی یوں نہیں ہم تو پوچھ کر رہیں گے۔"

تاباں نے دوپٹہ کھینچ کر اسے سر پر اوڑھ لیا اور ایک لمحہ بھر اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ چند ہی آنکھوں میں شرارت کی چمک پیدا ہو گئی۔

بچے بھی ان کی چھیڑ چھاڑ میں دلچسپی لے رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا "بتاؤ نہ ماں —— جب چاچا اندر آیا تو تم نے کیا سمجھا کہ کون آ گیا ہے ؟"

"پہلے تو پاؤں کی دھمک کی آواز سے میں یہ سمجھی کہ کوئی ہاتھی ہماری ڈیوڑھی میں گھس آیا ہے۔ اور پھر جب تم صحن میں آن کھڑے ہوئے تو میں جو اوپر دیکھنے لگی تو بس اوپر ہی اوپر دیکھتی ہی چلی گئی اور میں نے دل میں کہا کہ اس آدمی کا منہ بھلا کہاں پہ ہو گا ——"

اس بات پر سب بچے خوب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"اور جب منہ دکھائی دیا تو پگڑی کے اُٹھتے ہوئے شعلے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے بادلوں میں گھل مل گئے ہوں جاکر ———"

اس بات پر پھر بچوں کو بڑے زور کی ہنسی چھوٹی۔ اور ایک بچہ چارپائی پر چڑھ کر چچا کی پگڑی کا اٹھا ہوا شملہ اوپر کی طرف کھینچ کر جو سچ مچ بادلوں کے ساتھ ملانے لگا تو پگڑی اتر گئی ———"

"او ہئے او سے سور دے پتر" پالا سنگھ نے گالی دی اور اچک کر شرارتی بچے کو پکڑنا چاہا لیکن وہ چیخ کر ہنستا ہوا چارپائی سے کود پڑا اور تیزی سے بھاگتا ہوا پرے چلا گیا۔

گھر میں یہ نئی رونق اور چہل پہل دیکھ کر تاباں کا دل مارے خوشی کے ناچ اُٹھا۔ چہک کر بولی "اب پگڑی اتار ہی ڈالو کب تک مہمان بنے ڈٹے رہو گے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اس کے قریب چلی آئی۔ اور اس کے جوڑے کو چھو چھو کر بالوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی دنوں سے بال دھوئے نہیں ———"

"کمال کرتی ہو بھابی کچھ خیال بھی ہے کتنے دنوں سے ریل میں بیٹھا ہوا ہوں اتنے لمبے سفر میں بالوں کا جس قدر بھی بُرا حال ہو کم ہے۔"

"کم از کم نہا ہی لو۔ تھکاوٹ دُور ہو جائے گی۔ کہو تو پانی بھر دوں کھوہی سے۔"

"میں تو ابھی ابھی نہا کے چلا آ رہا ہوں۔"

"کہاں نہائے تھے۔"

"نہر میں ———"

"کیا بال بھی بھگو ڈالے تھے نہر کے پانی میں۔ تبھی تو میں سوچ رہی ہوں کہ آخر بالوں میں یہ ریتا کہاں سے آیا ———"

"نہیں بھئی سر نہیں ڈبویا میں نے ——— بال سکھانے کا وقت ہی کہاں تھا ——— اور پھر نہر کا پانی تو مجھے تم سے بھی زیادہ اچھی طرح دکھ رہا تھا کہ بال دھونے کے قابل نہیں ہے۔"

ہائے رے بڑا آیا مجھ سے بھی زیادہ دیکھنے والا۔ تیری آنکھیں کون بڑی ہیں"

"بڑی نہیں لیکن بالکل ذرا بھی تو نہیں نا"

تاباں نے ایک ہاتھ ملائمت سے اس کے ٹھینڈے پہ رکھتے ہوئے کہا "کیوں رے آتے ہی میرے منہ آنے لگا . . . ."

"اوہو ہو ہو ——— بھئی دیکھنا خفا مت ہونا ——— تمہارا منہ وہاں ہمارا یہاں ———"

"اچھا اچھا ——— اب کل صبح ہی تجھے پکڑ کر بال دھو ڈالوں گی ———"

"یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عورتوں کو دوسروں کو نہلانے اور ان کا سر منہ دھونے کی اس قدر فکر کیوں ہوتی ہے۔ جب چھوٹا تھا تو ماں نے ناک میں دم کر رکھا تھا اور اب تم پیدا ہو گئی ہو۔"

تاباں نے اپنی سیدھی انگلیوں سے اس کے رخسار پہ ٹھوکا دیتے ہوئے کہا "کاکا میں اب پیدا نہیں ہوئی ہوں بلکہ آج سے پچیس چھبیس برس سے پیدا ہو گئی تھی سمجھے۔"

"ہاں بس سمجھ گیا"

"تو پھر کیا ارادہ ہے"

"ہار مان لی ہم نے"

"لو خوب یاد آیا گھر میں باسی لسّی بھی پڑی ہے"

"اچھی بات ———— بس ادھر صبح ہوئی اور ادھر ہم نے اپنا جوڑا تمہارے ہاتھ میں تھمایا"

"لسّی کو تھوڑا سا گرم کر کے سر میں ڈالیں گے تو پھر دیکھنا میل کیسے نکلتی ہے۔ اور اس کے بعد چندیا پر ————"

"جوتے"

"ہٹ بدتمیز ———— چندیا پہ ٹھنڈا دہی مل دوں گی"

"اور اس کے بعد ————"

"اس کے بعد؟ ———— اس کے بعد گاڑھا ادھ رڑکا"

"آج کل کتنی بھینسیں ہیں ————"

"دو ———— لیکن دودھ ایک ہی دیتی ہے"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر سنداں بھی لہنا سنگھ کو کہیں نہ کہیں سے تلاش کر کے آن پہنچی۔ گلی ہی سے اس کی بلند و بالا آواز سنائی دینے لگی۔ لہنا سنگھ لپکا ہوا چلا آ رہا تھا۔ کھدر کا تہبند لہراتا ہوا جب وہ پالا سنگھ کے عین سامنے آ کھڑا ہوا تو خوشی کے مارے اس کے چوڑے نتھنے پھڑک اُٹھے۔

آنکھ جھپکتے میں دونوں نے پہلے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پھر بغلگیر ہو گئے ————

خاوند کی آمد پر تاباں بھی سگھڑ بیبیوں کی طرح دوپٹہ کھینچ سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور سنداں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے دونوں بیٹوں کے ملاپ کا نظارہ انتہائی محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔

بالآخر دونوں بھائی علیحدہ علیحدہ ہو کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ لہنا سنگھ نے جلدی جلدی ڈاڑھی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا "بلّے بلّے ———— پالی! واقعی تیرا دل بہت سخت ہے۔ ہم تجھے کبھی یاد تک نہ آئے۔ کتنا ترسایا تو نے"

پالا سنگھ کے چہرے پہ خجالت کی ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی

"کیا کہوں بھائی! بس یہ سمجھ لو کہ میرے پاؤں میں چکر تھا۔ مقدر جدھر لیجاتے جاتا تھا میں چلا جاتا تھا"

ایسے اہم موقعہ پہ بھابی نے چپ رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ذرا سنبھل کر فلسفیانہ انداز میں کہا "یہ سب ان جل کی بات ہے"

سنداں کو ان جل کی بات بہت پسند آئی۔ اس نے بھی مدبرانہ انداز میں سر ہلایا "ہا ——بس ان جل ———— ان جل"

لہنا سنگھ نے پگڑی میں ہاتھ ڈال کر جوڑے کو ذرا ڈھیلا کیا ———— "وہ جو گورو صاحب نے کہا ہے کہ دانے دانے پہ مُہر لگی ہوتی ہے ———— اب دیکھ لو اس کی قسمت میں یہاں کا اناج کھانا لکھا تھا سو ہزاروں میل طے کر کے آ پہنچا ہے۔

لہنا سنگھ کو جب کبھی اپنی دانست میں کوئی اہم بات کہنی ہوتی تھی تو وہ اس کی ذمہ داری گورو صاحب پہ تھوپ دیتا تھا "وہ جو گورو صاحب نے کہا ہے ————"

اس کے بعد باتوں کی آندھی چل نکلی ہر کوئی کچھ نہ کچھ کہنے پہ تُلا ہوا تھا۔

لہنا سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

"چھوٹا سا تھا پالا سنگھ جب وہ یہاں سے گیا تھا۔ سب اسے پالی پالی کہا کرتے تھے۔ لو اب دیکھو شکر نال کتنا اچھا جوان نکلا ہے"

سنداں نے نظر بد سے بچانے کے لئے کہا " جوان کہاں بچارے کی ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔ بچپن میں باپ مر گیا۔ ہاں بیٹا پوچھ اپنے بھائی سے کیسے اچھے دن تھے تیرے باپ کے زمانے میں۔ کیا مجال جو لفنگا کوئی آنکھ بھی کھول دے۔ بیٹا تجھے تو باپ کا منہ تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نہ تیری وہ خاطر داری ہوئی۔ نہ وہ خوراک ملی۔ بچپن ہی میں دیس بدیس کی خاک چھاننی پڑی۔ اور پھر یا ناز کی روٹی میں رکھا ہی کیا ہے۔ منہ دیکھو کیسا سوکھ گیا ہے بیٹا۔

سب نے پالا سنگھ کے جنگلی بلے کا سا منہ دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔

تاباں بولی " بے سبب فکر مت کرو۔ گھر میں واہگورو کا دیا سب کچھ ہے۔ کھلی ہوا میں گھومے گا۔ کھائے گا۔ پئے گا تو خود بخود ہی منہ ٹھیک ہو جائیگا۔"

لہنا سنگھ کو بیوی کی بات پسند نہ آئی۔ کھلی ہوا میں گھومے گا کھائے گا پئے گا ——— اس طرح منہ ٹھیک کرے گا ——— یعنی مطلب یہ کہ کام کچھ نہیں کرے گا۔ یہ سوچ کر لہنا سنگھ نے بمشکل خشک گلے کو لعاب دہن سے تر کیا ———

——— ادھر تاباں بھی اپنی چندھی آنکھوں سے ساری حقیقت بھانپ گئی۔ چوڑیاں کھنکا کر بولی " آخر بڑا بھائی بھی تو پتا سمان ہی ہوتا ہے یہ نشانہ عین نشانے پر بیٹھا۔ لہنا سنگھ کا اُڑتا ہوا رنگ عود کر آیا۔ بلکہ اس نے ہاتھ بڑھا کر پالی کے کندھے پر رکھنے میں چنداں ہرج نہ سمجھا " ہاں ہاں کیوں نہیں تو ہمارا وہی ننھا منھا پالی ہی تو ہے جسے ہم گود میں اٹھائے اٹھائے پھرا کرتے تھے "

یہ کہتے کہتے اس کی آواز سچ مچ بھرا گئی اور وہ ذہن پہ زور ڈال کر سوچنے لگا کہ وہ کب پالی کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرا کرتا تھا۔

سنداں نے دم بدم تر ہوتے ہوئے نتھنوں کو میلے آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا " بھائیوں کو تو لوگ اپنے بازو کہا کرتے ہیں ——— اور ان دونوں میں تو بچپن ہی سے بڑا پیار تھا "

سنداں ایسی حساس نہیں تھی کہ وہ سچ مچ ہی یہ سوچنے بیٹھ جاتی کہ ان دونوں میں پیار کب تھا۔

اس دوران میں پالا سنگھ بڑی مسکین صورت بنائے اپنے بزرگوں کے نیک ارادوں اور پریم بھری باتوں کو سنتا رہا۔ عین ممکن ہے کہ لمحہ بھر کے لئے اس کے دل پہ رقت طاری ہو گئی ہو لیکن جب اس کے چرے ہوئے منہ کے دہانے میں اس کا ایک کھونٹے والا کتا دانت چمکا تو اس کی صورت سے ڈر لگنے لگتا لہنا سنگھ کو دنیوی تفکرات، محنت اور مشقت نے وقت سے پہلے کچھ کمزور کر دیا تھا۔ زمین کا زیادہ حصہ چونکہ مقدموں میں بک چکا تھا اس لئے اس کے دل میں بے سہارے پن کا احساس ہمیشہ ہی سے موجود تھا۔ اس نے پالا سنگھ کی طرح طوفانی لہروں میں دلیرانہ چھلانگ نہیں لگا دی تھی۔ شاید وہ چھوٹے بھائی کی طرح تیز و طرار اور چالاک بھی نہ تھا۔ جب ماں کی بات سے اس امر کا احساس ہوا کہ بھائی بازو کا کام دیتا ہے تو اس کے دل کو تسکین محسوس ہوئی۔ اس نے پالا سنگھ کے چوڑے کندھوں آگے کو نکلی چوڑی اور سپاٹ چھاتی اور خونخوار تیوروں کا جائزہ لیا تو اس کے دل میں اس بات کا یقین پیدا ہونے لگا کہ اب اس کے دکھوں میں کمی پیدا ہو جائے گی۔ دفعتاً اس نے مسکرا کر پالا سنگھ کی طرف دیکھا۔

" پالی مجھے وہ تیرے یار بشنا اور کشنا وغیرہ بھی ملے تھے "

" اچھا! پالا سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔

" ہاں بھئی! انہوں ہی نے تو بتایا کہ پالی آگیا ہے پہلے تو میں سمجھا وہ مذاق کرتے ہیں لیکن جب وہ قسمیں کھانے لگے تو میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر سیدھا گاؤں کی طرف بھاگا ——— "

تاباں کو یہ بات سن کر نہ معلوم اس قدر تعجب کیوں ہوا " اچھا تو ——— ہم سمجھے بیٹھے تھے کہ سب بے تہیں ڈھونڈنے کے لئے یہاں سے گئی تھی۔

سنداں یہ ابہام نہ سمجھ سکی۔ آخر وہ لینے کو ڈھونڈنے کے لئے نہیں تو کیا کبڈی کھیلنے کے لئے گئی تھی۔ اس نے منہ چڑھا کر کہا۔

"ہائے ہائے میں تو لہنے ہی کو تلاش کرنے کے لئے نکلی تھی"

نہ معلوم یہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی کیونکہ ان لوگوں کو زیادہ دُور کی نہیں سُوجھتی تھی۔ لیکن لہنے نے جب یہ بات سمجھائی کہ لوٹتے وقت بے بے راستے ہی میں مل گئی تھی تب کہیں معاملہ رفع دفع ہوا۔

"ہاں تو میں لہنے کو سارے گاؤں میں تلاش کرتی پھری جب وہ ملا ہی نہیں تو میں کیا کرتی ——"

اس پر لہنا سنگھ نے بھی اپنی پوزیشن صاف کرنی ضروری سمجھی "بے بے میں گاؤں میں تھا ہی نہیں ملتا کہاں سے"

اسی ٹیں ٹیں میں لہنا سنگھ کو اصل بات بھول ہی گئی۔ ہاتھ سے پیشانی دباتے ہوئے بولا "ایک بات یاد آئی تھی۔ بھلا دی مجھے"

سنداں نے اسے اپنے آپ پر حملہ سمجھ کر مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے تو کچھ کہا نہیں"

دفعتاً لہنے کو بات یاد آگئی "ہاں میں —— وہ بات —— بشنا کہتا تھا کہ ہماری لڑائی ہوئی تھی —— ہوئی تھی کیا؟"

"اوہ نہیں —— نہیں تو —— یونہی ہنسی مذاق ——"

سنداں نے ناک پر ہاتھ دھر کر بڑی خوش مزاجی سے ہنستے ہوئے کہا "بے بے بے —— دوست ہیں نا"

اس پر لہنے کو بھی مدبرانہ بات کہنے کا موقع مل گیا "آہا ہا —— دوستی بھی کیا چیز ہے —— اور ہاں وہ لوگ تو گاؤں بھر میں تمہاری آمد کی خبر مشہور کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ بچپن کے سب ساتھیوں کو جمع کر کے ہمارے ہاں پہنچیں —— لیکن میں نے منع کر دیا"

"ہائے ہائے تم نے منع کیوں کیا؟" سنداں کو پالی کے دوست تک بہت عزیز تھے۔

"نہیں نہیں میں نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہی" لہنے نے اس بات کا ثبوت دینے کے لئے کہ وہ کبھی کبھی عقل کی بات بھی کہہ لیتا ہے بتانا شروع کیا —— میں نے بڑے پریم سے انہیں سمجھا دیا تھا کہ ابھی تو پالی تھکا ہوا ہوگا۔ کیونکہ سینکڑوں کوس کا فاصلہ طے کر کے آ رہا ہے۔ اس بچارے کو ملنا جلنا کیا سُوجھے گا۔ آج تو بس کھانا کھا کر سو رہے گا —— کیوں پالی!"

پالی کو اس میں ہنسی کی تو کوئی بات نظر نہ آئی لیکن لہنے بھائی یعنی اپنے باپ کو ہنستے دیکھ کر اس نے بھی اپنے دانتوں کا مظاہرہ کیا۔

اس طرح ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کھانا تیار ہونے پر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اور پھر اپنے اپنے بستروں پر جا کر لیٹ رہے۔

لیکن نیند آنے سے پہلے سوائے باتیں کرنے کے اور کیا چارہ تھا۔ پالا سنگھ بھی کبھی نہ کبھی بول اٹھتا تھا۔ لیکن اس وقت دوسروں کے بولنے کا موقعہ تھا۔ پالا سنگھ کو ہر قسم کے حالات سے باخبر کرنے کے لئے مالی حالت سے لے کر آباؤ اجداد کے کارناموں تک ہر قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پالا سنگھ کو ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ وہ کچھ الجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ خصوصاً ماں اور بھائی کی باتیں تو از حد خشک تھیں لے دے کے بھابی تھی کہ کوئی نہ کوئی مزے دار بات کہہ دیتی۔ پالا سنگھ کے دل میں اگر کوئی کرید تھی تو وہ سسروں کی بابت۔ لیکن اس کا ذکر ہی نہ چھڑتا تھا۔ دوسروں کی زبانی تو اصل حالات کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی ماں کا سسروں کے ہاں آنا جانا ضرور ہوگا۔ یقیناً اگر ان کا قصہ چھڑے تو کارآمد معلومات حاصل ہو جائیں

آخر گفتگو اپنے گھرانے اور رشتہ داروں تک محدود کیوں کر رہتی۔ لہنا سنگھ نے باتوں باتوں میں جب اس بات کا ذکر چھیڑا کہ اس جنگ میں لوگ بڑا روپیہ کما رہے ہیں تو اس پر سنداں نے سسروں کے باپ نرنجن سنگھ کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اب نرنجن سنگھ ہی کو دیکھو۔ بڑا آدمی بنا پھرتا ہے۔ لڑائی سے پہلے کیا تھا۔ یہی کہ دال روٹی اچھی چل رہی تھی۔ زمین سے واجبی کماتے تھے کھاتے تھے۔ اور جب لام لگی (لڑائی شروع ہوئی) تو اس نے کالے بازار میں خوب روپیہ کمایا۔ اب تو گردن تان کر چلتا ہے —— اور تو اور لڑکی کو بھی پڑھنے کے لئے شہر میں اس کی پھوپھی کے پاس چھوڑ دیا۔ اب تو وہ بھی مڈل پاس ہے ——"

پالا سنگھ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے لئے تو کالا "اکھچھر (لفظ) بھینس برابر تھا۔

"واہگورو واہگورو" لہنا سنگھ نے کہنا شروع کیا "اب تو نرنجن سنگھ کی عورت کا مجاج بھی بگڑ گیا ہے۔ کیوں بے بے ———"

"ہاں نہیں تو کیا جھوٹ ———"

تاباں نے مہین آواز میں کہا "پر بے بے عورت کا مجاج اتنا برا نہیں ———"

"برا ہو بھی تو ہمارا کیا بگاڑ لے گی" سنداں نے ناک منہ چڑھا کر کہا۔

" پالا سنگھ کے دل میں شبہ نے سر اٹھایا کہ کہیں اس کی لڑاکا ماں نے ان لوگوں سے تعلقات قطع نہ کر لئے ہوں۔ اس لئے وہ ذرا اہتمام سے کھانس کر گلے کا بلغم صاف کرتے ہوئے بولا "لیکن ماں تم دونوں تو ایک دوسرے کی دھرم کی بہنیں بنی ہوئی تھیں ———"

"ارے بیٹا جب روپیہ آ جائے تو کون کس کا؟"

"تو کیا اب ان کے ہاں آنا جانا نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں بھائی ——— آنا جانا بھی ہے۔ بہنا پا بھی ہے ———" یہ کہہ کر سنداں دل ہی دل میں غور کرنے لگی کہ آخر اسے اپنی دھرم بہن سے شکایت کیا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ گہنے پہننے لگی ہے جو اس کے پاس نہیں ہیں نا" لیکن پالی دیکھو تو بوڑھی ہونے کو آئی۔ آخر اس کا سب سے بڑا لڑکا تو لہنا سنگھ کا ہم عمر ہے۔ لیکن بی بی نشلو گہنے پہننے لگی ہے۔ یعنی جب سے زیادہ روپے آنے لگے ہیں ——— یوں بھی خوب بن ٹھن کر رہتی ہے جیسے نئی نویلی دلہن ہی ہو ———"

اس پر تاباں نے دبی زبان میں کہا "لیکن بے بے اچھے کپڑے پہننا تو کوئی برا نہیں جب واہگورو اکال پرکھ دے تو انسان کیوں نہ پہنے ———"

بہو کی اس بات پر سنداں کا پارہ اوپر چڑھنے لگا لیکن جب پالی نے بھی بھابی کی تائید کی تو اس کا غصہ فوراً اتر گیا۔ نرم لہجے میں بولی

"اچھا تو لڑکی پڑھانے کا کیا فائدہ اسے مڈل پاس کیوں کروایا ابھی تو وہ اسے ایں ——— ایں ——— کیا نام ہے بھلا سا ——— ایں ٹر ——— س بھی پڑھوا دیتے لیکن وہ مردود ایک دم بیل کی طرح بڑھ گئی۔ اسی لئے وہ اسے سکول سے اٹھوا کر گاؤں میں لے آئے ———"

یہ پڑھوانے کی بات پالا سنگھ کو بھی قطعاً پسند نہ آئی۔ وہ پڑھنا لکھنا نکموں کا کام سمجھتا تھا۔ بچپن ہی سے سرنوں اس پر کوئی نہ کوئی رعب گانٹھے رکھتی اور نہیں تو اسے "گندا چوہڑا" کہا کرتی۔ اب یہ نئی مشکل آن پڑی۔ کمبخت نہ معلوم کیا کیا پڑھ گئی ہے۔ نہ جانے کیسی ٹر ٹر باتیں کرے گی۔

اپنی بات بنتی دیکھ کر سنداں نے پھر کہنا شروع کیا "نہ جانے بھائی ٹھیک ہے یا نہیں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ شہر میں کسی کالج کے لڑکے کے ساتھ پھنس گئی تھی ——— بھئی واہگورو ہی جانے ———"

یہ سنداں کی محض من گھڑت بات تھی۔

تاباں یہ بات پہلے بھی کئی مرتبہ اس کے منہ سے سن چکی تھی وہ یہ جانتی تھی کہ اس کی ساس کو محض حسد کے باعث اس قسم کے الزامات گھڑنے میں عار نہ تھا۔ "بے بے یہ تو کسی کی اڑائی ہوئی بات ہے سراسر ——— وہ بچاری تو بالکل معصوم ہے"

"ہو گی" سنداں نے بظاہر انتہائی بے پروائی سے کہا۔ "ہمیں کیا غرض ——— جو سنا کہہ دیا ——— لیکن اتنا تو تم بھی مانو گی کہ جب سے شہر سے ہو کر آئی ہے، اس کے رنگ ڈھنگ ہی اور ہو گئے ہیں ———"

ان دونوں کی باتیں سنتے وقت کبھی تو پالا سنگھ کا خون کھولنے لگتا کبھی سرنوں سے ملنے کا اشتیاق تیز تر ہو جاتا۔

"ہاں ——— جب تین چار برس شہر میں گزارے ہیں تو شہریوں کے رنگ ڈھنگ تو آ ہی جائیں گے۔"

"اور پھر آنکھوں سے کیسی شوخی ٹپکتی ہے۔ کیا لتر لتر زبان چلتی ہے ———"

"یہ تو نہ کہو بے بے! گاؤں کی لڑکیاں کیا کم ہیں، رشیماں، پھیماں، رتنی، بیگماں کیا کم چنچل ہیں"

بھابی کے اس جواب پر پالا سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ اس کی رازداں کا کام بھی دے سکتی ہے۔ غالباً اس کا سرنوں سے بہناپا بھی ہے ورنہ وہ اس طرح اس کی طرفداری نہ کرتی۔

سنداں کو کچھ کچھ تاؤ آنے لگا "بھئی تاباں اب تمہارے ساتھ مغز کون کھپائے — —"

لہنا سنگھ کے بلند ہوتے ہوئے خراٹوں نے اکدم اس کی آواز کو دبا لیا۔ گرما گرمی کسی کو اس بات کی خبر تک نہیں ہوئی کہ لہنا سنگھ کب سو گیا۔

پالا سنگھ نے دونوں میں صلح کرانے کے خیال سے کہا "چھوڑ جانے دو آپس میں جھگڑے سے کیا حاصل؟ ——— آخر ہمیں ان سے کیا واسطہ میرا مطلب ہے کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑتے نا؟"

سنداں نے دوپٹہ اتارا اور مٹھی کے گرد لپیٹ کر گول سا کر لیا اور اپنے سر تلے بطور تکئے کے رکھ لیا۔ اور پھر دفعتاً سر بڑھا کر بڑے پُراسرار انداز میں کہنے لگی "بھئی میری تو وہ بیٹی سمان ہے مجھے اس کا کوئی دکھ تو ہے نہیں ——— میں تو اس کے بھلے کی کہتی ہوں۔ اب دیکھو نا وہ صبح سے بالوں میں لگا نا سیکھ ———"

"کلپ کہو کلپ ——— بے بے" تاباں نے بات کاٹی۔

سنداں کے نتھنوں میں سے غراتے ہوئے کتے کی سی گرگجار آواز نکلی۔ اس نے ایک بار قہر آلود نظروں سے تاباں کی طرف دیکھ کر کہا

"ہاں ——— تو سمجھی ہو ——— وِک لپ ——— لکپ۔ اچھا تو اب اسی پر لڑکوں نے گانا بنا لیا ہے۔

ننگا رکھ دی کلپ والا پاسا   لوکاں بھانے گھنڈ کڈ دی

تم ہی کہو ———"

اس پر تاباں ہنس پڑی "ہائے ہائے ——— بے بے نہ جانے تجھے کون ایسی باتیں بتا دیتا ہے ——— یہ تو بہت پرانا گانا ہے۔ جب ہم بچے تھے تو اس وقت بھی لوگوں کو یہ گانا گاتے سنا کرتے تھے۔"

پالا سنگھ بھی بھابی کے سُر میں سُر ملا کر ہنسنے لگا۔ اس پر سنداں کھسیا گئی اور جواب میں ایک لمبی بناوٹی جماہی لے کر کروٹ جو بدلی تو کچھ ہی دیر لہنے کے خراٹوں سے اس کے خراٹوں کا مقابلہ ہونے لگا ——— البتہ پالا سنگھ کچھ دیر آکاش میں بکھرے ہوئے دھلے، اُجلے تاروں کی جانب دیکھتا رہا۔

پانچواں مقدّمہ

سعادت حسن منٹو

"نقوش" کے کسی پچھلے شمارے میں اس عنوان سے میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہ کر سکا تھا، اس لئے کہ میں سخت بیمار تھا۔ بیمار تو میں اب بھی ہوں، اور میرا خیال ہے کہ سدا بیمار رہوں گا۔ بعض احباب کہتے ہیں کہ تمہاری یہ بیماری ہی سب کچھ ہے ——— یعنی میری مضمون نگاری اور افسانہ نویسی۔

طفیل صاحب، جو اس پرچے کے مالک اور ایڈیٹر ہیں، انہوں نے میرے متعلق ایک مضمون بھی "منٹو صاحب" کے عنوان سے لکھا ہے۔

اس مضمون پر برادرم احمد ندیم قاسمی نے جو بدقسمتی سے امروز کے قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے ہیں . . . . . اس مضمون پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے . . . . نقّاد کے نام سے۔

محمد طفیل کا مضمون "منٹو صاحب" شخصی اور بہت حد تک نجی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہمارے خیال میں طفیل صاحب کو "ان رازہائے درون پردہ" کو درون پردہ ہی رکھنا چاہیئے تھا۔ جو منٹو صاحب کے اور ان کے مراسم سے متعلق ہیں۔ ناشر اور ادیب نیز ایڈیٹر اور ادیب کے تعلقات کا یوں ہی سربازار اعلان ہونے لگے۔ تو نہ ناشروں کو کہیں ٹھکانہ ملے۔ اور نہ ادیبوں کو۔ کمزوریاں اور خامیاں کس میں نہیں ہوتیں۔ لیکن ان کو چھاپے کے حوالے کر دینا کم از کم ہماری نظر میں حد اعتدال سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ درست ہے کہ ادیبوں اور فن کاروں کی ننھی ننھی خامیوں پر سے نقاب کشائی ان کی شخصیت کو زیادہ اُجاگر کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مگر ایسی نقاب کشائی بھی کیا، کہ دوسرا آدمی نکو بن کر رہ جائے۔ مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ طفیل صاحب کی نیت بُری نہیں۔ جذبات کی رو میں آکر وہ چند باتیں ایسی کہہ گئے ہیں۔ جو نہ کہی جاتیں یا یوں نہ کہی جاتیں تو بہتر تھا۔

لہ میں نے بعض وجوہ کی بنا پر اس مضمون کو روکا ہوا تھا۔ اب اسے بطور تبرک پیش کر رہا ہوں۔

کہ جب اس مضمون کو بھی کتابی صورت میں ("صاحب" کے نام سے) پیش کیا۔ تو میں نے نقاد کے جذبات کا پورا پورا احترام کیا ہے۔

(مرتب)

میں اس تبصرے سے پہلے طفیل صاحب کو یہ خط لکھ چکا تھا۔

برادرم۔ السلام علیکم

"کل رات مجھے صفیہ نے بتایا تھا کہ آپ نے مجھ پر نقوش میں مضمون لکھا ہے۔ زیادہ پینے کی وجہ سے مجھ سے ٹھیک پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ چونکہ صفیہ کو مضمون پسند تھا۔ اس لئے اس نے میرے کہنے پر ادھر اُدھر سے سنایا جو مجھے قطعاً پسند نہ آیا۔ یہی سبب ہوا کہ میں نے آپ کو آدھی درجن کے قریب گالیاں دیں اور اس کے بعد مجھے نیند آگئی۔

صبح اٹھ کر اپنی آنکھوں سے مضمون پڑھا تو مجھے پسند آگیا۔ آپ نے جو کچھ لکھا اس سے مجھے انکار نہیں۔ بلکہ اپنی کمزوریوں کے باوجود بے حد خوش ہوں کہ آپ نے جو کچھ لکھا اس میں ہچکچاہٹ کا شائبہ تک نہیں۔ جو کچھ میں ہوں وہ اس مضمون میں موجود ہے۔ بلکہ وافر موجود ہے۔ اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو مجھ میں موجود تھیں مگر میرے لئے محسوس کی حد سے باہر تھیں"۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

میں اب اس کے متعلق کچھ اور کہنا نہیں چاہتا — جو حقیقت ہے اُس سے مجھے کبھی انکار نہیں ہوگا۔ میں اگر شراب پیتا ہوں تو میں اُس سے کیوں انکار کروں ..... میں نے اگر کسی سے ادھار لیا ہے تو مجھے اُس سے بھی انکار نہیں ہونا چاہیئے .... اگر مجھے دنیا اس لحاظ سے بُرا سمجھتی ہے تو سمجھا کرے۔ ہاں اگر دنیا کی ایسی باتوں کے متعلق ہی سوچتا رہتا تو میرا خیال ہے کہ میں سو سے زیادہ افسانوں کا مصنف نہ ہوتا۔

صاحب نقد و بصر فرماتے ہیں" یہ درست ہے کہ ادیبوں اور فن کاروں کی ننھی ننھی خامیوں پر سے نقاب کشائی اُن کی شخصیت کو زیادہ اُجاگر کرنے میں مدد دیتی ہے، مگر ایسی نقاب کشائی بھی کیا کہ دوسرا آدمی نکّو بن کر رہ جائے"۔

مجھے معلوم نہیں کہ طفیل صاحب کے مضمون کے بعد میں نکّو بن کے رہ گیا ہوں یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا۔ مجھے طفیل صاحب کے اس مضمون کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انہوں نے اپنے پیارے بھائی کے وداداروکو محض اس لئے پس پشت رکھا اور میری مدد فرمائی کہ انہیں اپنے بزرگوں کا یہ قول یاد آگیا تھا کہ کسی کی ضمانت ہرگز ہرگز نہیں دینی چاہیئے۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ اگر مجھے ان کی اس کمزوری کا علم ہوتا تو میں کبھی عدالت میں حاضر نہ ہوتا۔ وہ گرفتار ہوتے اور جب وہ کسی ضامن کی تلاش کرتے تو میں اُن سے کہتا کہ حضرت بزرگوں کی اس نصیحت کو پیش نظر رکھیئے جس کو آپ محض مروّت کی خاطر بھُول گئے۔ ضمانت کو چھوڑ دیئے اور چلیئے میرے ساتھ جیل میں۔

جیسا کہ آپ نے اس مضمون کی پہلی قسط میں پڑھ لیا ہوگا یہ میرے پانچویں مقدمے کی روئداد تھی۔

میں اور میرا دوست نصیر انور اسٹیشن پہنچے، ٹکٹ طفیل صاحب نے لے ہی دئے تھے، مگر اب سوال یہ تھا کہ جگہ کیسے ملے ..... ہمارے پاس بیئر کی بوتلیں تو تھیں، مگر گاڑی میں اُن کے لئے بھی جگہ نہ تھی ..... مجھے معاً یاد آیا کہ میرا ایک ہم جماعت یعقوب توفیق لاہور اسٹیشن پر اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔ میں اُن سے ملا، تو انہوں نے فوراً سیٹوں کا بندوبست کر دیا ..... چنانچہ ہم کراچی روانہ ہو گئے۔

جس ڈبے میں ہمیں جگہ دی گئی، اُس میں ایک مولوی صاحب بھی سوار تھے ..... وہ تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے ..... میں نے سوچا کہ یہ تو وبال جان ہو جائیں گے، چنانچہ ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے نصیر انور سے کہا کہ بھئی ایک بیئر کی بوتل تو کھولو ... اُس نے فوراً سیٹ کے نیچے سے ایک بوتل نکالی اور کھول کر میرے حوالے کر دی۔

یہ دیکھ کر مولوی صاحب اپنی تسبیح کے دانے پھیرتے دوسرے اسٹیشن پر اُتر گئے ..... مجھے یہاں ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔

لاہور اسٹیشن پر ہمارے کمپارٹمنٹ میں ایک صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ تشریف لائے ..... صاحب کو بیئر پینے اور نصیر انور برداشت

کر لیتے، مگر صاحبہ کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ . . . اصل میں وہ ہمیں برداشت نہ کر سکتی۔

چنانچہ جب وہ دونوں کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو میں نے صاحب سے کہا "دیکھئے حضرت . . . . ہم شرابی آدمی ہیں . . . . . بیئر کی پندرہ بوتلیں ہمارے پاس پڑی ہیں . . . . ہم پئیں گے اور واہی تباہی بکیں گے . . . . آپ شریف آدمی ہیں اور غالباً اپنی بیوی کے ساتھ ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ آپ کسی اور کمپارٹمنٹ میں جگہ تلاش کر لیں۔"

میری اس گفتگو سے وہ متاثر ہوئے اور باہر چلے گئے . . . . . اب کہ میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو مجھے طفیل صاحب بتاتے ہیں کہ اُن صاحب نے جو اپنی برقع پوش اہلیہ کے ہمراہ تھے، اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ فلاں فلاں ڈبے میں جہاں انہیں جگہ دی گئی ہے، دو بدمعاش بیٹھے ہیں . . . . . . اسٹیشن ماسٹر نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ اُس ڈبے میں تو سعادت حسن منٹو ہے جو کہ بے حد شریف آدمی ہے . . . مگر ان صاحب نے کہا "جی نہیں . . . . . اس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ وہ شرابی کبابی ہے۔"

بہرحال وہ بلا ٹل گئی . . . . . وہ یوں کہ اُن صاحب کو کسی اور کمپارٹمنٹ میں جگہ دے دی گئی اور ہم نچنت ہو گئے۔

کراچی تک کا سفر نہایت ذلیل ہے۔ سیکنڈ کلاس میں بھی اتنی گرد آتی تھی کہ الامان . . بہرحال سفر بیئر کی بوتلوں کے بدولت کٹ ہی گیا۔

میرا خیال تھا کہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا جائے، مگر جیب اجازت نہیں دیتی تھی۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ خواجہ نصیرالدین کے ہاں ٹھہرا جائے، اس لئے کہ میری بیوی نے تاکید کی تھی کہ دیکھو میرے بھائی کے پاس جانا . . . . . . میں نے سوچا کہ ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف میں نے ساری خدائی کو ایک طرف رکھا اور جورو کے بھائی کے پاس چلا گیا۔

بڑا شریف آدمی ہے۔ اس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ماشاءاللہ اچھی ملازمت پر ہے معقول تنخواہ ملتی ہے —— بہت بڑے فلیٹ میں رہتا ہے۔ اتفاق سے اُس کے ساتھ والا فلیٹ خالی تھا . . وہ مجھے اور نصیر انور کو دے دیا گیا۔

مجھے کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں وہاں زیادہ دن کراچی میں رہوں۔ اس لئے کہ بمبئی میں پندرہ برس رہنے کے بعد کراچی میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔

دُوسرے دن ہم مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے . . . . . معمولی سی عمارت تھی . . . . . . ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تشریف فرما تھے ——

مجھ پر یہاں لاہور میں کئی مقدمے چل چکے تھے۔ میں ضلع کچہری کے آداب سے واقف تھا . . . . . . یعنی جہاں ادب آداب کا کوئی واسطہ ہی نہیں میں مجسٹریٹ صاحب کے حضور سراپا بندگی بن کے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور پوچھا "آپ کیا چاہتے ہیں؟

مجسٹریٹ صاحب کے لہجے کی ملائمی میرے لئے بڑی تعجب خیز تھی۔ میں نے عرض کی "جناب میرا نام سعادت حسن منٹو ہے —— آج آپ نے مجھے میرے مضمون "اُوپر، نیچے اور درمیان" کے سلسلے میں فحش نگاری کی دفعہ ۲۹۲ کے ماتحت طلب فرمایا ہے"

آپ نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور کہا "تشریف رکھئے"

میں نے خیال کیا کہ معلوم نہیں انہوں نے کس سے تشریف رکھنے کو کہا ہے، کیونکہ لاہور کی عدالتوں میں تو ایسا رواج نہیں . . . . . . میں کھڑا رہا۔ جب مجسٹریٹ صاحب نے دیکھا کہ میں نے تشریف نہیں رکھی تو انہوں نے دوبارہ کہا "تشریف رکھئے منٹو صاحب!"

میں ان کے میز کے پاس رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا . . . مجسٹریٹ صاحب تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے "آپ اتنی دیر تشریف کیوں نہ لائے؟"

میں نے عرض کی "جناب! میری طبیعت ناساز تھی"

مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا "آپ نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دیا ہوتا"

میں نے جھوٹ بولا "میں اس قدر بیمار تھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیجنے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا"

مجسٹریٹ صاحب نے میرا جھوٹ سُنا اور خاموش رہے۔ اس کے بعد کہا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

میں سوچنے لگا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اصل میں تو میں اپنا چھٹکارا چاہتا تھا ..... مجھے بار بار طفیل صاحب کا خیال آتا تھا جنہوں نے میری ضمانت دی تھی اور بعد میں اُنکو میری لاابالی طبیعت کے باعث صبح سویرے دو سیکنڈ کلاس ٹکٹوں کے ساتھ آنا پڑا تھا۔

میں نے کچھ دیر سوچا اور مجسٹریٹ صاحب سے کہا "مجھے آپ فارغ کر دیجئے ..... میں جلدی واپس جانا چاہتا ہوں" آپ نے فرمایا "اتنی جلدی تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔ میں نے آپ کا مضمون ابھی تک نہیں پڑھا .... انشاء اللہ آج پڑھ لوں گا اور کل صبح فیصلہ سناؤنگا"

میں نے اور نصیر انور نے اُن کو آداب عرض کی اور موٹر سائیکل رکشا میں بیٹھ کر بیئر پینے چلے گئے۔ یہ رکشا مجھے کراچی میں بہت پسند آئی ...... فٹ فٹ کرتی چلتی ہے گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں طے ہوتا ہے۔ اور کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔

دوسرے روز ہم عدالت میں حاضر ہوئے۔ مجسٹریٹ صاحب نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "تشریف رکھیئے"۔

میں نے بنچ پر تشریف رکھ دی۔ آپ نے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور فرمایا "میں نے فیصلہ لکھ لیا ہے" اس کے بعد اُنہوں نے ریڈر کی طرف دیکھا اور اس سے کہا "آج کیا تاریخ ہے"

اُس نے جواب دیا "پچیس"

میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔ میرے کان ایک عرصے سے خراب ہیں۔ میں یہ سمجھا کہ مجھے پچیس روپے کا جرمانہ ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے مجسٹریٹ سے کہا "جناب .... پچیس روپے جرمانہ"

پچیس روپے جرمانے کا یہ مطلب تھا کہ میں اپیل نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت میں سزا بحال رہتی۔

مجسٹریٹ صاحب نے غالباً مجھے پانچ سو روپے جرمانہ کیا تھا۔ مگر جب انہوں نے یہ سنا "جناب پچیس روپے جرمانہ" تو وہ مسکرائے۔ قلم لیا اور جرمانہ پچیس روپے میں تبدیل کر دیا۔

نصیر انور نے فوراً جیب سے پچیس روپے نکالے اور ادا کر دئے اور ساتھ ہی مجھ سے کہا "سستے چھوٹے ہو ..... اپیل وپیل کا جھنجٹ غلط تھا ..... کب تک یہاں عدالتوں کی ٹھوکریں کھاتے رہتے .... کیا تمہیں "ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ یاد نہیں"

مجھے "ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ یاد آ گیا اور میں کانپ کانپ گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اتنی جلدی میری خلاصی کر دی۔

میں مجسٹریٹ صاحب کو آداب عرض کر کے جانے ہی والا تھا کہ انہوں نے مجھ سے کہا "آپ کب واپس جا رہے ہیں"

میں نے جواب دیا "غالباً آج ہی چلا جاؤں گا"

انہوں نے کہا "نہیں ..... آج نہ جائیے .... میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں"

مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ بہر حال میں نے اُن سے کہا "میں کل تک ٹھہر جاؤں گا"

انہوں نے مجھ سے پوچھا "کل چار بجے آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے"

جن جن باروں میں جا کر بیئر پیتا رہا تھا، میں نے ان کا نام لے دیا لیکن وہ پرہیزگار قسم کے آدمی تھے۔ آخر فیصلہ کافی ہاؤس پہ ہوا۔

وقت چار بجے کا تھا، مگر ہم پندرہ منٹ دیر سے پہنچے۔ مجسٹریٹ صاحب موجود تھے آپ سے رسمی رسمی گفتگو ہوئی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد اُنہوں نے مجھ سے بڑے پیار سے کہا "منٹو صاحب! میں آپ کو اس دور کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں ... آپ سے ملنے کا مقصد صرف

یہ تھا کہ آپ یہ خیال دل میں لے کر نہ جائیں کہ میں آپ کا مداح نہیں"

میں سخت متحیر ہوا۔ "آپ میرے مداح ہیں، تو جناب آپ نے مجھے جرمانہ کیوں کیا؟"

وہ مسکرائے "اس کا جواب میں آپکو ایک برس کے بعد دوں گا"

کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ چند باقی رہ گئے ——— دیکھئے مجسٹریٹ صاحب جو اپنے وعدے کے پکے معلوم ہوتے ہیں کیا انکشاف فرماتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

۷ جون ۱۹۵۲ء

———

خداداد کالونی

شوکت صدیقی

اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے سائے میں، دونوں بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ہر طرف کہرے کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ اندھیرے میں وہ بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بالم نے اکتا کر انگڑائی لی اور آہستہ سے بولا "چل یار۔ اب تو نیند معلوم ہو رہی ہے"۔ غازی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اسی وقت سامنے درختوں کے نیچے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اُس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا "سُن! کوئی آ رہا ہے" سنسان سڑک پر قدموں کی آہٹ صاف سنائی پڑ رہی ہے۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ اُس نے جھٹ سے شلوار کے نیفے سے چاقو نکالا اور بالم کی کمر میں کہنی مار کر بولا "لے سالے کام بن گیا"۔ دونوں اندھیرے میں دبے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

آنے والے کے بھاری بھاری جوتوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر اندھیرے میں ایک دھندلا سا انسانی سایہ نظر آیا اور جیسے ہی وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے سامنے پہنچا۔ دونوں لپک کر شکاری کتے کی طرح اس کے سر پر جا پہنچے۔

بالم نے ڈانٹ کر کہا "ہے ٹھہر جا"

اور غازی نے چاقو اس کے سینہ پہ رکھ دیا۔ "سالے، ذرا بھی آواز نکلی تو پورا چاقو اتار دوں گا" نو وارد لمحہ بھر تو بھونچکا سا کھڑا رہا کہ یہ کیا مصیبت نازل ہوئی۔ پھر اُس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"اماں یہ چاقو تو سامنے سے ہٹاؤ۔ تم تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مار ہی دو گے۔ مطلب کی بات کہو تم کیا چاہتے ہو"

اس کی اس دیدہ دلیری پر غازی نے ایک بار تو چاقو والا ہاتھ پیچھے کھینچ ہی لیا۔ دونوں حیرت سے اس پستہ قد کے آدمی کو دیکھنے لگے، جو کانوں پہ گلوبند لپیٹے، سردی سے سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔

بالم نے اپنی بھاری آواز سے ایک بار پھر اُس کو ڈانٹا۔ "ابے کہنا کیا ہے، جو کچھ ہے نکال کر سامنے رکھ دو" فوراً ہی غازی نے چاقو پھر اس کے سینہ پہ رکھ دیا۔ مگر وہ منحنی جسم والا راہگیر اس دفعہ بھی مرعوب نہ ہوا۔ اسی لہجے میں کہنے لگا۔

"اماں پھر تم نے چاقو سامنے رکھ دیا۔ بابا ناراض کیوں ہوتے ہو یہ لو" اُس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اُن سے بولا "لو سنبھالو، پورے

۱۲ آنے کی ریزگاری ہے، البتہ اس میں ایک دونی کھوٹی ہے، بعد میں مجھ کو گالیاں نہ دینا۔ یہ رہا بیڑی کا بنڈل۔ ماچس بھی ساتھ میں ہے۔ کہو تو کرتا بھی اتار دوں۔ اس کو نہ لو تو اچھا ہے۔ ابھی مجھ کو کئی میل جانا ہے۔ سردی میں اکڑ کر رہ جاؤں گا۔"

اس کی باتیں سن کر دونوں بڑے چکرائے۔ غازی نے ریزگاری اور بیڑی کا بنڈل لینے کو تو اس سے لے لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ واپس کر دے یا رکھ لے۔ کم از کم اس وقت کے چائے پانی کا تو خرچہ نکل ہی آئے گا۔ بالم نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ البتہ خاموشی سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ جیبوں کی تلاشی سے جب کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو وہ اس کے پائجامہ کا نیفہ ٹٹولنے لگا۔ وہ آدمی اس کا مقصد بھانپ گیا تھا۔ جھٹ سے بولا "نہیں جی تم میری پوری ننگا جھوری لے لو۔ میں پائجامہ اتارے دیتا ہوں، اچھی طرح دیکھ لو" اتنا کہہ کر وہ ازار بند کھولنے لگا۔

غازی اس کی اس تیزی پر جل کر چیخا "نہیں بے، اس کی ضرورت نہیں۔ سالے زیادہ تیزی دکھائی تو لگاؤں گا دو ہاتھ۔" کہنے کو تو اس نے اکڑ فوں میں یہ بات کہہ دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ آج بڑے پہاڑے سے پالا پڑا ہے۔ بالکل یہی بات بالم نے بھی سوچی۔ مگر اس نے خود پر زبردستی غصہ کا سا عالم طاری کرتے ہوئے، اس شخص کی کمر پر کس کے ایک لات ماری اور چیخ کر بولا۔

"بس سیدھا ناک کی سیدھ میں چلا جا، مڑ کر دیکھا تو سمجھ لینا سالے تمہاری خیریت نہیں"

اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ دونوں خاموش کھڑے اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر نہ جانے غازی کو کیا خیال آیا۔ اونچی آواز سے اس کو پکارنے لگا "ہے ٹھہر جاؤ" اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف چل دیا۔ بالم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ غازی نے قریب جا کر ۱۲ آنے کی ریزگاری اور بیڑی کا بنڈل نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"لے بھئی لے، یہ رہی تیری رقم۔"

اسد فعہ اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے بات کر رہا تھا۔ وہ آدمی کہنے لگا "نہیں جی، تم مجھ کو صرف ایک دونی دے دو کہ ایک کپ چائے پی لوں اور ہو سکے تو ایک بیڑی سلگا کر دے دو۔" غازی اب اس پر مہربان ہو چکا تھا۔ ہنس کر بولا۔

اب تم اس کو رکھ لو۔ چائے ہم تم کو پلائیں گے اور بیڑی کے بجائے، لو یہ سگریٹ پیو"

اس نے جیب سے پاسنگ شو کی ڈبیا نکالی اور سگریٹ دے کر ماچس سے سلگانے لگا۔ بالم نے اس بات پر کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہنس کر بولا۔

"یار ادھر بھی تو ایک سگریٹ بڑھاؤ"

سگریٹ سلگا کر تینوں سڑک پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تین ہٹی کے چوراہے پر ایک چائے خانہ کے اندر جا کر انہوں نے چائے پی۔ جب وہ باہر نکلے تو ایک بج رہا تھا۔ غازی کو وہ شخص کچھ پسند آ گیا تھا۔ اس نے سوچا آدمی اپنے کینڈے کا ہے۔ اگر ساتھ میں آ جائے تو اچھا ہے اسی لئے وہ اس سے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ سردی برابر بڑھتی جا رہی تھی اور ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ غازی کہنے لگا۔

"اماں اس جاڑے پالے میں کہاں جاؤ گے، اپنے ہی ساتھ ٹھہر جاؤ۔ اب رات رہ ہی کتنی گئی ہے۔ نیند نہیں آئی تو چائے کا ایک دور اور چلے گا۔ یہاں تو رات بھر ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔"

ذرا سی حیل و حجت کے بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ٹھہرنے پر رضامند ہو گیا۔ تینوں چلتے چلتے سڑک کے کنارے بنی ہوئی لکڑی کی ایک دوکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ بالم بولا "لو بھئی اپنا ٹھیا آ گیا۔" اس نے جھک کر دوکان کے نیچے دیکھا، پھر غازی سے پوچھنے لگا۔

"موم بتی جلا لوں"

"جلا لو تو اچھا ہے" وہ بولا۔

بالم دوکان کے نیچے گھس گیا۔ اسی وقت اندر سے ایک کتیا نکل کر تیزی سے بھاگی اور ذرا دور ہٹ کر زور زور سے بھونکنے لگی۔ اندر سے بالم کی آواز سنائی دی۔

"لو یار یہاں تو اپنا پلیٹفارم ہو گیا۔ اس حرامزادی نے تو یہاں بستر میں بچے جنے ہیں"

اس کی باتوں کے ساتھ ساتھ اندر سے پلّوں کے پیاؤں پیاؤں کرنے کی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ غازی گھبرا کر بولا "مار دیا حرام کی جنی نے جب ہی تو میں کہوں کہ یہ سالی آج اس طرح کیوں بھونک رہی ہے" بالم وہیں سے بولا۔

"تو ان سالوں کو بستر سے نکال کے کہاں ڈالوں"

غازی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اور ادھر کتیا تھی کہ برابر بھونکے جا رہی تھی۔ وہ غصہ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا "ان کو نکالو گے تو سالے سردی میں مر جائیں گے اور یہ سالی کب سونے دے گی۔ اس حرامزادی نے تو بڑی خاصی مصیبت کھڑی کر دی" جھنجھلا کر وہ کتیا پر لپکا اور اس کے منہ پر ایک لات ماری۔ وہ ٹیں ٹیں کرتی دور چلی گئی۔ مگر ذرا دیر بعد پھر قریب آ کر بے تحاشہ بھونکنے لگی۔ بالم دوکان کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ دونوں بے حد پریشان معلوم ہو رہے تھے۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

"بھئی اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو، چلو میرے ساتھ کسی نہ کسی طرح رات کاٹ لیں گے"

دونوں کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے تھا۔ غازی نے جوش میں آ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا "یار ٹینی تو تو واقعی بڑے کام کا آدمی ہے۔ ورنہ اس حرامزادی نے تو آج رات مار ہی دیا تھا" تینوں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور خداداد کالونی کی طرف چل دئے، جہاں ٹینی رہتا تھا۔ پستہ قد کا وہ مسکین سی شکل و صورت کا آدمی، جس کی دیدہ دلیری سے غازی بُری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ اور جس کے متعلق بالم کا خیال تھا کہ یہ بڑا خطرناک آدمی لگتا ہے کوئی آدھ گھنٹہ بعد تینوں خداداد کالونی پہنچ گئے۔ غازی کو یہ بستی بہت پسند آئی۔ سڑک کے ایک جانب بڑی شاندار کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں، دوسری طرف اونچی نیچی جھونپڑیاں تھیں۔ کوٹھیوں میں کہیں کہیں اب تک روشنی ہو رہی تھی۔ جھونپڑیوں میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔

ٹینی کا گھر کوٹھیوں کے بیچ میں تھا۔ یہ ایک بڑی سی عمارت تھی۔ مگر اس کی تعمیر نامکمل رہ گئی تھی۔ اس کا مالک کوئی ہندو سیٹھ تھا، جو ہندوستان چلا گیا تھا اور یہ عمارت متروکہ جائداد قرار دے دی گئی تھی۔ اس وقت اس میں بہت سے مہاجر خاندان آباد تھے۔ جنہوں نے مٹی کی دیواریں اور پھوس کی ٹٹیاں کھڑی کر کے، سر چھپانے کا ٹھکانا پیدا کر لیا تھا۔ لیکن ٹینی کے پاس پورا ایک کمرہ تھا۔ اوپر چھت تھی۔ فرش بھی پختہ تھا۔ البتہ دیواروں پر پلاستر نہیں ہو سکا تھا۔ دروازہ خود اس نے اپنے صرفہ سے لگوایا تھا۔

ٹینی نے کمرے کے اندر جا کر لالٹین جلائی، تو غازی اور بالم نے بڑی حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ کمرے کے اندر ایک طرف چارپائی پڑی تھی۔ قریب ہی پانی سے بھرا ہوا گھڑا اور کچھ برتن موجود تھے۔ سامنے دیوار پر لکڑی کا ایک تختہ تھا۔ جس پر ایک چوکور آئینہ، تیل کی شیشی اور کنگھا رکھا تھا۔ غازی نے کمرے میں چل پھر کر ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیا اور بستر کے سرہانے پڑی ہوئی فلمی گانوں کی کتاب اٹھا کر لالٹین کی روشنی میں نظریں گڑا گڑا کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ اس کو نہ پڑھ سکا تو ٹینی کے سامنے کتاب ڈال کر کہنے لگا۔

"ابے تو تو جان پڑتا ہے کہ پڑھ لکھ بھی لیتا ہے"

ٹینی انکساری برتنے کے سے انداز میں بولا "نہیں جی، بس یونہی اٹکل پچو سے کام نکال لیتا ہوں" غازی کو جیسے اس کی یہ بات اچھی نہ لگی، اس لئے وہ اس موضوع کو نظر انداز کر کے بالم سے پوچھنے لگا

"کیوں بے کیا خیال ہے۔ یار مجھ کو تو یہ مکان بڑے ٹھاٹھ کا لگا"

وہ بولا" ہاں جی بڑا اچھا گھر اس کے ہاتھ لگ گیا"

ٹیپی اکڑ کر بولا" یوں ہی نہیں ہلا۔ پورے سو روپے خرچ کر کے قبو منہ ہلا ہے"

غازی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا" کیوں نہیں۔ اس سے کم کیا ملا ہوگا۔ پھر جگہ ہی موقع کی ہے۔ ایک ہی دفعہ کام بن جاتے تو وارے نیارے ہو جائیں" بالم نے بھی اس کی تائید کی کہنے لگا۔

"ایک سے ایک بڑھیا کوٹھی بنی ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی موٹی مرغی پڑی ہے"

ٹیپی جو اب تک اپنے گھر کی تعریف سن کر خوشی سے پھول کر کپّا ہو گیا تھا۔ ان باتوں کو سن کر سٹپٹا گیا۔ جلدی میں بیچ میں بول پڑا۔" دیکھو جی یہ اپنا دھندا تم اپنے ہی علاقہ میں کرنا۔ اس بات کی میں باری نہیں پالتا۔ رات یہاں بسر کر لو اور سیدھے سیدھے اپنے گھر کا راستہ لو" بالم کو اس کی یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ تیوری پہ بل ڈال کر بولا۔

"ابے نواب اتنا اکڑتا کیوں ہے۔ چلے نہیں جائیں گے تو کیا یہیں ڈیرے ڈالے پڑے رہیں گے۔ اور تجھ کو زیادہ کھل رہے ہوں تو لے ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔

اتنا کہہ کر وہ چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیپی دھیما پڑ گیا۔ منانے کے سے انداز میں کہنے لگا" یار تو نے حد کر دی۔ میرا یہ مطلب کب تھا۔ چل بیٹھ۔ اب جاڑے پالے میں کہاں جائے گا" غازی نے بھی سوچا کہ اب اس گرم گرم کمرے سے نکل کر باہر سردی میں جانا خاصہ کٹھن مرحلہ ہے کہنے لگا۔

"بالم یار تو بڑا تیز ہے۔ سالا ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ تو نے بھی کس کی بات کا برا مانا۔ ارے یہ ٹیپی تو اب اپنا یار ہو گیا ہے۔ میں نے تو سوچا ہے کہ اس کو بھی ٹولی میں شامل کر لیا جائے۔ آدمی کام کا ہے۔ ذرا اناڑی ہے ٹھیک ہو جائے گا جس دن واڑی لگ گیا اور کرارے کرارے نوٹ سامنے آئے۔ سب بھول جائے گا"

بالم روٹھا ہوا سا بیٹھ گیا۔ ٹیپی ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا" تم دونوں ابھی لونڈے ہو۔ میں تم سے بہت پہلے سارے پاپڑ بیل چکا ہوں۔ چوری بھی کی۔ جانور بھی چلائے۔ جیل بھی کاٹی۔ سارے جتن کر چکا ہوں۔ مگر بھائی خدا ان پولیس والوں سے بچائے۔ موت کے فرشتہ کی طرح ایک بار گھر دیکھ لیا تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کہیں واردات ہوئی خواہ مخواہ پکڑ بلوایا۔ کسی کے یہاں دنگا فساد ہوا، نزلہ سب سے پہلے ادھر گرا۔ اسی لئے گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ بابا اب اپنے میں بوتا نہیں ہے۔ جس دن کھوکھرا پار کی سرحد میں داخل ہوا۔ اسی دن توبہ کر لی تھی کہ اب یہ کام نہیں کروں گا۔ اب تک اللہ میاں کا کرم ہے کہ اپنی بات پہ قائم ہوں۔ تھوڑی بہت جو باقی ہے۔ اسی طرح عزت کے ساتھ گزر جائے تو اس کا لاکھ لاکھ شکر" دونوں خاموشی سے بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہے۔ ذرا دیر کمرے کے اندر خاموشی رہی۔ پھر غازی کی آواز ابھری۔

"پہ یار کریں تو کیا۔ لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں یہاں اللہ کا نام ہے۔ کوئی دستکاری بھی نہیں آتی۔ کام کاج کہیں ملتا ہی نہیں۔ چھوٹا موٹا دھندا کریں تو اس کے لئے رقم کہاں سے لائیں"

ٹیپی کو جیسے پہلے ہی سے علم تھا کہ وہ یہی کہیں گے۔ وہ بڑے اطمینان سے ان کو سمجھانے لگا" کوشش کرو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کہیں محنت مزدوری کرو۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ ابھی تم پولیس کے معلوم ہوتا ہے کہ ہتھے نہیں چڑھے۔ پھر یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ ہر وقت جان سولی پہ کہیں پولیس والا نظر آ گیا، خون خشک ہو گیا۔ خواہ مخواہ ان کی خوشامد کرو اور گالیاں گھاٹے میں کھاؤ۔ بھئی میں تو تمہارے ہی بھلے کی کہتا ہوں"

بالم ابھی تک چپ تھا۔ البتہ غازی کچھ کچھ رضامند ہوتا جا رہا تھا۔ کہنے لگا" اچھا جی، یوں ہی سہی۔ چلو تمہاری بات مانی" ٹیپی نے بیڑی سلگا کر ایک لمبا کش لگایا اور پھر دنیا کے اونچ نیچ دکھا کر ایک لمبا سا لکچر دے ڈالا۔

رات کے پچھلے پہر تک وہ تینوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ہر ایک نے دل کی بات صاف صاف کہہ ڈالی۔ غازی تو پہلے ہی ٹیپی کا مرید ہو چکا تھا۔ بالم بھی رفتہ رفتہ اس کی باتوں پر ایمان لے آیا۔ اس عرصہ میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاصہ گھل مل گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا تینوں اب اکٹھا رہیں گے۔ ٹیپی سویرے اپنے کام پر چلا جائے گا۔ اور وہ دونوں ویسٹ وہارف جائیں گے۔ وہاں جہازوں پہ سے سامان اتارنے کے لئے قلیوں کی بھرتی ہونے والی ہے۔ کچھ عرصہ تک تینوں اسی طرح محنت مزدوری کریں گے۔ اس کے بعد جب ہر ایک کے پاس سو سو روپے اکٹھا ہو جائیں گے تو تینوں مل کر کوئی کاروبار شروع کر دیں گے۔ یہ سکیم تیار کرنے کے بعد ٹیپی نے اٹھ کر فرش پہ بستر بچھایا اور تینوں اسی کے اندر کسی نہ کسی طرح دبک کر سو گئے۔

ٹیپی حسب معمول سویرے بڑے تڑکے اُٹھ بیٹھا۔ اس نے جلدی سے انگیٹھی سلگائی۔ چائے کا پانی چڑھایا۔ تھوڑی دیر میں دودھ والا بھی آ گیا پھیری والے سے اس نے تین بند بھی خرید لئے۔ جب وہ چائے تیار کرکے اٹھا تو دھوپ سامنے میدان میں پھیل چکی تھی۔ وہ دونوں ابھی تک بے خبر سو رہے تھے۔ ٹیپی نے بڑی مشکل سے ان کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دونوں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ٹیپی نے لوٹے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ دونوں منہ ہاتھ دھو کر آئے۔ تو چائے کی پیالیوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کھانے کے لئے بند بھی موجود تھے۔ دونوں کو کئی سال بعد پہلی بار صبح اٹھنے کی خوشی میسر ہوئی تھی۔

تینوں نے چسکیاں لے لے کر چائے پی اور پھر رات کے پروگرام کے مطابق اپنی اپنی منزلوں کو چل دئے۔

شام کو جب ٹیپی پلاسٹک کے کارخانے سے واپس لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ وہ دونوں دروازے پہ پہلے ہی سے موجود تھے۔ دونوں کے نڈھال چہرے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کام بنا نہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قلیوں کی بھرتی تو ہو رہی ہے، پر ٹھیکیدار دس دس روپے فی نفر رشوت لیتا ہے۔ ٹیپی نے ان کو بد دل نہ ہونے دیا۔ ان کی ڈھارس بندھائی۔ کہنے لگا۔

"دل کیوں چھوٹا کرتے ہو، جب محنت ہی کرنا ٹھہری تو جہاز پہ نہ سہی، کہیں اور سہی، ڈھونڈو تو خدا مل جاتا ہے۔ کام کا ملنا کون سی بڑی بات ہے۔"

اس کی باتوں سے دونوں خاصے پُر امید ہو گئے۔ دوسرے دن تینوں پھر گھر سے نکل کر اپنی اپنی سمتوں کو چل دئے۔ اس روز بھی دونوں ناکام لوٹے۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے پاس یہاں آتے وقت جو دو چار روپے بچے رہ گئے تھے، وہ بھی انہوں نے خرچ کر ڈالے تھے۔ ٹیپی کو جلد ہی اس بات کا پتہ چل گیا۔ وہ ان کی اور بھی زیادہ ناز برداری کرنے لگا کہ کہیں وہ دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔ صبح اٹھ کر وہ اسی طرح ان کو چائے پلاتا۔ رات کو تینوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ وہ ان سے بے تکلفی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ مگر وہ ان سے جس قدر بے تکلف ہونا چاہتا تھا، وہ اسی قدر بیگانے سے ہوتے جا رہے تھے۔ اب وہ اس کو ٹیپی کے بجائے اس کے اصلی نام یار محمد سے مخاطب کرتے۔ اس کی خواہ مخواہ خوشامد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس معاملہ میں غیر ارادی طور پر ان دونوں میں ایک مقابلہ شروع ہو گیا تھا کہ کون ٹیپی کی زیادہ خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ اب دن چڑھے تک سونے کی بجائے وہ تڑکے ہی اٹھ کر انگیٹھی سلگا دیتے اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ ٹیپی کے سو کر اٹھنے سے پہلے ہی چائے تیار ہو جاتی۔

ہفتہ بھر کی مدت میں دونوں خاصہ بدل گئے تھے۔ اس بات پہ خود ٹیپی کو بھی تعجب تھا۔ اب اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح دونوں دھندے سے لگ جائیں تو بہت اچھا ہے۔ آخر ایک روز ایسی امید نظر آئی۔ اس کے ایک ملنے والے نے صابن کے ایک کارخانے میں دونوں کے لئے کام کی سبیل نکالی تھی۔ وہ اس دن بڑا خوش خوش گھر واپس گیا۔ ابھی تک وہ دونوں واپس نہیں لوٹے تھے۔ وہ ان کے آنے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں اس کی نظر بستر پر گئی تو وہاں سے رضائی غائب تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب جو اُس نے دوسرے سامان کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ لوٹا بھی غائب ہے۔ اس بات سے اس کو بے حد صدمہ پہنچا۔

وہ رات اس کے لئے کاٹنا دوبھر ہو گئی۔ سردی بھی زیادہ تھی اور ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس نے انگیٹھی سلگا لی اور اس پر جھکا ہوا جسم میں گرمی پہنچاتا رہا۔ جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں تو انگیٹھی کے پاس ہی کنڈل مار کر پڑ جاتا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد آنکھ کھل جاتی۔ پھر کوئلے دہکاتا اور نیند پھر اس پہ حملہ کرتی۔ ساری رات وہ ان دونوں کا انتظار کرتا رہا۔ نہ وہ واپس لوٹے اور نہ وہ گھڑی بھر اطمینان سے سو سکا۔

صبح جب وہ کام پر گیا تو آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں مشین چلاتے چلاتے نیند کا جھونکا آجاتا۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا۔ اس روز اُس نے اُن کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ گھر واپس لوٹتے ہوئے اُس نے بازار سے خالی بوریاں خریدیں اور رات گئے تک اُن کو جوڑ جوڑ کر سیتا رہا۔ ان سے رضائی کی سی گرمی اور آرام تو نہیں ملا مگر نیند آگئی تھی۔

کئی دن بعد کا ذکر ہے کہ وہ بوریوں کے سلے ہوئے ٹکڑے کے اندر دبکا ہوا پڑا تھا۔ کوئی ۱۱ بجے کا عمل تھا۔ ساری آبادی سنسان پڑی تھی۔ اچانک کسی نے دروازے پہ دستک دی۔ ٹینی نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ غازی اور بالم مجرموں کی طرح گردن جھکائے کھڑے تھے۔ ایک کی بغل میں نئی رضائی دبی ہوئی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں چھلکتا ہوا لوٹا لٹک رہا تھا۔ ذرا دیر تک تینوں خاموش کھڑے رہے۔ ٹینی روکھے پن سے بولا۔

"بس بھیا اب تو تم مجھ کو بخش ہی دو اور یہ دونوں چیزیں بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ مجھ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں"

غازی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ پیر سے جوتا نکال کر ٹینی کے سامنے ڈال دیا" دس جوتے مار لو ٹینی بھیا، مگر اپنی زبان سے یہ بات نہ کہو" بالم جواب تک چپ چاپ کھڑا تھا۔ روہانسا سا ہو کر بولا" اب تو ہم یہ طے کر کے آئے ہیں کہ یہ ساتھ چھوٹے گا تو بس اب مر کر ہی چھوٹے گا" اتنا کہہ کر وہ اس کے پیروں پر جھک گیا۔

ٹینی کا غصہ پہلے ہی کافور ہو چکا تھا۔ اُس نے جلدی سے بالم کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑے پیار سے بولا" یار بالم کیا غضب کر رہا ہے۔ تُو تو میرا بھائی ہے" اس نے کھینچ کر اس کو گلے سے لگا لیا۔ بالم بچوں کی طرح رونے لگا۔

پھر تینوں کمرے کے اندر آگئے تو غازی نے سب سے پہلی خوشخبری یہ سنائی کہ اس کو ایک ہوٹل میں کام مل گیا اور بالم نے رکشا چلانے کا دھندا پیدا کر لیا ہے۔ ٹینی کو نئی رضائی اور نئے لوٹے کے لینے سے زیادہ یہ بات سن کر خوشی ہوئی۔

تینوں پچھلے دنوں کی طرح ایک بار پھر بے تکلفی سے گالیاں بک بک کر باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں غازی بولا" ابے بالم، وہ ڈبہ کہاں ہے؟" بالم نے جھٹ سے جواب دیا۔

"ابے یار میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا"

اُس نے ایک نٹ کھٹ چھوکرے کی طرح چھلانگ لگائی اور رضائی کی تہہ کھول کر اس کے اندر سے ایک ڈبہ نکالا۔ اور اُس کو کھول کر ٹینی کے سامنے رکھ دیا۔ ڈبہ کے اندر حلوہ اور پراٹھے تھے۔ تینوں نے مزے لے لے کر کھائے اور رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ٹینی بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں کے چلے جانے سے کمرے میں جو ویرانی برسنے لگی تھی وہ آج کئی روز بعد زائل ہو چکی تھی۔

سویرے اُٹھ کر انہوں نے مل جل کر بڑی مستعدی سے چائے تیار کی اور خوشی خوشی اپنے اپنے کاموں پر چل دئے۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ٹینی کو جیسے یقین ہو چلا تھا کہ اب تینوں مل کر تین سو روپے جلد ہی مہیا کر لیں گے اور پھر کاروبار کرنے کی سکیم پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

انہی دنوں ایک روز خلاف توقع غازی جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ وہ عام طور پر ۱۱ بجے رات تک ہوٹل کا کام نبٹا کر آتا تھا۔ ٹینی نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو گھبرا کر بولا۔

"اماں تم آج جلدی کیوں چلے آئے"

غازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ سلگتی انگیٹھی کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ دہکتے ہوئے کوئلے کی سُرخ آنچ میں اس کا چہرہ پتھر کے مجسمہ کی طرح

ٹھُس نظر آرہا تھا۔ ٹینی نے اس دفعہ اصرار کر کے پوچھا۔

"یار کچھ بتاؤ تو سہی، آخر ہوا کیا؟"

غازی نے اس کی طرف اس طرح نظریں اٹھا کر دیکھا کہ جیسے دکھ سے ابھی وہ رو دے گا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"یار ٹینی، میں نے نوکری چھوڑ دی"

اڈّا دھم ٹینی کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا ایک چھت اس پہ آگری۔ جلدی سے بولا "کیوں؟ آخر کیا بات ہوئی" غازی کہنے لگا۔ بات کیا ہوتی۔ میں کام ختم کر کے لوٹ رہا تھا کہ ۱۲ نمبر کے مسافر نے مجھ کو آواز دی۔ میں اندر چلا گیا۔ وہ آج ہی دوپہر کو اس کمرے میں آیا تھا۔ سالے کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی ہوں گی مجھ سے چھوٹتے ہی کہتا کیا ہے کہ کوئی لونڈیا لے کر آؤ، تم کو بھی خوش کر دوں گا۔ میرے آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہا ابے تو نے مجھ کو کوئی بھڑوا سمجھا ہے۔ سچ کہتا ہوں ٹینی بھائی جاتو نہیں تھا۔ نہیں تو سالے کے ٹکڑے کر ڈالتا۔ خاصی تُو تُو میں میں ہو گئی۔ منیجر بھی وہاں آ گیا۔ وہ سالا الٹا مجھ پہ گرجنے لگا۔ ٹینی بیچ میں بول اٹھا۔

"تم نے منیجر کو پوری بات تو سمجھائی ہوتی"

غازی بگڑ کر بولا "تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اس کو سارا واقعہ نہیں بتایا"

"تب تو یار بڑی زیادتی ہوئی"

وہ کہنے لگا "لو یار۔ اب ہم عورتوں کی دلالی کریں گے۔ تف ہے ایسی زندگی پہ"

وہ دیر تک بیٹھا گالیاں بکتا رہا۔ ٹینی کبھی کبھار بیچ میں بول پڑتا۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے ۱۲ بج گئے مگر بالم ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ دس بجے سے پہلے ہی واپس آجاتا تھا۔ دونوں اس کا انتظار کرتے کرتے لیٹ گئے۔ کوئی ۳ بجے کے قریب ٹینی کی آنکھ کھلی۔ اُس نے غازی کو جگایا۔ "اماں غازی یہ اپنا بالم ابھی تک نہیں لوٹا۔ خدا جانے کیا ہوا" اب تو اس کو بھی تشویش ہوئی۔ دونوں کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ بیٹھے سوچتے رہے کہ اس وقت کیا کیا جائے۔

صبح کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ سردی شدید ہو گئی تھی۔ وہ دونوں یہ طے کر کے باہر جانے ہی والے تھے کہ چل کر بالم کا پتہ لگایا جائے کہ اتنے میں دروازہ کھول کر بالم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ مردے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ غازی نے پوچھا

"اماں کہاں سے آ رہے ہو؟"

وہ بولا "حوالات سے!"

ٹینی نے گھبرا کر کہا "حوالات سے؟ آخر ہوا کیا؟"

وہ بتانے لگا "سالے نے مرغا لگا کر اوپر چڑھا دی۔ ساری کہنی توڑ ڈالی اور حوالات بھی دکھا دی۔ ٹانگ کا الگ یہ حال ہوا" اُس نے شلوار چڑھا کر پنڈلی دکھائی تو اس پہ کالا کالا خون جما ہوا تھا۔

ٹینی نے بڑے دکھ سے سوچا کہ یہ بھی دھندے سے چھوٹا۔ دونوں پہ ایک ہی روز مصیبت نازل ہونے والی تھی مگر اب کیا کیا جائے۔ پھر وہ کئی روز تک یہی بات سوچتا رہا۔ اور وہ دونوں ایک بار پھر روزی کی تلاش میں سویرے ہی سویرے نکل جاتے اور شام کو منہ لٹکائے واپس لوٹتے۔

ایک بار پھر دونوں کی تمام پونجی ختم ہونا شروع ہو گئی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں جھگڑ پڑتے، گالی گلوچ سے بڑھ کر کبھی ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی۔ ایک دوسرے سے بیڑی تک چھپا کر پیتے کہ کہیں دوسرا بیڑی نہ مانگ بیٹھے۔ تنہائی میں وہ ایک دوسرے کے خلاف ٹینی کے کان بھرتے ان میں آئے دن کی بڑھتی ہوئی کمینگی سے ٹینی بے حد پریشان ہو گیا تھا۔

گذشتہ چند روز سے غازی اور بالم میں ٹھنی ہوئی تھی۔ آپس میں بات چیت بھی بند تھی۔ دونوں سویرے سویرے ہی علیحدہ علیحدہ سمتوں کو کام دھندے کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ شام کو جب ٹینی واپس لوٹا تو دونوں میں سے کسی کا پتہ نہیں تھا، رات گئے تک وہ بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں اس کو کئی بار تشویش پیدا ہوئی۔ اُس نے اپنے سامان کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ ساری اشیاء جوں کی توں موجود تھیں۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے دونوں ساتھ ساتھ لوٹے۔ ان کے چہرے خلاف توقع بشاش نظر آ رہے تھے۔ آتے ہی بالم تو ٹینی کے پاؤں دبانے لگا اور غازی نے جھٹ سے بیڑی سلگا کر پیش کی ٹینی ہنس کر بولا "آخر یہ آج اتنی خوشامد کیوں ہو رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے" بالم دانت نکال کر ہنسنے لگا اور غازی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یار محمد (ٹینی) پہلے ہی بھانپ جائے گا۔ اماں اس کے قبضہ میں ضرور کوئی موکل وکل ہے۔ جبھی تو دل کی بات پڑھ لیتا ہے۔"

غازی بھی مسکرانے لگا "اب تو یہ بھانپ ہی گیا ہے۔ تو پھر کہہ ہی دے"

وہ بولا "نہیں یار تو ہی کہہ"

دونوں ایک دوسرے سے اصرار کرنے لگے۔ ٹینی گومگو کے عالم میں بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ سالے نہ جانے آج کیا پروگرام بنا کے آئے ہیں، پریشان ہو کے بولا "اماں صاف صاف کہو بات کیا ہے" غازی کہنے لگا "ٹینی بھائی بات یہ ہے کہ آج ایک جگہ موقع دیکھا ہے" وہ آگے کہتے ہوئے جھجکنے لگا۔ بالم نے فوراً غازی کو سہارا دیا۔

"خدا قسم آج ہی وارے نیارے ہو جائیں گے۔ بس تم اجازت دے دو۔"

ٹینی کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ مگر غازی نے اس کو کچھ کہنے ہی نہ دیا۔ جھٹ سے بولا "صرف ایک دفعہ کی اجازت دے دو۔ آئندہ یہ کام ہو تو کرنے والے کی ۔۔۔!" اس نے ایک زناٹے کی گالی بکی۔ بالم نے ٹینی کے پاؤں اور بھی تیزی سے دبانے شروع کئے۔ غازی نے جلدی سے دوسری بیڑی سلگا کر اس کو پیش کی۔ ٹینی الجھن میں پڑ گیا۔ ناراض بھی ہوا، سمجھایا بھی مگر ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ آج کے بعد وہ کبھی چوری کریں تو دونوں کو جوتے مار کے گھر سے نکال دینا۔ پولیس کے حوالے کر دینا۔ کبھی دونوں کی صورت نہ دیکھنا۔ آخر اس کو ان کی ضد کے سامنے مجبور ہونا پڑا۔

ٹینی کی رضامندی ملتے ہی غازی نے جھٹ سے ٹرنک میں سے چاقو نکالا۔ فرش پہ رگڑ کر اس کی دھار تیز کی اور پوری طرح تیار ہو کر بالم کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ ٹینی نے دیکھا اس وقت دونوں بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ان کے جانے کے بعد باہر کوئی آہٹ بھی ہوتی تو وہ چونک پڑتا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے چاروں طرف خطرہ منڈلا رہا ہے۔

مگر وہ دونوں بڑے ٹھاٹھ سے نکل کر سڑک پہ آ گئے۔ پھر انہوں نے موقع کی تلاش میں سڑک کا ایک چکر لگایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوٹھیوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک گلی میں مڑ گئے۔ اب وہ ایک دو منزلہ مکان کی پشت پہ کھڑے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ کہر کے دھندلکوں نے تاریکی کا جال پھیلا رکھا تھا۔ بجلی کے کھمبے پہ جلنے والا بلب روشنی کے ایک دھبے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

ذرا دیر تک وہ کوٹھی کی چہار دیواری کی آڑ میں کھڑے آہٹ لیتے رہے۔ پھر غازی نے کوئی دعا پڑھ کر اپنے دونوں کندھوں پہ دم کی اور یا علی مدد کہہ کر بلی کی طرح قد آدم دیوار پہ چڑھ کر کوٹھی کے احاطہ میں پہنچ گیا۔ بالم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس وقت وہاں بلا کی خاموشی تھی، درختوں کے سایوں نے تاریکی کو اور گہرا کر دیا تھا۔

سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق غازی، چاقو کو دانتوں میں داب کر پانی کے پائپ کے سہارے چڑھ کر دوسری منزل پہ پہنچ گیا۔ بالم نیچے کھڑا پہرہ دیتا رہا کہ ذرا بھی خطرہ نظر آئے تو وہ سیٹی بجا کر فوراً سگنل دے۔

کوٹھی کے پورچ کے اوپر جو کھلی چھت تھی۔ غازی ذرا دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ اس کمرے کے قریب گیا جس کے اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی اس نے کان لگا کر آہٹ لی۔ اندر قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ مگر کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ پھر بھی اُس نے اندر پہنچنے کی سبیل نکال ہی لی۔ بڑی مشکل سے وہ ایک کھڑکی کے وینٹی لیٹر کے راستے کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ لیکن کمرے میں اس طرح داخل ہونے میں اس کا ایک کندھا بُری طرح چھل گیا۔ ابھی وہ اس کی تکلیف پر غور ہی کر رہا تھا کہ کوئی چیز شور کرتی ہوئی گری۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی منہ کے بل فرش پر آ رہا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا کہ وہ ایک چھوٹی سی میز کے پاس پڑا ہے، اس کی ایک ٹانگ اس میں الجھی ہوئی ہے۔ اس نے اپنی ٹانگ نکالی ہی تھی کہ اچانک کمرے میں سہمی ہوئی آواز ابھری "کون ہے" اور فوراً ہی کمرے کے اندر بجلی کا بڑا بلب جھلکنے لگا۔

سامنے مسہری پر ایک عورت گردن اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ فوراً ہی اس کے برابر سے ایک مرد کا چہرہ ابھرا۔ عورت نے خوف سے چیخ کر کہا "چور، چور" سناٹے میں اس کی آواز بڑی بھیانک معلوم ہوئی۔ اس کے برابر لیٹے ہوئے آدمی نے جھٹ سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور لحاف کے اندر سے نکل کر بیٹھ گیا۔ غازی نے چاقو ہاتھ میں سنبھالا اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھاگنے کے لئے کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی اور برابر والے دروازے کی طرف لپکا۔ اسی وقت زینہ پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ غازی کے قدم وہیں رُک گئے۔

ذرا دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ غازی نے چاقو اوپر اٹھا لیا اور دروازے کی طرف اس طرح رُخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ کہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہو وہ اس پر حملہ کر دے۔ باہر سے آواز آئی۔

"کیا ہوا بیگم۔ کیا ڈر گئیں؟"

وہ دونوں بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ باہر سے پھر آواز آئی "دروازہ تو کھولو" اس دفعہ اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عورت جواب تک خاموش تھی منمنا کر بولی "کون ہے بھئی؟ کاہے کا شور مچا رکھا ہے" وہ باہر سے بولا

"میں ہوں ڈارلنگ، تمہارے کمرے سے ابھی چیخنے کی آواز آئی تھی"۔

وہ کہنے لگی۔ ہاں، میں نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا، سرہانے بیٹھے ہوئے شخص نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر ہاتھ کے اشارے سے باہر والے آدمی کو واپس لوٹنے کا اشارہ کیا۔ عورت فوراً ہی بولی "آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ جائیے اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجئے" مگر وہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔

"نہیں نہیں اس وقت مجھ کو تمہارے پاس ہونا چاہئیے"

وہ ناز سے بولی "بھئی اللہ پریشان نہ کیجئے۔ بڑی گہری نیند آ رہی ہے" اور اس کے ساتھ ہی اُس نے بیڈ سوئچ دبا کر بڑے بلب کو بجھا دیا۔ اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

جب اس کے قدموں کی آواز زینہ پر ختم ہو گئی۔ تو غازی کے ہوش بھی ٹھکانے ہوئے۔ اب وہ ان دونوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے دیکھا دھندلی روشنی میں مرد سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس وقت مادر زاد برہنہ تھا اور سردی سے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ غازی کو اپنی جانب گھورتے دیکھ کر وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟"

غازی آہستہ سے بولا "نقد نرائن" اب اس کا خوف زائل ہو چکا تھا۔ مرد نے کوئی جواب نہ دیا اور جھک کر تکیہ کے نیچے ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے پرس نکال کر سامنے پھینک دیا۔ اور دھیرے سے بولا "بس اب چپ چاپ چلے جاؤ" غازی نے پلاسٹک کا خوبصورت سا بٹوہ اٹھا کر اس کو

کھولا اور رقم گننے لگا۔ کل ۶۳ روپے کچھ آنے تھے۔ غازی کو بڑی کوفت ہوئی۔ وہ اسی طرح جما کھڑا رہا۔ اس کی اس حرکت پر عورت نے جھنجھلا کر کہا۔

"اب کیوں کھڑے ہو؟"

غازی موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ہاتھ ہلا کر مدھم لہجے میں بولا "اس سے کام نہیں چلے گا۔" عورت بگڑ کر کچھ اور کہنے جا رہی تھی کہ مرد نے ایک بار پھر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے غازی کو بتانے لگا کہ اب اس کے پاس اور کچھ نہیں۔ غازی لمحہ بھر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ سالی حرافہ تو خواہ مخواہ رعب جھاڑ رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو اس سے بھی جھٹکنا چاہیئے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دونوں کو دیکھا اور چاقو اٹھا کر ان کی طرف بڑھا۔ مرد کی گھگھی بندھ گئی۔ حلق کے اندر سے اس کی آواز غیں غیں کر کے نکل رہی تھی۔ جیسے بلی غرا رہی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دئے اور سہمی ہوئی نظروں سے غازی کو دیکھنے لگا۔

غازی کو وہ ننگا دھڑنگا آدمی اس عالم میں بڑا احمق سا معلوم ہوا۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کو ہنسی آ گئی۔ اس نے مرد سے تو کچھ نہیں کہا، البتہ عورت کو بڑی بڑی ہوئی سی گالی دے کر دروازے پہ گیا۔ بولٹ کھولا اور باہر چھت پہ آ گیا۔

نیچے آ کر اس نے دیکھا بالم کہیں پتہ نہ تھا۔ دیوار پھاند کر جب وہ سڑک پہ پہنچا تو وہ وہاں بھی نہ تھا۔ اس نے کئی بار حلق سے اپنی مخصوص آواز نکالی مگر اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ آخر جب وہ واپس ٹیمی کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا، بالم خوفزدہ سا وہاں بیٹھا تھا۔ اس کو وہاں دیکھتے ہی غازی بگڑ کر بولا۔

"سالے غدار تم یہاں بیٹھے ہو اور میں وہاں ڈھونڈ رہا تھا۔"

بالم کھسیانا ہو کر کہنے لگا "یار جیسے ہی چکارہ ہوئی میں نے تم کو سیٹی دی۔ مگر تمہارا کہیں پتہ ہی نہیں تھا۔" ٹیمی بیچ میں بول اٹھا "میں تو یہ سمجھا تھا کہ آج تم دھرے گئے اور مجھ کو بھی حوالات دیکھنا پڑے گی۔" غازی ہنس کر بولا۔

"اماں کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہیں مگر یار کچھ کام بنا نہیں" اس نے پرس نکال اس کے سامنے ڈال دیا "آج تو وہ مزا آیا کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ یار ایسے موقع سے پہنچا۔" اور اس کے بعد وہ ساری تفصیلات مزے لے کر سنانے لگا۔ بالم اور ٹیمی بار بار ہنس پڑتے۔

اس روز وہ اذانوں کے وقت سوئے اور دن چڑھے تک پڑے سوتے رہے۔ اتوار کا دن تھا۔ اس دن ٹیمی کو بھی کارخانے جانا نہیں تھا۔ اور وہ دونوں تو بہت دن سے چھٹی پہ تھے۔

سب سے پہلے غازی کی آنکھ کھلی، وہ دونوں کو سوتا چھوڑ کر سیدھا حلوائی کی دوکان پر گیا۔ وہاں سے گرم گرم پوریاں لے کر آیا۔ بالم اور ٹیمی ابھی تک سو رہے تھے، اس نے دونوں کو جگایا۔ سب نے مل کر پوریاں کھائیں۔ سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگائے اور زور سے قہقہے لگائے۔ اس روز وہ بڑے خوش تھے۔ غازی کا پروگرام تھا کہ شام کو سینما دیکھا جائے مگر ٹیمی نے اس کی مخالفت کی۔ ٹیمی کہنے لگا۔

"ورنہ ساری رقم اسی طرح خرچ کر دو گے۔ تم کو تو حرامخوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ کوئی ایسا سپتیا نکالا جائے کہ کوئی ڈھنگ کا دھندا چلے۔"

غازی مسکین سی صورت بنا کر بولا "اتنی سی رقم سے بھلا کیا دھندا شروع کیا جا سکتا ہے۔"

بالم نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اماں ٹیمی بھائی، ۳۰، ۴۰ روپے سے بھی کوئی کام شروع کیا جا سکتا ہے" اتنا کہہ کر وہ بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگا "یار آج فلم کا پروگرام ہو ہی جائے۔ بہت دن ہو گئے سالی کوئی فلم ہی نہیں دیکھی۔" ٹیمی کے آگ ہی تو لگ گئی۔ پہلے تو اس نے دونوں کو خوب ڈانٹا، پھر بڑے سرپرستانہ انداز میں دونوں کو سمجھاتا رہا۔ آخر یہ طے ہوا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کیا جائے۔ اب سوچنا یہ رہ گیا تھا کہ کس

رقم کا دھندا شروع کیا جائے۔ کئی اسکیمیں سامنے آئیں مگر ان پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

بالم جو اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ چٹکی بجا کر بولا۔

"یار سینما کے ٹکٹوں کی بلیک کیسی رہے گی۔ مزے سے دونوں مل کر ۴ - ۵ روپے روز پیٹ لیا کریں گے۔ اور سینما بھی مفت میں دیکھنے میں آئے گا۔ کہو استاد کیسی کہی"

وہ داد طلب نظروں سے دونوں کی جانب دیکھنے لگا۔ غازی نے گالی دے کر کہا "یہ سالا زا ایسی ہی سوچتا ہے۔ ابے یہاں ایک سے ایک بڑا مکھانی پڑا ہے، سالے ان کی داداگیری کے سامنے تمہاری کیا دال گلے گی۔ پھر پولس کے ڈنڈے الگ کھاؤ۔ ایسا ہی دھندا کرنا ہے تو کوکین کا کاروبار کرو جس میں رقم بھی اچھی ہاتھ لگے۔ ٹکٹوں کی بلیک میں تو ہر وقت حوالات رہے گا۔" ٹیپنی کو یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ کہنے لگا۔

"تم دونوں کا تو ایمان خراب ہو گیا ہے۔ جب سوچو گے بے ایمانی اور اٹھائی گیری پن کی بات" پھر اس نے خود ہی فیصلہ دے دیا "میرے ساتھ رہو گے تو یہ چار سو بیس نہیں چلے گی۔ تم دونوں آج ہی جا کر ایک ایک ٹوکری خریدو اور ایمپرس مارکٹ سے انڈا، مکھن اور ڈبل روٹی لے کر کل صبح سے پھیری لگانا شروع کر دو۔ روپیہ دھیلی روز نچ ہی جایا کرے گا۔ کچھ رقم پلے ہو جائے تو کوئی اور دھندا بنا دوں گا"

دونوں نے حیل و حجت کرنا چاہی تو اس نے ان کو ڈانٹ دیا۔ لہٰذا دونوں اسی ارادے سے بازار چل دئے۔ ان کے جانے کے بعد ٹیپنی پھر پڑ کر سو گیا۔ شام کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ دونوں ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے، وہ گھر میں بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے کوئی ۹ بجے دونوں واپس لوٹے، مگر آپس میں گالی گلوج کرتے ہوئے، غازی نے آتے ہی بالم کی شکایت کا دفتر کھول دیا۔

"ٹیپنی بھائی، اس سالے نے تو آج اپنا گلا کٹوا دیا، یہ دیکھو کل ۹ آنے پوری رقم میں سے باقی بچے ہیں"

وہ جیب سے ریزگاری نکال کر دکھانے لگا۔ ٹیپنی کو دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ پوچھنے لگا "آخر ہوا کیا" غازی بتانے لگا "اماں میں تو انڈے خریدنے جا رہا تھا، اس سالے کا ایک یار مل گیا، اُس نے ایسی پٹی پڑھائی کہ میں بھی اندھا ہو گیا۔ ریلوے کے پارسلوں کا نیلام تھا آج۔ وہی جو نج بچ جاتے ہیں، جن کا کوئی چھڑانے والا نہیں ہوتا۔ زبردستی مجھ سے ایک پارسل پر بولی لگوا دی۔ ۱۸ روپے پر بولی چھوٹی۔ اندر سے نکلا کیا۔ گودڑ اور پتھر کے ٹکڑے۔ ریلوے والوں نے اصلی مال پہلے ہی پار کر دیا تھا۔"

بالم جو اب تک مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک بارگی تڑپ کر بولا "اب یہ پوچھو کہ باقی رقم کہاں گئی۔" اس نے غازی کی طرف دیکھ کر کہا "اب یہ بھی کہہ دو کہ ریس چلنے کے لئے بھی میں نے ہی کہا تھا"

غازی سر کے بالوں کو کریدنے لگا "اماں میں نے تو سوچا تھا کہ چلو یہاں تقدیر نے دھوکا دیا۔ شاید ریس میں قسمت لڑ جائے۔ یہ سالا آج دن ہی کچھ منحوس تھا۔" ٹیپنی خاموش بیٹھا رہا۔ وہ دونوں دیر تک اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیر تک ٹیپنی کچھ نہ بولا تو دونوں نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ بالم پیر دبانے کے لئے بار بار ہاتھ بڑھاتا اور ٹیپنی اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔ غازی نے بیڑی سلگا کر دی تو اس کو لینے سے بھی انکار کر دیا۔ کئی منٹ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر ٹیپنی جل کر ان کو گالیاں دینے لگا۔ دونوں بے غیرتی سے دانت نکالے ہنستے رہے۔

اب پھر دونوں پیسہ پیسہ کو محتاج ہو چکے تھے۔ بات بات پر آپس میں جھگڑا کرتے۔ ٹیپنی کی خوشامد کرتے اور سویرے ہی سویرے کام دھندے کی تلاش میں گھر سے نکل جاتے۔ انہی دنوں ایک روز ٹیپنی نے کارخانے سے واپس آ کر یہ بری خبر سنائی کہ اُس کا بھی کام چھٹ گیا۔ سیٹھ نے کارخانہ بند کر دیا ہے اس لئے کہ اس کو اس سال حکومت نے امپورٹ لائسنس نہیں دیا تھا۔

بے روزگاری کے دنوں میں ٹیپنی بھی بدلنا شروع ہو گیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر اڑ پڑتا۔ گالیاں بکنے لگتا۔ اس کی طبیعت میں برابر چڑچڑاپن آتا جا رہا تھا۔ بالم اور غازی ہر وقت سہمے ہوئے رہتے۔ اس کی تیوری پر بل دیکھتے تو چپکے سے باہر نکل جاتے۔ اب وہ اس سے ڈرنے لگے تھے۔

وہ دونوں تو پہلے ہی پھکڑ تھے۔ اب ٹیپنی کی حالت بھی انہی کی سی ہو گئی تھی۔ کئی کئی وقت بغیر کچھ کھائے گذر جاتے۔ تینوں مل جل کر گھنٹوں نئی نئی اسکیمیں سوچتے۔ دن دن بھر دوڑ دھوپ کرتے، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ٹیپنی رات بھر کا بھوکا تھا۔ صبح اٹھا تو نہ چائے تھی، نہ بیڑی۔ رات نیند اس کو یوں ہی کم آئی تھی۔ مزاج چڑچڑا ہو رہا تھا۔ کمرے میں اس وقت صرف بالم موجود تھا۔ غازی سویرے ہی سویرے کہیں نکل گیا تھا ٹیپنی نے منہ ہاتھ دھونے کے لئے لوٹا لے کر گھڑے سے پانی نکالنا چاہا تو وہ بالکل خالی پڑا تھا۔ وہ جھنجلا کر بالم سے بولا۔

”تم لوگ تو سالے لاٹ صاحب ہو۔ کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مٹکے میں پانی بھر لیا ہوتا۔ میں کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ ہر کام میں کروں“

بالم نے دیکھا کہ صبح ہی صبح نزلہ ادھر گر رہا ہے۔ اُس نے جھٹ سے غازی کو ڈھال بنایا۔ کہنے لگا ”میں نے تو کل پانی بھر دیا تھا معلوم ہوتا ہے غازی صبح اٹھ کر نہایا ہے۔ یہ دیکھو دروازے کے باہر کیچڑ ہو رہی ہے۔“

ٹیپنی نے غازی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس وقت اتفاق سے وہ بھی آگیا پہلے ہی غصہ کیا کم تھا کہ اس بات پر اور بھی آگ لگ گئی کہ وہ اس کی خاکی پتلون بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے آتے ہی چیخ کر بولا۔

”کیوں جی یہ پتلون تم نے کس کی اجازت سے پہنی۔ تمہارے باپ نے بنوا کر رکھ دی تھی کہ جب چاہا پہنا اور سالے نواب بن کر چل دئے“

غازی شکایت کرنے کے سے لہجہ میں بولا ”دیکھو جی ٹیپنی تم ذرا ذرا سی بات پر باپ دادا تک پہنچ جاتے ہو۔“ پھر اُس نے غصہ سے اس کی پتلون اُتار کر پھینک دی اور اپنی شلوار پہنتے ہوئے بڑبڑانے لگا ”شلوار پھٹی ہوئی تھی، سالا بدن تک ننگا نظر آتا ہے، ایک جگہ کام ملنے کی امید پر گیا تھا۔ ذرا سی پتلون پہن لی تو آفت مچا دی۔“

ٹیپنی اسی طرح بولا ”ہم نے ہزار دفعہ کہا کہ ہماری چیز مت چھوا کرو، تم تو بے غیرت ہو بے غیرت“ اور پھر اُس نے غصہ سے اٹھ کر پتلون کی موریاں پکڑ کر جھٹ جھٹ کر کے اس کو پھاڑ ڈالا۔

کمرے کی فضا بڑی مکدر ہو گئی تھی۔ ٹیپنی زور زور سے اس کو گالیاں دے رہا تھا۔ بالم بھی کبھی کبھی اس کی حمایت میں تائید کرتا جا رہا تھا۔ غازی اس وقت ٹیپنی سے تو کچھ نہیں کہہ سکا البتہ بالم پر برس پڑا۔ ٹیپنی کو اس بات پر اور بھی تاؤ آیا۔ اس سے کہنے لگا۔

”ابے اس کے سر کیوں ہو رہا ہے، مجھ سے کہہ، دادا گیری دکھانا ہے تو کہیں اور جا کر دکھاؤ۔ یہاں یہ نہیں چلے گی۔ بس ہو چکی یاری۔ بڑھاؤ اپنا ٹٹو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ“

غازی نے زبان سے تو ایک لفظ نہیں نکالا، جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس زور سے اس کو دھکا دیا کہ وہ فرش پر دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ٹیپنی فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں، گلا پھاڑ کر چیخا۔

”ابھی نکل جا سالے، اُلّو کے پٹھے“

غازی تیزی سے دروازے کے باہر نکل گیا۔ بالم لمحہ بھر تک تو خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔ ٹیپنی کو اس کے اس طرح چلے جانے پر حیرت تو ہوئی مگر اس نے بالم کو روکنے کے لئے اصرار نہیں کیا۔

دونوں کے جانے کے بعد، وہ تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ کمرے کے اندر ویرانی سی برس رہی تھی۔ سورج اب چڑھ کر سر پر آگیا تھا، مگر وہ اسی طرح بے سُدھ پڑا رہا۔ پھر سہ پہر ہوئی، شام ہو گئی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں لوٹا تھا۔ اُس نے بڑے دُکھ کے ساتھ سوچا، اب وہ دونوں یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔

جب اندھیرا بڑھنے لگا، تو اس کو خیال آیا کہ اس طرح گھر میں پڑے پڑے کس طرح کام چلے گا۔ تین وقت کے فاقہ نے اس کو بیماروں کی طرح نحیف و ناتواں بنا دیا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے اٹھا اور یہ طے کر کے گھر سے باہر نکلا کہ آج وہ کوئی نہ کوئی کام کی صورت نکال کر واپس لوٹے گا، کہیں دُور جانے

کی ہمت نہ تھی لہٰذا اُس نے سوچا کہ آخر خداداد کالونی میں اتنی بہت سی جو شاندار کوٹھیاں بنی ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو اس کو کام کاج مل ہی جائے گا۔ اب وہ بہ تن ماننجھنے سے لیکر، ہر کام کرنے کے لئے آمادہ ہو چکا تھا۔

سڑک پر آ کر اُس نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ کس کے پاس جائے۔ سوچتے سوچتے اس کو حاجی صاحب کا خیال آ گیا۔ ان کی کوٹھی کے نوکروں سے اس کی جان پہچان تھی۔ اس لئے اکثر وہاں آیا جایا کرتا تھا۔ اس طرح حاجی صاحب کو بھی کبھی کبھار سلام کرنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ وہ سیدھا ان کے یہاں پہنچا اتفاق سے حاجی صاحب کوٹھی کے لان میں ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ وہ ان کو سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے آنے کی وجہ دریافت کی تو اُس نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

"سرکار کام کاج چھوٹ گیا ہے۔ بہت دن سے بے روزگار ہوں۔ آپ مائی باپ ہیں۔ دو وقت کے کھانا کا سہارا کر دیں تو آپ ہی کے قدموں میں پڑا رہوں گا"

وہ اظہار افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے "بھئی مجھ کو تو فی الحال کسی آدمی کی ضرورت نہیں۔ اکرم میاں کو ایک اردلی کی پچھلے دنوں ضرورت تھی۔ مگر اب تو انھوں نے ملازمت ترک کر دی۔ وہ تو نہیں چاہتا تھا۔ ماں نے زور دیا کہ میرا بیٹا دفتر کے کاموں سے دبلا پڑ گیا ہے۔ میں پانچ سو روپلی کے لئے اس کی صحت غارت نہیں ہونے دوں گی۔ تم جانو ماں کی ماتما، اکرم کو نوکری چھوڑنا ہی پڑی۔ اب تو وہ آئندہ مہینہ امریکہ پڑھنے جا رہے ہیں۔"

ٹیپی نے سوچا یہ شخص، تو نہ معلوم کب تک اپنے بیٹے کی کتھا سناتا رہے گا۔ ایسی باتیں جن سے اس کو کوئی واسطہ نہ تھا، لہٰذا اُس نے ہمت کر کے ان کی بات کاٹ دی۔

"اچھا سرکار تو پھر کسی اور وقت آؤں گا، ایک جگہ اور جانا ہے۔ دیر ہو گئی تو صاحب بنگلے سے باہر نکل جائیں گے۔ پھر نہ جانے کب تک ملاقات ہو۔"

وہ ان سے اجازت لے کر بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا۔ یہاں پانچ ٹکے کا سہارا نہیں۔ یہ سالا بنا رہا ہے کہ پانچ سو روپے میں میرے بیٹے کی صحت خراب ہوئی جا رہی ہے، واہ اللہ میاں خوب ہے تمہارا انصاف۔

وہ اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ اندھیرے میں کسی سے ٹکرا گیا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا کہ ایک ننگ دھڑنگ بچہ کھڑا منہ بسور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کٹورا تھا، وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ بچہ ذرا دیر تک منہ بسورتا رہا۔ پھر ایک بار زور سے چلا کر رونے لگا، سامنے جھونپڑی میں سے ایک عورت چیخی "اے کیا ہو گیا۔ حرامی منہ سے تو پھوٹ روئے کیوں جا رہا ہے"۔ ٹیپی نے سوچا، عورت بڑی تیز معلوم ہوتی ہے بلا کی طرح پیچھے پڑ جائے گی۔ وہ گھبرا کر برابر والی سڑک پر مڑ کر ایک خوبصورت سی کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک بڑا سا کتا نکل کر اس پہ جھپٹا۔ ٹیپی گھبرا کر چیخ پڑا۔ فوراً ہی کوٹھی کے دیلانڈے میں سے کسی نے آواز دی۔

"روبی، روبی۔ ادھر آؤ"

کتا دم ہلاتا ہوا اس کے قدموں پر جا کر لوٹنے لگا۔ اس آدمی نے وہیں سے پوچھا "تم کو کس سے ملنا ہے؟" ٹیپی چپ چاپ اس کے پاس چلا گیا وہ اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے ۱۰، ۱۲ سال کا ایک بچہ نکلا اور اُس شخص سے کہنے لگا۔

"پاپا، نیلی کھانا نہیں کھاتی۔ سب شور مچا رہی ہے"

اسی اثنا میں وہاں ایک بڑی پیاری سی بچی منہ بسورتی ہوئی آ گئی۔ وہ پوچھنے لگا "نیلو بیٹا کیا بات ہے" بچی سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ وہیں لے چلو پاپا، جہاں کل کھانا کھایا تھا۔ ہم یہاں نہیں کھائیں گے"

اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا اور اس کو چمکارنے لگا "ہوٹل چلے گی، ہم اپنی نیلو کو ابھی لے کر چلیں گا" اس نے ڈرائیور کو آواز دی "گاڑی نکالو، ہم باہر جائیں گے" اس نے ٹینی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ بچی کو گود میں لیے ہوئے اندر چلا گیا۔ اب وہاں کھڑا رہنا بیکار تھا، اور سب سے زیادہ اس بڑے بڑے بالوں والے خوفناک کتے کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کوٹھی سے باہر آ گیا، وہاں سے وہ دل برداشتہ لوٹا۔ اس کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ واپس گھر چلا جائے۔ لیکن بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا گھر جا کر بھی وہ کیا کرے گا۔ چلو ایک آدھ جگہ اور کوشش کر دیکھوں۔ شاید کہیں قسمت لڑ جائے، واپس تو بہرحال جانا ہی ہے۔ اس خیال سے ذرا ڈھارس بندھی تو وہ ڈرتا ڈرتا ایک اور کوٹھی پہ پہنچا۔ پھاٹک ہی سے اس نے چاروں طرف دیکھ لیا کہ کہیں آس پاس کوئی کتا تو نہیں ہے۔ مگر میدان صاف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا، مگر وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ جب زیادہ دیر ہو گئی تو اس نے سوچا، پتہ نہیں کوئی اس طرح مجھ کو یہاں کھڑا دیکھ کر کیا سوچے۔ لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں کوٹھی کے اندر سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی نکل آیا۔ دیکھنے میں خانساماں معلوم ہوتا تھا۔ ٹینی نے آہستہ سے پوچھا۔

"صاحب اندر ہیں"

وہ آدمی بولا "ہاں اندر ہی ہیں" پھر وہ نکڑ والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولا "بیٹھے ہیں جا کر مل لو" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ ٹینی نے جھجکتے ہوئے جا کر کمرے کا پردہ سرکایا اور دہلیز پہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

"کون ہے۔ اندر آ جاؤ، وہاں کیوں کھڑے ہو"

وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ وہ بھری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ مونچھیں داڑھی صفاچٹ، سر چندلا، آنکھوں پہ چوڑے فریم کا چشمہ۔ وہ اس وقت کوئی انگریزی کا رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ٹینی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں بھئی کیا کام ہے"

اس کا لہجہ بڑا نرم تھا۔ ٹینی کو ڈھارس بندھی جھٹ سے اپنا دکھڑا سنا ڈالا۔

وہ خاموشی سے ٹینی کی باتیں سنتا رہا۔ ٹینی اپنی بات ختم بھی کرنے نہیں پایا تھا کہ اتنے میں ملازم نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔ ذرا سی دیر بعد ڈاکٹر ایک تھل تھل کرتے بدن والی عورت کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ وہ عورت ڈاکٹر سے کہنے لگی

دیکھیے ڈاکٹر صاحب ان کی گردن پہ آج صبح سے یہ سرخ نشان نظر آ رہا ہے۔ یہ برابر اس بات پہ مصر ہیں کہ مچھر کے کاٹنے کا نشان ہے۔ ان کو اپنی صحت کا ذرا بھی خیال نہیں، ذرا دیکھیے تو کیسا لال لال ہو رہا ہے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے"

وہ آدمی بولا "ڈاکٹر صاحب ان کو تو یونہی وہم ہو جاتا ہے"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس کی گردن کا اچھی طرح معائنہ کیا اور ایک کاغذ پہ نسخہ لکھ کر بولا۔ بازار سے یہ مرہم منگوا لیجیے ..... سوتے وقت لگا لیجیے گا۔ میرا خیال ہے اس سے یہ داغ مٹ جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک ٹھیک نہیں ہوا تو انجکشن دے دوں گا" ساری ہدایات دے کر اس نے اپنا بیگ سنبھالا اور چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ عورت نے اپنا پرس کھولا اور ڈاکٹر کو فیس کے ۳۰ روپے دے دیے۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ عورت وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے ایک بار گی اس کی نظر ٹینی پہ پڑ گئی۔ پوچھنے لگی۔

"یہ کون ہے؟"

اس کا خاوند بولا "بے چارہ پریشان ہے۔ ملازمت چاہتا ہے۔"

وہ اس پر بگڑ کر بولی "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے پاس یونہی زیادہ آدمی ہیں مگر آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟ یا اس کو رکھ لیا۔ پوری پلٹن کی پلٹن ہو گئی اور سب حرام خور اور نکمے ہیں"۔ پھر وہ ٹینی سے بولی "بابا، ہم کو کوئی آدمی نہیں چاہئے" مگر ٹینی وہاں سے ہٹا نہیں، گردن جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا "کام کاج نہیں ہو سکتا تو آپ دس بیس روپے سے مدد کر دیجئے، اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے، میں اس سے کوئی چھوٹا موٹا دھندا ———!"

عورت نے اس کی بات پوری سنی بھی نہیں۔ گرج کر بولی "لو اور سنو، یہاں کوئی خیرات بٹتی ہے کہ "آؤ پیر والے جاؤ"۔ ٹینی نے سوچا اب جو یہاں ٹھہرا تو یہ حرام زادی نوکر کو بلا کر نکلوا دے گی۔ اُس نے بڑی خونخوار نظروں سے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

سڑک پر آ کر اس کو ایک بارگی بالم اور غازی یاد آ گئے۔ اُن کی یاد کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ اُس نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ پھاٹک پر چوکیدار بھی نہیں تھا، کتا بھی ان کے پاس نہیں تھا۔ کوٹھی کی چھت پر نیم کا ایک گھنا پیڑ جھکا ہوا تھا۔ موقع اچھا تھا۔ وہ شکاری کی سی تیز نظروں سے اس طرف یک لخت گھورتا رہا۔ پھر خود ہی چونک پڑا۔ نہیں جی، یہ ٹھیک نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں میرا امتحان لے رہے ہیں۔ یہ تو آزمائش ہے آزمائش۔ اُس نے اپنے گالوں پر کس کس کے دو طمانچے لگائے اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

وہاں جا کر دیکھا تو دروازہ کھلا تھا اور اندر روشنی ہو رہی تھی۔ گھبرایا ہوا اندر گیا تو دیکھا کہ غازی اور بالم وہاں موجود تھے۔ اس کو دیکھتے ہی دونوں نے کان پکڑ کر گردن جھکا لی۔ اس حالت میں وہ سرکس کے مسخروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ٹینی کو بے انتہا ہنسی آ گئی۔ پوچھنے لگا۔

"تم دونوں دن بھر کہاں رہے؟"

بالم بولا "بات بعد میں ہو گی، پہلے کچھ کھا لو۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو واللہ پڑھ رہی ہیں۔ بس کھاؤ" اتنا کہہ کر اس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور کباب نکال کر سامنے رکھ دئیے۔ غازی کہنے لگا۔

"صبح سے ایک دانہ بھی حلق میں گیا ہو تو سؤر کھایا ہو۔"

اُس نے ٹینی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور تینوں کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک شکوے شکایت ہوتی رہی، پھر انہوں نے اس موضوع پر بحث چھیڑ دی کہ اب کیا کیا جائے۔ باتوں باتوں میں بالم نے یہ مشورہ دیا کہ اس مکان کو پگڑی پر اٹھا دیا جائے۔ ایک آدمی کئی دن سے اس کے لئے کہہ رہا ہے، چار سو تک دے دے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس سے کوئی کام شروع کیا جائے۔ لیکن ٹینی اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ کہنے لگا

"یہ بھی سوچا کہ پھر رہو گے کہاں؟"

بالم بولا "اماں کہیں پڑ رہیں گے۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ کام چل گیا تو کہیں رہنے کا بھی ٹھکانہ ہو جائے گا۔ یوں کب تک بھوکے مریں گے"۔ ٹینی پھر بھی نہ مانا تو غازی بولا۔

"تو پھر کہو تو ایک دن پھر قسمت آزما لیں۔ میں نے کئی جگہ موقع لگایا ہے۔ خدا قسم داؤں پڑ گیا تو اپکی ٹھاٹھ ہو جائیں گے۔ بولو کیا کہتے ہو"

ٹینی بگڑ کر گالیاں بکنے لگا۔ جب ذرا اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو ان دونوں نے پھر یہی سوال دہرایا کہ آخر اب کیا کیا جائے، بڑی حیل و حجت کے بعد ٹینی اس بات پر رضامند ہو گیا کہ پرسوں تک ملازمت کی تلاش کرتے ہیں۔ اگر کام چل گیا تو ٹھیک نہیں تو مکان پگڑی پر دے کر اس رقم سے کاروبار کیا جائے۔

سویرے اٹھ کر تینوں پھر کام کاج کی تلاش میں نکل گئے۔ سب سے پہلے ٹینی واپس لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ پاس پڑوس کے گھروں میں بڑی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ اس پوری عمارت کو برابر والی کوٹھی والے سیٹھ صاحب نے الاٹ کرا لیا ہے اور اس میں اُن کا داماد

اور ٹھکی رہنگی بکل ایک ہفتہ کی مہلت ملی ہے۔ اس کے بعد پولیس آکر خالی کرالے گی۔ یہ سن کر ٹینی بھی پریشان ہوگیا۔ وہ دونوں آئے، ان کو بھی یہ خبر ملی تو وہ بھی گھبرا گئے۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، ہر روز رات کو سارے گھروں کے لوگ اکٹھا ہوتے۔ رات گئے تک باتیں ہوتیں کہ کیا کیا جائے۔ ٹینی نے سب کو اس بات پہ تیار کرلیا تھا کہ چاہے پولیس آئے، چاہے فوج، وہ اس کو خالی نہیں کریں گے۔ وہ اونچی آواز میں گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا۔ "اجی اس کو خالی کرا لینا مذاق نہیں ہے، ہم نے تو سالے بڑے بڑے کارخانہ داروں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ پچھلے دنوں ایک آدمی کو نکالا تھا۔ سب نے ہڑتال کر دی، وہیں دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ پولیس بھی آئی۔ دھونس دھپا بھی دیا گیا۔ پر وہی ہوا جو ہم نے چاہا۔ یہ تو مکان کا معاملہ ہے۔ اتنے سارے لوگ جم کر سامنے آ گئے تو کس مائی کے لال کی ہمت کہ یہاں سے ہم کو نکال دے۔" اس کی باتوں سے لوگوں کی خاصی ہمت بندھ گئی تھی۔ آخر یہی طے کیا گیا کہ وہ کسی قیمت پر اس جگہ کو خالی نہیں کریں گے۔

نوٹس کی میعاد ختم ہونے پر سیٹھ کے چند آدمی اور کچھ پولیس والے آئے۔ لوگوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو بکتے جھکتے چلے گئے۔ اس کے بعد مدت تک کسی نے ادھر لوٹ کر پوچھا بھی نہیں، لوگ پھر اطمینان سے رہنے لگے۔

تینوں میں سے کسی کو ابھی تک کوئی کام کاج نہیں ملا تھا۔ البتہ غازی کا ایک ملنے والا بیمار پڑ گیا تھا۔ وہ اس کی رکشا لے کر چلانے لگا تھا۔ اس سے جو کچھ مل جاتا، تینوں پیٹ بھر لیتے۔ مکان پگڑی پر اٹھانے کی بات چیت پھر شروع ہوگئی تھی۔ پچھلے دنوں تو کوئی اس ڈر سے آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ کہیں خالی نہ کرنا پڑے۔

ایک روز غازی کہیں سے سینما کا پاس لے آیا۔ تینوں فلم دیکھ کر کوئی بارہ بجے لوٹے تو انہوں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ گیس بتی جل رہی تھی۔ لوگ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ بچے زور زور سے رو رہے تھے۔ تینوں گھبرائے ہوئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ پولیس کی بہت بڑی جمعیت وہاں موجود تھی۔ سڑک کے ایک طرف سامان کا جگہ جگہ ڈھیر لگا تھا۔ پوری عمارت پولیس نے خالی کرا لی تھی۔ عورتیں رو رو کر پوری داستان سنا رہی تھیں کہ کس طرح گھروں میں گھس گھس کر ان کو زبردستی کھینچ کر نکالا گیا۔ کیوں کر ان کا سامان اٹھا اٹھا کر باہر ڈالا گیا۔ مرد خاموش بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ کو پولیس پکڑ کے تھانے لے گئی تھی۔ ان پر بلوہ کرنے کا الزام تھا۔

غازی اور بالم یہ حالت دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ گالیاں بکنے لگے۔ مگر ٹینی نے ان کو روک دیا اور دونوں کو ساتھ لے کر اپنا سامان تلاش کرنے لگا۔ بڑی دیر تک ڈھونڈنے کے بعد کچھ سامان ملا۔

وہ رات انہوں نے سامنے میدان میں بسر کی۔ سردی ختم ہو چکی تھی مگر رات پھر اس شدت کی اوس گری کہ وہ بھیگ کر رہ گئے۔ سویرے اٹھے تو ہر ایک کا بدن دکھ رہا تھا۔ سیٹھ نے سب کی ایسی ہی حالت دیکھی تو بنگلہ کے ایک طرف جو سائبان پڑا تھا، اس کو میدان میں لگوا دیا۔ اس سائبان میں کبھی ان کا گھوڑا بندھا کرتا تھا۔ وہ گھوڑا جو ہر ریس میں ہارا کرتا تھا اور جس کو جل کر انہوں نے گولی مار کر خود ہی ختم کر دیا تھا۔

دوسرے ہی دن سے اس ادھوری عمارت کو توڑ پھوڑ کر نئی عمارت کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ بالم اور غازی اس طرف دیکھتے تو سیٹھ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ایسے ایسے رشتے جوڑتے کہ اگر وہ سن پاتا تو ان کو عمارت کی دیوار سے چنوا دیتا۔ البتہ ٹینی خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہتا۔ اب اس نے ہنسنا بولنا بھی بند کر دیا تھا، ہر وقت گم سم سا رہتا۔ نوکری کی تلاش بھی چھوڑ دی تھی۔ ہر وقت سائبان کے نیچے پڑا رہتا۔ اس کی صحت گرنے لگی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں کے اندر ہر وقت وحشت نظر آتی۔

آخر ایک روز اس کھنڈر نما عمارت کے اندر سے ایک بڑی شاندار کوٹھی ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس کی رنگین دیواریں جھلملانے لگیں اور دروازوں دریچوں پہ ریشمی پردے لہرانے لگے۔ رات کو بڑا زبردست جشن ہوا۔ بڑی شاندار دعوت ہوئی۔ بڑے بڑے سرکاری حکام اور لیڈر آئے۔

سامنے میدان میں ہر طرف موٹریں ہی موٹریں نظر آتی تھیں۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ رہا۔

رات کے پچھلے پہر غازی کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ ٹینی نے اس کے سرہانے سے چاقو نکال لیا ہے اور خاموش کھڑا انگلی پھیر پھیر کر اس کی دھار دیکھ رہا ہے۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ بڑا پراسرار نظر آ رہا تھا، غازی دم سادھے پڑا دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد ٹینی آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔

جب وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا تو اس نے بالم کو جگا دیا اور ساری بات بتائی۔ دونوں نے سوچا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹینی آج کہیں موقع سے گیا ہے۔ بالم کہنے لگا

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ یہ سالی چوری کی ایسی چاٹ ہے کہ ایک دفعہ اس کا چسکہ لگ جائے تو پھر کہیں چھٹتی ہے"

غازی بولا "ہاں جی، بھلا کہیں ایمانداری سے کام چلتا ہے آج کل۔ سالا خواہ مخواہ بڑا ملاں بنا گھومتا تھا۔ اپنا تو کباڑا کرا دیا۔ یار یہاں کی دھوپ میں رکشا چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اماں سر بھن کے رہ جاتا ہے"

وہ دونوں دیر تک پڑے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ دونوں کو اس کے واپس آنے کا انتظار تھا۔ صبح کی سفیدی پھیلنے سے پہلے، ان کو سڑک پر ٹینی نظر آیا، وہ بڑے تیز تیز قدم چل رہا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ ان کے سامنے تھا۔ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ غازی بولا

"اماں کہاں گئے تھے"

ٹینی بولا "مشن" دونوں نے دھندلی روشنی میں دیکھا اس کے ہاتھ میں خون سے بھرا ہوا چاقو تھا۔ جس سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ دونوں کانپ اُٹھے۔ اس نے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک بنڈل ان کے سامنے ڈال دیا اور آہستہ سے بولا "پورے دس ہزار ہیں، سالو اس کو لے کر بھاگ جاؤ۔ میں نے تو وہاں سب کا صفایا کر دیا۔ پانچوں کے پانچوں ٹھکانے لگا دئے، سب کو قتل کر دیا" ایک ایک کر! وہ شرابی کی طرح جھوم جھوم کر بول رہا تھا۔ پھر اسی عالم میں بگڑ کر بولا۔

"ابے اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جاؤ نکل جاؤ"

غازی نے ڈرتے ڈرتے کہا "اور تم؟"

ٹینی ہنس دیا "میں! میں تو سیدھا تھانے جا رہا ہوں"

بالم جھٹ سے بولا "نہیں ٹینی بھائی یہ نہیں ہو سکتا۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو" وہ بگڑ کر بولا۔

"بڑا آیا سالا میرا ہمدرد۔ ابے جاتے ہو کہ نہیں"

اُس نے دونوں کے سامنے جھٹ سے چاقو کر دیا۔ دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ غازی کچھ کہنے کے لئے ٹھٹھکا تو ٹینی نے زور سے گالی دی "جا تیری —— !" اور وہ ان کی طرف لپکا دونوں بنڈل سنبھال کر سہے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ دور جا کر وہ ٹھہر گئے۔ انھوں نے دیکھا، ٹینی خون آلود چاقو لئے، شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سامنے سڑک پر جا رہا تھا۔ صبح کاذب کی ہلکی سفید روشنی میں وہ کسی کیڑے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

جب وہ دور چلا گیا تو وہ دونوں ایک مختصر سی سڑک کی طرف مڑ گئے۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ انھوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ چلتے رہے۔

آغا بابر

ممی

حامد کو نشا رکوڈی کا خط دہلی سے ہوتا ہوا لکھنؤ میں ملا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی کہانی لے کر جلد بمبئی آنے کی کوشش کرے ورنہ وہ چند دنوں تک پُونا چلا جائے گا۔

حامد کے پاس صرف سو روپیہ تھا۔ اُس نے دو سو کا کہیں سے بندوبست کیا۔ خوش قسمتی سے ایک ملنے والے نے بمبئی میں ایک شخص کے نام خط بھی دے دیا۔ گویا اس طرح سے اُس کا بمبئی میں ٹھہرنے کا انتظام بھی ہو گیا۔ یہ کوئی شخص لکھنؤ ہی کے تھے جو نواب صاحب کہلاتے تھے اور جنہوں نے بمبئی میں برسوں سے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔

وکٹوریا ٹرمینس کے سٹیشن پر ٹیکسیاں بھی تھیں گھوڑا گاڑی بھی۔ اُس نے سوچا نواب صاحب کے ہاں جانا ہے اگر وہاں قیام کا بندوبست ہو گیا تو خاصی بچت ہو جانے کی امید ہے۔ پھر وہ ہیں بھی نواب صاحب گھوڑا گاڑی میں کہاں گھسٹ گھسٹ جایا جائے ماہم۔ اُس نے ٹیکسی میں سامان رکھوایا اور ماہم چل دیا۔

سیواجی پارک لفافہ پر لکھا تھا۔ اُسے مکان تلاش کرنے میں زیادہ دِقت نہ ہوئی۔ مکان پر سوائے خانساماں کے کوئی نہ تھا۔ حامد نے پوچھا "نواب صاحب؟"

خانساماں نے کہا "ابھی باہر گئے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔"

"بیگم صاحب؟"

"بچے تو بھوپال گئے ہوئے ہیں" خانساماں نے بڑے ادب سے کہا۔

جب سوٹ کیس اور بستر خانساماں اُٹھا کر ایک کونے میں رکھ چکا تو اُس نے ویسے ہی ادب سے آ کر پوچھا "حضور کچھ پئیں گے چائے وغیرہ۔"

حامد بولا "نہیں۔ اِس وقت ہم ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ یہ خط نواب صاحب کو دے دینا۔"

حامد اُسی ٹیکسی میں وا ئی ۔ ایم ۔ سی ۔ اے پہنچا ۔ نثار کو دو روز سے پونا جا چکا تھا مگر وہ حامد کے نام ایک خط لکھ کر اپنے سامنے کر دے گیا تھا جس میں خاصی تفصیل درج تھی ۔

اُس نے ٹیکسی چھوڑی اور بس میں ماہم پہنچا ۔ نواب صاحب بڑی خوش روئی سے پیش آئے ۔ انھوں نے اُس کا سامان پہلے ہی سے ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھوا چھوڑا تھا ۔

یہ چند کمروں کا ایک صاف ستھرا فلیٹ تھا ۔ نیچے کوئی پارسی خاندان رہتا تھا ۔ کچھ فاصلہ پر دکانیں تھیں جن کے قریب کھمبا پر بس اسٹینڈ کی تختی لگی ہوئی تھی ۔ بالکنی میں بید کی کرسیاں بچھی تھیں ۔ ایک پر نواب صاحب بیٹھے تھے دوسری پر حامد تیسری خالی پڑی تھی ۔ کچھ سفر کی باتیں ہوتی رہیں کچھ لکھنؤ کی ۔ پھر چائے آگئی ۔ نواب صاحب نے خانساماں سے پوچھا " بیگم صاحب نہیں آئیں ؟ "

خانساماں بولا " وہ سینما گئی ہیں حضور ۔ دیر سے آئیں گی ۔ "

نواب صاحب نے منہ میں بڑبڑا کر جیسے اپنے آپ سے کہا " غم غلط کر رہی ہیں ۔ "

حامد کے منہ سے آپ ہی آپ نکل گیا " بیگم صاحب تو بھوپال میں نا ؟ "

نواب صاحب بولے " جی ہاں ۔ یہ بیگم صاحب مہمان اُتری ہوئی ہیں ۔ "

چائے کے بعد حامد اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا ۔ سوٹ کیس کھول کر کپڑے بدلے ۔ خانساماں نے پہلے سے بستر بچھا رکھا تھا ۔ اس پر لیٹ کر سستانے کی کوشش ہی کرنے لگا ۔ نواب صاحب کی آواز آئی " حامد میاں کیا کر رہے ہو ۔ باہر آ کر بیٹھو ۔ کیا بہت تھکے ہوئے ہو ؟ "

" جی نہیں یونہی لیٹ گیا تھا " حامد اُٹھ کر باہر آ بیٹھا ۔ نواب صاحب نے بمبئی آنے کا مقصد پوچھا ، فلم سٹوری سے فلم کی باتیں شروع ہو گئیں ۔ خانساماں آ کر مؤدبانہ کھڑا ہو گیا ۔ نواب صاحب نے پوچھا " لگا دیئے ؟ "

خانساماں نے کہا " حضور "

" اچھا آتے ہیں ۔ "

خانساماں چلا گیا ۔ بات ختم ہوتے ہی نواب صاحب بولے " آؤ بھئی اندر چلیں ۔ "

اندر میز پر وسکی کی بوتل سوڈے اور دو گلاس رکھے تھے " شوق کرتے ہو نا ؟ " نواب صاحب نے پوچھا ۔

" جی بہت کم ۔ "

" ہاں تو ٹھیک ہے ۔ "

فلم والوں کی باتیں جاری رہیں ۔ نواب صاحب بمبئی کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے قصے بیان کرتے رہے ۔ پھر بمبئی شہر کی گہما گہمی کاروبار کی تیز رفتاری اور دیگر خصوصیات کا ذکر ہوتا رہا ۔

وہ کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے کہ سیڑھیوں میں سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی ۔ اور ایک عورت داخل ہوئی جو صورت اور ساڑھی کے انداز سے مرہٹہ عورت معلوم ہو رہی تھی ۔

نواب صاحب بولے " بھئی زینب کمال کرتی ہو ۔ کیا تمہیں آج ضرور سینما جانا تھا ۔ ہم تمہارا انتظار کر کے میز پر ابھی ابھی بیٹھے ہیں ۔ چلو آؤ آپ سے ملو ۔ یہ حامد میاں ہیں لکھنؤ سے آج ہی آئے ہیں ۔ کچھ دنوں میں دیکھو گی ان کی کہانی فلمائی جائے گی ۔ "

تعارفی نگاہوں میں ایک تکلف جھلکا ۔ پھر وہ بیٹھ کر کھانے میں شریک ہو گئی ۔ حامد کو وہ بڑی چٹخنی مٹخنی سی دکھائی دی ۔ کھانا کھانے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو کچھ لئے دیئے رہی مگر اُس کا بدن کچھ ایسا بے قابو تھا جیسے گا رہا ہو ۔ حامد نے بدن کو غزل خوانی کرتے

کبھی نہیں سُنا تھا ۔ یہ پہلا موقع تھا ۔

اگرچہ نواب صاحب کا بڑھاپا شروع ہو چکا تھا مگر اس وقت وہ بڑی موج میں تھے ۔ انھوں نے کوئی مذاق کی بات کہتے ہوئے زینب کی طرف ہاتھ بڑھایا جس نے اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر دے مارا ۔

حامد کو یوں محسوس ہُوا جیسے کھمبا پر سے بس کی تختی نیچے گر پڑی ہو ۔ اُس کی آنکھوں میں غنودگی تھی ۔ وہ کل صبح کا پروگرام سوچ رہا تھا ۔

رات کو وہ بستر پر لیٹا ہُوا تھا کہ زینب ٹائلوں والے فرش پر سے کھٹ کھٹ کرتی گزری ۔ پھر اُس نے نواب صاحب کے کمرے سے آواز دی" حامد میاں نواب صاحب پوچھتے ہیں آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ۔"

" جی نہیں " حامد نے بستر پر سے گردن اُٹھا کر کہا ۔ کونے والے کمرے میں زینب روشنی میں کھڑی تھی ۔ اس نے پوچھا " آپ صبح ناشتہ میں کسی خاص چیز کے عادی تو نہیں ۔"

حامد نے جواب دیا " جی نہیں جو مل جائے ۔"

روشنی زینب کے چہرے پر اس طرح پڑ رہی تھی جیسے سٹیج پر الیکٹریشن کی محبوبہ پر پڑتی ہے ۔

زینب کے لہجہ میں ایک چونچالی تھی یا اُس کا سراپا کچھ ایسا تھا ۔ اُس کی شخصیت میں کچھ سحر بے نام تھا کہ سارا فلیٹ جس پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی ۔ اُس کی آمد سے چہک اُٹھا تھا ۔

صبح ناشتہ پر حامد نے دیکھا کہ زینب کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے رات کو روتی رہی ہو ۔ نہ جانے رات کو وہ اُسے گڑیا سی کیوں دکھائی دی تھی ۔ اب تو پچیس چھبیس برس کی مکمل عورت معلوم ہو رہی تھی ۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ آج چند دوستوں کے ساتھ کار میں پُونا جا رہے ہیں ۔ کل شام یا پرسوں صبح لوٹ آئیں گے ۔ وہاں بہت بڑی ریس ہے ۔

زینب نے کہا " آپ کل شام آ جائیں اور کوئی اچھی خبر لائیں ۔ میرا خیال آپ ہی کی طرف رہے گا ۔"

حامد نے پوچھا " آپ نہیں جا رہیں ؟"

" جی نہیں مجھے کہاں لے جاتے ہیں " زینب نے ایک چونچالی سے کہا ۔

اس پر نواب صاحب ذرا سے مسکرا دیئے ۔

نواب صاحب کے جانے کے بعد حامد اور زینب بالکنی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے ۔ زینب نے پوچھا " آج آپ کا کیا پروگرام ہے ؟"

حامد کو فورٹ جانا تھا اور زینب کو درزی سے کپڑے لانے تھے ۔ فیصلہ ہُوا کہ دونوں اکٹھے بس میں جائیں ۔ زینب اوپیرا کے قریب اُتر جائے حامد آگے فورٹ ایریا کی طرف نکل جائے اور کھانے کے وقت دونوں واپس گھر پہنچ جائیں ۔

جب حامد گھر لوٹا تو زینب شلوار قمیص پہنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی ۔ حامد نے مسکرا کر کہا " واللہ میں نے آنے کے ساتھ آپ کو نہیں پہچانا ۔ آپ بالکل پنجابی عورت لگتی ہیں ۔"

زینب اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہوئے بولی " مجھے یہ لباس بہت پسند ہے ۔ بمبئی میں اس لباس کا بڑا فیشن ہو رہا ہے ۔ سب پنجابی فلموں کا اثر ہے ۔"

حامد زینب پر نظر جمائے بولا " میں دراصل پنجاب ہی کا رہنے والا ہوں ۔ آپ کو اس لباس میں دیکھ کر مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اپنے گھر میں ہوں ۔"

زینب بولی "پنجاب دیکھنے کا مجھے بڑا شوق ہے۔"

"میری سٹوری بک جائے۔ آپ کو پنجاب دکھاؤں گا" حامد نے کہا۔

"وعدہ" زینب نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

حامد نے کہا "وعدہ"

دونوں نے ہاتھ ملایا۔

کھانا کھانے کے بعد پروگرام یہ بنا کہ شام سینما دیکھی جائے اور کھانا بھی باہر ہی کھایا جائے۔ رات کا کھانا نہ پکانے کو خانساماں سے اُسی وقت کہہ دیا گیا۔

"میں شام کو کیا لباس پہنوں؟ ساڑھی یا شلوار" زینب نے پھر اپنے لباس پر بڑی طرحداری سے نگاہ ڈالی۔

حامد کو یہ بات اتنی چپکیلی سی محسوس ہوئی جیسے خود اُسے کوئی ریشم میں لپیٹ ڈالے۔

"آپ پر ہر لباس کھلتا ہے۔ یقین جانیں میں نے رات آپ کو مرہٹہ عورت سمجھا تھا۔ آپ کی ساڑھی کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔ اب اس لباس میں ہو بہو ناک نقشہ پنجاب کی عورت کا سا ہے"۔

زینب نے میز پر سے ایک لفافہ اُٹھایا۔ اس میں ایک اور سُوٹ تھا۔

"رات کو یہ پہن لوں۔ کیا خیال ہے؟"

حامد نے کہا "بہت شوق سے۔ نیکی اور پُوچھ پُوچھ"

جب وہ سینما سے نکلے تو حامد نے کہا "میرا جی تو اس وقت بیئر پینے کو چاہتا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

زینب نے بے تکلفی سے کہا "نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔ یہاں قریب ہی اگلی سڑک پر ایک ہوٹل ہے"

وہ مُڑ کر مڑے تو ایک سیاہ فام آدمی جس نے نیکر پہن رکھی تھی۔ قمیص اور موزے چیک ڈیزائن کے تھے جہاز پر سامان لادنے والا معلوم ہوتا تھا ان کے پاس سے گزرتا ہُوا بولا "ہیلو بھابی" زینب نے رُک کر اُس کی خیریت پُوچھی۔

وہ بولا "اُستاد کہاں ہے؟"

زینب نے کہا "پُونے"

"آپ کبھی ریس پر نہیں آتیں"

"ایسے ہی"

"کل آئیں گی۔ میں آئرن شیبٹ رائڈ کر رہا ہوں۔ وِن یا پلیس"

"گولڈ فلیک دوڑے گا؟"

"کیوں نہیں"

"اچھا ہم کل آئیں گے"

"ضرور آنا بھابی"

حامد نے پوچھا "یہ کون صاحب تھے؟"

"یہ جوکی ہے۔ کل ریس پر چلیں گے؟"

"چلیں گے" حامد نے یوں جواب دیا جیسے وہ ریس کا بڑا شوقین ہو حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

خوشی خوشی ہوٹل میں گئے مگر بیئر پیتے پیتے زینب اداس ہونے لگی اور حامد چہکنے لگا۔ جب وہ چوپاٹی کے ساحل پہ ایک تنہا بنچ پر جا بیٹھے تو حامد نے زینب کا ہاتھ دبا کر کہا "چھوٹے بیے بھی یہ اُداسی۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

زینب کی آنکھیں متوالی ہو رہی تھیں۔ بولی "کاش یہ کلموا نہ ملتا۔ مجھے میرا خاوند یاد آنے لگا ہے۔ وہ آجکل مجھ سے ناراض ہے۔ نواب صاحب اُسے منانے ہی کے لئے تو پونا گئے ہیں۔"

"منہ میٹھا کرا دیجئے وہ من جائیں گے۔"

"آپ بڑے خود غرض ہیں۔"

حامد نے اپنا گال اُس کے گال کے ساتھ لگا دیا اور اُسے بازوؤں میں لے لیا۔

زینب خاوند کی یاد میں زار زار رونے لگی۔ اُس کی طبیعت بڑی مشکل سے سنبھلی۔ فضا کچھ اس طرح خمار آلود ہو گئی تھی کہ حامد کا جی یہ سوچ کر کہ وہ گدا نا ہوا جسم کس طرح ایک ہی دن میں اُس کے بازوؤں میں آ گیا ہے خدا کی بے نیازی پر سجدہ کرنے کو چاہا۔

"آپ بہت گستاخ ہیں۔ آپ نے مجھے ساری کو ٹٹول ڈالا ہے۔ یہ گستاخی اب ختم بھی ہو گی یا نہیں؟"

"گھر چل کر ختم ہو گی" حامد بولا۔

"اگر آپ میرے کمرے میں آئے تو میں کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی۔ نواب صاحب کا پتہ ہے کہ نہیں؟"

اس کے بعد حامد پر اداسی چھانے لگی اور زینب کو زبان لگ گئی۔ وہ حامد کو اس طرح عریاں لطیفے سنانے لگی جیسے حامد کو بڑی دیر سے جانتی ہو۔ حامد ایک دم کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

جب وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے چوپاٹی سے نکلے تو انھیں ایک اور طرفہ معجون آدمی ملا۔ زینب اُسے بتانے لگی "مسٹر نشان یہ فلم ڈائرکٹر پنجاب سے آئے ہیں۔ مجھے اپنی فلم میں ملکہ کا رول دے رہے ہیں۔"

مسٹر نشان بولے "ضرور لے لیجئے۔ ملکہ کا رول ایک دم آپکے شایانِ شان ہے۔"

زینب باتوں کے دوران حامد کے بازو کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی رہی جیسے نشان کو چڑا رہی ہو۔ اُس نے بعد میں حامد کو بتایا کہ نشان بمبئی کا مشہور آرٹسٹ ہے۔ وہ اُس سے تصویر کے لئے سٹنگ مانگتا ہے۔

حامد نے پوچھا "پھر تم سٹنگ کیوں نہیں دے دیتیں؟"

زینب بولی "یہ آرٹسٹ ایکدم شائی ہے۔ میں اِس کو تنگ کرتی رہتی ہوں مجھے اِسے ستا کر لطف آتا ہے۔"

اُن کو گھر پہنچتے کافی دیر ہو گئی۔ زینب اپنے کمرے کی اندر سے چٹخنی لگا کر سو گئی۔

اگلی شام وہ دونوں ریس پہ گئے جہاں زینب نے حامد کے پچاس روپے ہار دیئے۔ جب گرانڈ ٹیک کا جوکی زین کے ساتھ چپٹا ہوا سامنے سے گزرا تو زینب نے حامد کے کان میں اُس جوکی پہ ایک گندا فقرہ کسا۔ حامد نے زینب کے کندھے پر زور سے دھپا مارا اور ہنس دیا۔

وہ جھٹپٹے کے وقت گھر لوٹے تو نواب صاحب پونہ سے واپس آ چکے تھے۔ وسکی کا گلاس سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ زینب سے باتیں کرنے لگے اور حامد بے تعلق سا ہو کر شام کا اخبار دیکھنے لگا۔ نواب صاحب نے کہا "اُس کا غصہ پہلے سے کم ہے مگر ابھی دو ایک کوششیں اور درکار ہیں۔ بنسی دھر نے بھی اُسے بڑا سمجھایا ہے۔ میرا خیال ہے مان جائے گا۔ مگر سنو۔ آج کی ڈاک میں خط آیا ہے۔ بچے پرسوں آ رہے ہیں۔ تم

باندرے آرپا کے ہاں چلی جاؤ ۔"

زینب کچھ مایوسانہ انداز میں بولی "وہاں میں ہرگز نہیں جاؤں گی ۔"

"کیوں ؟" نواب صاحب نے پوچھا ۔

"وہ بہت شریف آدمی ہے ۔"

نواب صاحب نے ہنس کر کہا "آفرین ہے تم پر۔ چند دن گزار لو ۔ اتنی دیر میں ہم کوئی اور بندوبست کر دیں گے ۔"

زینب نے اڑیل گھوڑی کی طرح کہا "میں وہاں نہیں جاؤں گی ۔"

"سارجنٹ ڈگلس کا فلیٹ خالی ہے ۔"

"اونہہ ! شرابی کرانٹا ۔ اُس سے میری لڑائی ہے ۔"

نواب صاحب کے لہجے میں درشتی آگئی ۔ بولے "تو جاؤ بھاڑ میں ۔ ہماری بیوی آ رہی ہیں ۔ کہیں تو جانا پڑے گا ہی تمھیں ۔"

زینب اُٹھ کر اندر چلی گئی ۔

حامد نے نواب صاحب سے بڑے گھریلو طریقہ سے پوچھا "خاوند سے کب تک صلح ہو جانے کی اُمید ہے ؟"

نواب صاحب نے آہستہ سے کہا "خاوند کس کا ؟ میاں صاحبزادے ۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے ۔ کرسی کھینچو ۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔" انھوں نے خانساماں کو آواز دی جو ٹرے میں دو گلاس رکھے پہلے ہی بھاگا آ رہا تھا ۔ اب نواب صاحب اُٹھے ۔ زینب کا ہاتھ پکڑے باہر کھینچ لائے ۔ کرسی پر بٹھا کر بولے "ہم مر تو نہیں گئے ۔ بندوبست کر دیں گے تمھارا ۔"

پھر وہ گلاسوں میں وسکی ڈالتے ہوئے بولے "ہوٹل میں جا رہو ۔"

"کس ہوٹل میں ؟" زینب نے پوچھا ۔

"جس ہوٹل میں تمھاری مرضی ۔ اب خوش ہو جاؤ ۔" زینب کے چہرے پر شگفتگی سی آگئی ۔

نواب صاحب حامد سے آج کی ریس کے متعلق باتیں پوچھتے رہے ۔ کہنے لگے کل ہمارے ساتھ چلنا ۔

صبح ناشتہ کے بعد زینب تیار ہو گئی اور نواب صاحب کار میں اُسے ہوٹل میں چھوڑ آئے ۔ آج شام کو پھر ریس تھی ۔ نواب صاحب نے بھورا پائی کٹ کی شیروانی پہنی ۔ کندھے پر چرمی خول لٹکایا جس میں دُوربین تھی ۔ ہاتھ میں چاندی کے مٹھے والی چھڑی لی ۔ حامد کو ساتھ لیا اور ریس کورس میں جا پہنچے ۔ زینب بھی آئی ہوئی تھی ۔ اُس نے مرہٹہ سٹائل میں ساڑھی باندھ رکھی تھی اور ساتھ کوئی پارسی لڑکا تھا ۔ ریس کورس میں مختصر سی ملاقات ہوئی جس میں زینب نے اُس لڑکے کا تعارف کرایا ۔ چند باتیں ہوئیں اور بس ۔

اگلا روز گھر کی صفائی میں گزرا ۔ نواب صاحب نے خانساماں سے کمرے درست کرائے ۔ چیزوں کو سلیقہ سے رکھا یا ۔ شام کو نواب صاحب کی بیگم اور بچے آگئے ۔

اگلے روز نثار کوڈی وہ چِٹ لئے جس پر حامد اپنا پتہ لکھ کر وائی ایم سی اے چھوڑ آیا تھا تاہم آ پہنچا اور حامد کو لے کر چل دیا ۔ اب دو چار دن جو بمبئی میں گزرے وہ صبح سے شام تک فلم والوں کے پیچھے پیچھے خوار ہونے میں کٹے ۔ حامد کی رخصت ختم ہو گئی ۔ وہ مسودہ نثار کوڈی کو دے آیا اور سیدھا دہلی اپنے کام پر آگیا ۔

نثار کوڈی سے مسودے کے بارے میں خط و کتابت ہوتی رہی ۔ پھر اُس میں بھی سستی ہونے لگی ۔ اُس نے لکھا بمبئی میں آج کل سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے فلمساز گومگو کی حالت میں ہیں ۔ حالات سازگار ہونے دو ۔

وہ حالات سازگار ہونے کے انتظار میں تھا کہ دہلی خود اُجڑنی شروع ہوگئی اور اُسے تقسیم سے پہلے ہی کراچی آجانا پڑا پھر سال بعد اُس کی تبدیلی کوئٹہ ہوگئی۔

کوئٹہ اُسے پسند تو آیا مگر وہاں وقت کٹنا ایک مسئلہ بن گیا۔ کچھ لوگوں کے ہاں اُس کا ملنا جلنا بڑھا۔ کبھی کبھی کار میں وہ شام کو اُن کے ہاں جا بیٹھتا وہ اُس کے ہاں آجاتے مگر ان میں سے زیادہ گھروں میں پردہ تھا۔ فرید اور بیگم فرید کے ہاں پردہ نہ تھا۔ اس لئے وہاں اُسے زیادہ گھریلو پن محسوس ہوتا۔ اُن کے تین بچے کانونٹ میں پڑھتے تھے۔ بیگم فرید بڑا اچھا لباس پہنتی۔ کار بھی ڈرائیو کرسکتی تھی مگر انھوں نے اپنی کار بیچ دی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی بنوا رہے تھے جو ختم ہونے کے قریب تھی۔ حامد کا ان کے ہاں خاصا آنا جانا ہوگیا۔ مسز فرید حامد کو حامی بھائی کہتی۔ کبھی کبھی اُسے کوئی کام ہوتا تو وہ حامد سے اُسکی کار منگا لیتی یا حامد اُن کو خود چھوڑ آتا۔ اُسے مسز فرید ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ اُسکی دو بہنیں اور ہیں جو بیاہی جا چکی ہیں۔ وہ اپنے ڈیڈی کا ذکر کرتے وقت جب کہتی ڈیڈی کو خدا بخشے تو اُس کے لہجہ میں بڑا تقدس اور بیدری محبت جھلکنے لگتی جو حامد کو بڑی اچھی لگتی۔

ایک روز چھٹی کا دن تھا۔ حامد تیار ہوکر باہر دھوپ میں آبیٹھا اور اخبار دیکھنے لگا۔ ایکدم اُس کا دل کافی پینے کو چاہا۔ اُس نے اخبار تہہ کرکے وہیں رکھا۔ موٹر لیکر مسز فرید کے ہاں چل دیا۔ وہاں مسز فرید کی بہن اور بہنوئی آئے ہوئے تھے۔ اُن سے تعارف ہوا۔

مسز فرید بولی "حامی بھائی آپ کی بڑی عمر ہے۔ میں ابھی میمونہ سے آپ کا ذکر کر رہی تھی کہ اتنے دنوں سے آپ نہیں آئے"

"فرید کہاں ہے؟" حامد نے پوچھا۔

"وہ کچھ سامان لے کر گئے ہیں۔ ہم آج اپنی کوٹھی میں شفٹ کر رہے ہیں"

"واہ واہ مبارک ہو۔ آج تو منہ میٹھا ہونا چاہیئے۔ میں تو کافی پینے آیا تھا مگر یہ تو دعوت کا دن ہے"

"جی ہاں نئی کوٹھی میں چل کر کافی پئیں گے۔ لیجیئے فرید بھی آگئے"

"ہیلو فرید۔ بھئی آج تو گھر میں بڑی رونق ہے۔ مبارک ہو"

"ہاں۔ دیکھتے نہیں دونوں بہنوں نے آج کس غضب کی ساڑھیاں پہنی ہیں" فرید نے اپنی بیوی اور اپنی سالی کی طرف دیکھ کر کہا۔

مسز فرید جلدی سے بولی "پہلے چل کر نمی کو لے آئیں"

فرید بولا "ہاں ضرور"

موٹر میں پیچھے دونوں بہنیں اور فرید کا ہم زلف بیٹھ گئے۔ فرید حامد کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ حامد نے موٹر سٹارٹ کرکے پوچھا "کدھر چلیں؟"

"ریس کورس" پچھلی سیٹ سے مسز فرید بولی۔

موٹر ریس کورس کے پچھواڑے میں روک دی گئی جہاں ایک ایک کمرے کے چھوٹے چھوٹے کوارٹر تھے۔ حامد اپنی کار کے پاس کھڑا رہا اور سب لوگ ایک کوارٹر میں داخل ہوگئے۔ اس کوارٹر کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔ اندر ایک جوکی برجس پہنے سا گوان کی پرانی کرسی پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ حامد ذرا ٹہلتا ٹہلتا کھڑکی کے اور قریب ہوگیا۔ وہ سگریٹ سلگا کر سفیدے کے درخت کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اتنے میں اُس نے کیا دیکھا کہ کمرے میں جو عورت داخل ہوئی ہے وہ زینب ہے۔ اُس نے جوکی سے کہا "میں جانا تو نہیں چاہتی مگر کیا کروں وہ مجھے زبردستی لے جا رہے ہیں"

جوکی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے بولا "جاؤ کوئی ہرج نہیں۔ خدا میرا گھوڑا سلامت رکھے"

زینب کمرے سے باہر چلی گئی۔

پھر مسز فرید کی آواز سنائی دی "چلو آؤ بھی نمی"

جب وہ موٹر کی طرف آئے تو زینب کا ایک بازو مسز فرید نے پکڑ رکھا تھا۔ دوسرا چھوٹے داماد نے اور زینب اُسی جوبنجابی سے کہہ رہی تھی "بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے کہ میں آج اُس شخص کو چھوڑ دوں جس کے ساتھ عمر گزاری ہے"

زینب کے گال کوئٹہ کی ہوا سے سرخ ضرور تھے مگر بائیں کنپٹیوں کے اُوپر بالوں کی دو لٹیں سفید ہوگئی تھیں۔

حامد نے اپنے سگرٹ کا زور زور سے کش لیا اور پھر چنگی میں مسل ڈالا۔

ایک رات کا مہمان

کشمیری لال ذاکر

جنوری کی پہلی تاریخ تھی۔

نئے سال کا آغاز تھا۔ ایک نیا زمانہ تشکیل پا رہا تھا۔ ایک نئے یُگ کی رُوپ ریکھا بن رہی تھی۔ سال کے آغاز کا یہ پہلا دن سدا ہی مجھے ذہنی طور پر غیر متوازن کر دیتا ہے۔ اس سے پہلی رات میں بڑا سنجیدہ اور خاموش ہوتا ہوں۔ کسی سے ملتا بھی نہیں۔ گھر میں پڑا رہتا ہوں اور اُن سب کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں جو میں نے سال بھر پڑھی ہیں۔ ہر ایک کتاب کی خط کشیدہ سطروں کو پڑھتا ہوں اور اُن سے جو جذباتی لگاؤ رہ چکا ہے اُسے تازہ کرتا ہوں اور یہ سلسلہ کافی رات گئے تک چلتا رہتا ہے کوئی مجھے ٹوکتا بھی نہیں۔ سب میری عادت کو جانتے ہیں۔ کوئی مجھے کھانے کی میز پر بھی نہیں بلاتا۔ بھاگی رام میرا بوڑھا ملازم، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چائے بنا کر رکھ جاتا ہے۔ لیکن اس آہستگی اور خاموشی سے جیسے لمحے گزرتے ہیں۔ بالکل غیر محسوس طور پر۔ اور پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ میں صوفے سے اٹھتا ہوں اور کمرے میں لہراتے ہوئے دھوئیں کی سیاہی کو دیکھتا ہوں جیسے اس سیاہی نے گزرے ہوئے ایک سال کے ایک ایک لمحے کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہو اور اُسے سہلا رہا ہو کہ وہ سو جائے اور اُس کے سو جانے کے بعد ایک نیا سال جاگے۔ ایک نئی کونپل پھوٹے۔ ایک نیا پھول کھلے۔ ایک نئی جوت جلے اور ایک نیا سورج طلوع ہو اور دھرتی پر امن اور شانتی کا دھج ترنگیت لہرائے۔

سیاہی کے اس پردے کو اور گہرا کرنے کے لئے نیا سگرٹ جلاتا ہوں اور پھر دھوئیں کے مرغولوں کو سیاہی کی تہوں میں تحلیل ہوتے دیکھتا ہوں اور پھر بستر میں لیٹ جاتا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد میری آنکھیں مُند جاتی ہیں اور سال بھر کے واقعات اور حادثات اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میرے سامنے آنے لگتے ہیں۔ کہاں میری ہار ہوئی ہے؟ کہاں میں جیتا ہوں؟ کون سا زخم مندمل ہو چکا ہے اور کون سا ابھی تک ہرا ہے؟ کہاں میں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ کہاں میری پگڈنڈی کسی شاہراہ سے ملی ہے اور کہاں کوئی شاہراہ جس پر میں بڑی دیر سے چل رہا تھا اچانک ٹوٹ گئی ہے؟ کس طوفان نے آ سے بہا ڈالا ہے۔ سامنے ایک بہت بڑی کھائی ہے اور میں اُس کے کنارے کھڑا ہوں اور یہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ سال بھر کی بھر پور تگ و دو کے بعد میں نے پایا کچھ بھی نہیں، صرف اپنی محنت کھوئی ہے۔ اُس کسان کی طرح جو دن رات جان کھپاتا رہے اور جب اُس کی فصل پک کر تیار ہو جائے تو ساہوکار کے آدمی آ کر کھلیان بننے سے پہلے ہی اُس پر قبضہ کر لیں۔ جب تمام واقعات کا مجموعی طور پر جائزہ لیتا ہوں تو یہی احساس

ہوتا ہے کہ بہت دوڑا ہوں۔ بہت سا راستہ طے کیا ہے۔ کئی سنگِ میل پیچھے چھوڑے ہیں۔ بہت سی پگڈنڈیاں پار کی ہیں۔ لیکن سال بھر کے بعد وہیں کھڑا ہوں جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ شکست کا یہ تیکھا احساس بڑا ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

میں آگے کیوں نہیں بڑھتا؟ میری کشمکش کیوں کامیاب نہیں ہوتی؟ میری کوششیں کیوں سپھل نہیں ہوتیں؟ میرا بھرپور عزم کیوں میرا ساتھ نہیں دیتا؟ یہ اور ایسے ہی کئی اور سوال میرے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہتھوڑے برس رہے ہیں اور میری شخصیت کی چٹان سے کچھ ٹوٹ کر گر رہا ہے۔ میں ان ٹوٹ کر گرتے ہوئے ٹکڑوں کو سنبھال بھی تو نہیں سکتا۔ صرف انہیں دیکھتا رہتا ہوں، جیسے ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ٹکڑوں کے انبار لگتے جاتے ہیں اور میں اُن کے نیچے دب جاتا ہوں اور پھر ایک ایسا لمحہ آ جاتا ہے جب میں ہتھوڑوں کی آواز بھی نہیں سن سکتا، چٹان سے ٹوٹتے ہوئے ریزوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایک بھاری بوجھ کے تلے دب کر بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ میرے ذہنی اور جسمانی قویٰ بُری طرح مضمحل ہو جاتے ہیں۔

ہر برس کی آخری رات کو یہی ہوتا ہے۔ ہر سال کی آخری رات کو میں مرتا ہوں اور نئے سال کی صبح کو پھر جی اٹھتا ہوں۔ اب تک میں پندرہ بار مر چکا ہوں اور پندرہ بار دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ اُن میں زندگی کے وہ برس شمار نہیں جب میں زندگی اور موت کے فرق کو سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ جب شعور کے تیکھے پن نے ایک تیز دھار والا خنجر میرے پہلو کے قریب نہ رکھا تھا۔ اب تو میں کروٹ بھی بدلوں تو اُس کی نوک میرے دل میں اتر جاتی ہے۔

اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔

دوسری صبح میں پتھروں کے ڈھیر سے نکلا تو میرا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس سال میرے ذہن پر پہلے سے کہیں زیادہ ہتھوڑے چلے تھے اور میری شخصیت کی چٹان بہت ہی بُری طرح ٹوٹی تھی۔ جیسے اس برس میں نے صرف کھویا ہی کھویا تھا، پایا کچھ بھی نہ تھا۔ سفر بہت زیادہ طے کیا تھا۔ لیکن کسی پگڈنڈی یا شاہراہ پر نہیں۔ ایک لق و دق صحرا میں جہاں نہ کوئی سنگِ میل آیا تھا، نہ شاہراہ ملی تھی، نہ کوئی موڑ ہی نظر سے گزرا تھا۔ صرف سراب تھے اور پھیلاوے تھے اور ریت کے عظیم پھیلاؤ تھے۔

جاگنے پر بھی کچھ دیر بستر میں پڑے رہنے کے بعد میں اُٹھا۔ کھڑکی کے قریب آیا۔ شیشوں میں سے دیکھا باہر اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ پھر کھڑکی کھولی۔ اور یخ بستہ ہوا کے ایک جھونکے نے ایک چانٹا سا میرے منہ پہ دے مارا۔ نئے سال کی پہلی صبح میرا سواگت کر رہی تھی۔ باہر بڑی گہری دھند چھا رہی تھی اور ہوا اتنی سرد تھی۔ جیسے برف گری ہو۔ پر برف تو اُونچی اُونچی چوٹیوں پر گرتی ہے۔ کتنی پیاری لگتی ہیں برف باری کے بعد برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیاں جیسے اپسرائیں نرت کرتے کرتے تھک کر آرام کر رہی ہوں۔ لیکن اپنی زندگی میں چوٹیاں ہیں ہی کہاں۔ چوٹیاں تو جب تھیں جب چیتنا میرے ساتھ تھی۔ کتنی پُروقار تھیں وشواس کی وہ بلند چوٹیاں جن پر ہمارے پیار کی سنہری دھوپ چمکتی تھی اور ستاروں کے پھول کھلتے تھے۔ اُن چوٹیوں پر برف بھی گرتی تھی، اُن سے طوفان بھی ٹکراتے تھے اور پھر وہ برف پگھل جاتی تھی۔ طوفان بہار کے جھونکوں میں بدل جاتے تھے۔ اور جنگلی پھول کھلتے تھے اور فضا اُن کی خوشبو سے مہکتی تھی۔ لیکن اب تو میری زندگی ایک صحرا ہے، چوٹیاں تو چیتنا کے ساتھ ہی چلی گئیں۔ اب نہ تو اس میں پھول ہی کھلتے ہیں نہ برف ہی گرتی ہے۔ دن میں جھلس دینے والے بگولے جنگلی جانوروں کی طرح چنگھاڑتے ہیں اور رات کو اتنی شدت کی سردی پڑتی ہے کہ چٹانیں چٹخ جاتی ہیں۔

چیتنا کے پاس تو ایٹم کی شکتی ہے۔ اُس نے اس طاقت سے دوبارہ چوٹیاں بنالی ہیں۔ روس اور امریکہ تو مصنوعی سیّارے جانے کب تک بنا سکیں گے لیکن چیتنا نے اپنے لئے ایک نئی دنیا تخلیق کر لی ہے۔ اور زندگی سے چھنی ہوئی روشنی، رنگینی اور مہک کو دوبارہ پا لیا ہے۔

لیکن میرے پاس ایٹم کی طاقت نہیں۔ اس لئے میری چوٹیاں دوبارہ نہیں بن سکتیں، ان پر اپسرائیں تھک کر آرام نہیں کر سکتیں۔ جنگلی پھول نہیں کھل سکتے اور ستاروں کے دیئے نہیں جل سکتے۔ میرے مقدر میں تو بس سامنے پھیلا ہوا یہ صحرا ہی ہے جس میں کوئی شاہراہ نہیں، کوئی پگڈنڈی

نہیں۔ کوئی سنگِ میل نہیں کہ سفر کی طوالت کو ماپ سکوں۔

چند لمحے کھڑکی میں گزارہ کر میں نے یخ بستہ ہوا کے چانٹے کھائے اور محسوس کیا کہ نئے سال کا آغاز ہو چکا تھا اور میرا صحرا مجھے پکار رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کئے، کپڑے پہنے اور گھر سے باہر نکل آیا۔ بے پناہ دھند تھی اور اُس میں ویسا ہی گیلا پن تھا جیسا برسات کے موسم میں اُونچی اُونچی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی دُھند کے ریلوں میں ہوتا ہے۔ میں اُس راستے پر ہو لیا جو میرے گھر اور اُس کے ساتھ ملحقہ دوسرے بہت سے گھروں کو سڑک سے ملاتا ہے۔ یہاں پہلے کوئی گھر نہیں تھا۔ ملک کے بٹوارے کے بعد ہی یہ تمام گھر بنے ہیں۔ یہ شہر کا بیرونی حصّہ ہے جہاں کبھی اینٹوں کے بھٹے ہوتے تھے اور رات کو گیدڑ چیخا کرتے تھے۔ بٹوارے کے بعد بھٹوں کی آگ سے جلی ہوئی یہ زمین بھی آبادی کے قابل بن گئی ہے۔ پہلے یہاں کچی اینٹیں تپتی تھیں اب لوگ تپتے ہیں۔ پہلے یہاں سانچوں میں مٹی کو ڈال کر جلایا جاتا تھا اب لوگوں کے ذہنوں کو جلایا جاتا ہے۔ گھروں کے آنگنوں میں لاکھ کوشش کے باوجود پھول نہیں کھلتے۔ جلی ہوئی مٹی میں پھول کھلیں گے بھی کیا۔ بہت جتن کیا کہ مکان کے برآمدے کے باہر عشق پیچاں اور چنبیلی کی بیلیں لگاؤں گلاب کے پھول اُگاؤں پیزی اور سیوی ٹاکس کے بیج ڈالوں۔ بہترین قسم کا کھاد بھی ڈالا۔ پودے پھوٹے بھی، بڑھے بھی۔ لیکن جب پھول دینے کا وقت آیا تو ایکدم سوکھ گئے۔ جیسے کسی رشی کا سراپ ہو کہ اس دھرتی پر پھول نہ کھل سکیں گے۔ ایک ہی وضع کے بنے ہوئے یہ مکان دراصل مقبرے ہیں جن میں ایک ایک خاندان بند ہے۔ اور سماجی، معاشی، اقتصادی اور جنسی قیدوں کی آگ میں جل رہا ہے، سُلگ رہا ہے، پھک رہا ہے لیکن دھوآں باہر نہیں نکلتا۔ کوئی بیڑی نہیں چھنکتی، کوئی آہنی دروازہ نہیں چیختا۔

ایک خوفناک سنّاٹا۔

ایک مستقل خاموشی۔

جیسے کسی بڑے سے قبرستان کا کوئی کونہ اُونگھ رہا ہو۔

قبرستان کے اس کونے کو سڑک سے ملانے والے راستے اور سڑک کے درمیان ایک گندہ نالا ہے جس میں سارے شہر کا گندہ پانی جمع ہو کر اُس طرف جاتا ہے جہاں کم قیمت کے گھروں کی تعمیر کی سکیم عملی طور پر چالو ہونے والی ہے۔ اس نالے پر ایک چھوٹا سا پل ہے، بڑا نازک اور کمزور۔ اس پر سے کوئی گاڑی، چھکڑا یا کار نہیں گزر سکتی۔ البتہ سائیکلوں پر کوئی روک نہیں اور اُن کے گزرنے سے کوئی حرج بھی نہیں ہوتا۔ صبح کے ان لمحوں میں راستہ گندہ نالا، اُس کا پل اور سڑک سب دُھند میں گھرے ہوئے تھے۔ میں نے پل پار کر کے جب پہلا قدم سڑک پر رکھا تو مجھے یوں لگا جیسے پیچھے سے کسی نے پکارا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا واہمہ ہوگا میں سڑک پر آگے چلنے ہی لگا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اُس کے ساتھ ایک پلّے کی سی چیخ میرے کانوں میں پڑی۔ شاید اپنی ماں سے بچھڑا ہوا کوئی پلا سردی کے کارن چیخ رہا تھا۔ میں پل بھر کو رُکا اور ہوا کا ایک تیز جھونکا میرے کانوں کو چھوتا ہوا گزر گیا اور چیخ اور بھی واضح ہو گئی۔ لیکن وہ چیخ کسی پلّے کی نہیں کسی نوزائیدہ بچّے کی معلوم ہوتی تھی۔ میں پل کی طرف پلٹا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آواز پل کے ہی نیچے سے آ رہی تھی۔ واقعی وہ چیخ ایک بچّے کی تھی۔ میں پل سے نیچے اُتر کر نالے میں آ گیا۔ دھند بہت تھی کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن دُھند کے اس اندھیرے میں چیخیں آگ میں تپے ہوئے تیز بھالوں کی طرح چمک رہی تھیں اور میں اس چمک کا سہارا لے کر پل کے نیچے نالے کے متعفن ترین حصّے میں پہنچ گیا۔ میں نے خود کو بدبو کے حملے سے بچانے کے لئے ناک پر رُومال رکھا ہی تھا کہ میرے پاؤں کسی شے سے بُری طرح لتھڑ گئے۔ میں گھبرا کر واپس مڑنے لگا۔

"تم یہاں تک آ کر بھی واپس جا رہے ہو؟"

یہ کس کی آواز تھی؟

کسی نے مجھے نالے میں اُترتے دیکھ لیا تھا کیا؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

تو کیا یہ میرا اپنا ضمیر چیخا تھا۔
شاید!

میں نے ارادہ بدل دیا۔ واپس مڑنے کے بجائے میں نے جیب میں سے ماچس نکالی اور دیا سلائی جلائی۔ دیا سلائی کی اس ہلکی سی روشنی میں مجھے محسوس ہوا کہ یہ گندہ نالا تو اچھا خاصا جہنم تھا اور پُل کے نیچے کا یہ حصّہ اس کا کوئی آخری کونہ۔ مجھ سے دو ہاتھ کے فاصلے پر ٹھنڈے پانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا پڑا دھاڑ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کسی سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور باقی کا دھڑ ننگا تھا۔ میں نے ایک اور دیا سلائی جلائی اور اُس کے اور قریب ہو گیا۔ گورا چٹا ننگ دھڑنگ ٹھنڈے پانی میں پڑے رہنے سے نیلا پڑنے لگا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی میں پہلا قدم رکھتے ہوئے انسان کتنا مضطرب، بے چین اور ناآسودہ ہوتا ہے۔ وہ احتجاج کرتا ہے کہ اُسے زندگی کی یہ شکل قبول نہیں۔ مُرغی انڈوں میں سے بچّے نکالتی ہے تو چوزے ایک دم پھدکنے لگتے ہیں جیسے وہ اس لمحے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ بلی کے بچّے پیدا ہوتے ہیں تو خاموشی سے ایک دوسرے پر تھوتھنیاں ٹکائے پڑے رہتے ہیں۔ یہ ایک انسان ہی کی میراث ہے کہ جب پیدا ہو تو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخے اور جب مرے تو دوسرے اُس کے لئے چیخیں۔ جیسے رونا انسان کی تصویر ہے اور اُس پر ہنسنا ستاروں کا مقدر۔

آسمان کی نیلاہٹ میں دُھندکے پردے کے پیچھے صبح کا تارہ ہنس رہا تھا اور اِدھر گندے نالے کی دوزخ میں ایک نیا انسان چیخ رہا تھا اور نئے سال کا پہلا سویرا ہوا کے تُند جھونکوں کے ساتھ اُس کا سواگت کر رہا تھا۔

میں اُس کے اور زیادہ قریب نہ جا سکا کیونکہ آگے بہت ہی گندی اور گہری دلدل تھی اور میں اُس میں پھنسنا نہ چاہتا تھا۔ میں دلدل سے سدا ہی گھبراتا ہوں جہاں ایک پاؤں اُٹھانے پر دوسرا اُس سے بھی زیادہ گہرا دھنس جاتا ہے۔ یہ میری کمزوری ہے۔ شاید یہی کمزوری اُن کی بھی تھی جنھوں نے رات ہی رات اس معصوم جان کو ماں کی گرم اور نرم چھاتی سے نوچ کر یہاں کُتّے کی موت مرنے کو پھینک دیا تھا۔ سماج کی اس سڑاند بھری دلدل میں وہ ایک عصمت لٹی دوشیزہ کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھائے آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ تو کیا اب اُس کی لٹی ہوئی آبرو واپس آ گئی تھی؟ کیا اِس بے گناہ کے خون سے اُس کی ماں کی عصمت کا داغ دُھل گیا تھا؟

میں واپس جا رہا تھا اُس راستے پر جو ان مقبرہ نما مکانوں کو سڑک سے ملاتا ہے اور اُس بچّے کی چیخیں قدم قدم پر میرا راستہ روک رہی تھیں۔ فضا میں گونجتی ہوئی وہ چیخیں گندے نالے کی سطح پر اپنی داستان مرتسم کر رہی تھیں۔

"میں نیا انسان ہوں۔ نئے یُگ کا فرمان کرنے آیا ہوں۔ میں ایک نئے دور کی تشکیل کروں گا۔ انسان کے ارتقا کا ایک موڑ اور طے کر دوں گا۔

لیکن نالے کا یہ پانی بہت ہی ٹھنڈا ہے اور ہوا کے جھونکے بڑے تیز ہیں اور پُل کے نیچے مردہ جانوروں کی ہڈیوں اور غلاظت کے ڈھیروں میں سے نکلتی ہوئی بدبُو ناقابلِ برداشت ہے۔ اور یہ دلدل جس میں میرا ایک بازو اور ایک ٹانگ بُری طرح پھنسے ہیں بڑی گہری ہے۔

اور تم اِن سے ڈر کر واپس جا رہے ہو اپنے مقبرے کی طرف تمہارے ہی مقبرے کی طرح ایک اور مقبرہ بھی ہے جہاں میں نے اپنے سفر کے سب موڑ طے کئے ہیں اور جس کی آخری منزل یہ متعفن نالا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری ماں کی طرف کوئی اُنگلی اُٹھائے۔ وہ بڑی نیک عورت ہے بڑی معصوم اور پیاری۔ اُس نے کبھی کسی کا دِل نہیں توڑا۔ اس لئے آخر میں اُس کا اپنا دِل ٹوٹ گیا۔ یہیں کہیں میرا باپ بھی رہتا ہے۔ اُس کی تصویر میری ماں کے ٹرنک میں کپڑوں کے بہت نیچے رکھی ہے۔ تم اُسے ضرور پہچانتے ہو گے۔ کئی بار تم نے اُسے اس پُل پر سے گزرتے دیکھا ہے وہ شاید اب بھی اس پُل پر سے گزرا کرے گا جس کے نیچے اُس کی دی ہوئی ایک زندگی موت کے جبڑوں میں پس رہی ہے۔

میں اپنے باپ کا نام تمہیں نہیں بتاؤں گا۔

میں تمہیں اپنی ماں کا نام بھی نہیں بتاؤں گا۔

میں تمہیں یہ بھی نہ بتاؤں گا کہ میری ماں نے کن مجبوریوں کی بنا پر ایسا کیا تھا۔

لیکن اگر تم اس پُل پر سے گزرنے والے لوگوں کو کسی روز غور سے دیکھو گے، اُن کے چہروں کا جائزہ لو گے اور اُن کے قدموں کی رفتار کو پرکھو گے تو تم میرے باپ کو پہچان جاؤ گے۔ تمہیں اس کی وحشتناک آنکھوں میں میری چیخوں کے ٹوٹے ہوئے نشتر نظر آئیں گے۔ تم اُس کی پیشانی کو دیکھو گے تو اُس پہ میرا نام کھدا نظر آئے گا۔

اور اگر تم اپنے اپنے آنگنوں میں کھڑی چارپائیوں پر لیٹی نڈھال عورتوں کو دیکھ سکو تو تم فوراً میری ماں کو پہچان لو گے۔ اُس کے زرد چہرے پر میری ہی تصویر کا عکس ہے۔ اُس کی غم آلود گہری آنکھوں میں میرا ہی کرب ہے۔ اُس کی لرزتی ہوئی کمزور انگلیوں میں میرے ہاتھوں کا لمس ہے۔ جنہیں پکڑ کر وہ مجھے شاہراہ حیات پر کھڑا کرنا چاہتی تھی اور جس نے مجھے سفر کی ابتدائی منزلوں پر اپنے سے الگ نہ کیا۔ یہ وشواس لے کر کہ وہ شخص جس کی تصویر اُس کے ٹرنک سے نکل کر اُس کے دل میں جلوہ ریز ہے۔ اُس کے ساتھ ہو گا اور اُس کے ساتھ ہونے سے وہ سب کا مقابلہ کر سکے گی۔ کوئی اُس کی طرف آنکھ نہ اُٹھا سکے گا۔ لیکن اب اُس کی طرف بھالے اُٹھ سکتے تھے کیونکہ وہ شخص کہیں بھاگ گیا تھا اور اُس کا کچھ پتہ نہ تھا۔

ان بھالوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت میری کمزور اور نڈھال ماں میں تو شاید تھی لیکن ان لوگوں میں نہیں جن کے رحم و کرم پر وہ اب تھی۔ وہ اُس کے ماں باپ تھے اور جب میں پیدا ہوا تو اُس کی ماں یعنی میری نانی نے مجھے اپنی چادر میں لپیٹا، میرے منہ میں روئی ٹھونسی اور رات کے سیاہ گھنے اندھیرے میں نالے میں پھینک دیا۔ پھینکتے وقت زور کا جھٹکا لگنے سے میرے منہ میں ٹھُسی ہوئی روئی باہر نکل گئی اور جب دلدل میں گرتے ہوئے میرے ہونٹوں سے پہلی چیخ نکلی تو وہ یوں بھاگی جیسے کسی بھوت نے اُس کا دوپٹہ پکڑ لیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا راستے پر چل رہا تھا اور اُس کی چیخیں دُور ہونے کی وجہ سے مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔

"میں یہاں پڑے ہوئے بھی اپنی ماں کی حالت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو نئی زندگی کی تخلیق کے چند ہی لمحے بعد ایک بند کمرے میں بالکل اکیلی پڑی تھی اور اُس لمحے کو یاد کر رہی تھی جب اُس نے پہلی بار اپنی عصمت کا گلا گھونٹا تھا۔

مجھے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ میرا گھر ہے۔ میری ماں کا گھر۔ دیکھنا میرے گھر کی طرف کوئی آنکھ نہ اُٹھائے۔ اُس گھر کے آنگن میں دو نرم اور گداز چھاتیاں ہیں جن میں وہ دودھ ہلکورے لے رہا ہے جنہیں میرے ہونٹ چھو بھی نہ سکے اور جو اب ہمیشہ جوالا مکھی کی طرح سلگتی رہیں گی۔

اور جب کبھی میرا باپ واپس آئے اور اس پُل پر سے گزرے تو اُسے روک لینا اور یہ جگہ دکھانا جہاں میں اب پڑا تڑپ رہا ہوں۔ اُسے بازو سے پکڑ کر اور گھسیٹ کر یہاں لے آنا۔ اگر وہ چیخے اور چلائے تو وہ روئی کا گولہ جو میرے مُنہ سے نکل کر اُدھر جھاڑی میں اٹک گیا ہے۔ اُس کے مُنہ میں ٹھونس دینا کہ وہ چیخ نہ سکے۔"

اور پھر چیخوں کی وہ گونج ایک دم بند ہو گئی۔

میں چلتے چلتے رُک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر پُل کی طرف دیکھا جو گندے نالے کے تعفن کو ڈھانپنے کے لئے ایک ڈھکنے کا کام دے رہا تھا۔

ایک نیا یُگ مر گیا تھا۔ ایک نیا دور فنا ہو گیا تھا۔ ایک نیا زمانہ اُجڑ گیا تھا۔

عفونتوں سے جلی ہوئی مٹی میں ایک کونپل پھوٹی تھی۔ ایک کلی چٹکی تھی، ایک پھول مہکا تھا لیکن صحرا کے بگولے اُسے نگل گئے تھے۔

صبح کے آثار ہویدا ہو رہے تھے۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا تھا۔

اور گندہ نالا ایک بڑے اژدھے کی طرح پھن پھیلائے اُسے گھور رہا تھا۔

ننگی آنکھیں

شکیلہ اختر

ویٹنگ روم کے تنگ کمرے کی سیلی سیلی اور فنائل کی بسی ہوئی مہک سے اُکتا کر تب، دروازے کے سیاہ میلے پردے کو انہوں نے اٹھا کر باہر دیکھا تو سٹون پور کا لمبا پلیٹ فارم حدِ نظر تک دوڑتا چلا گیا تھا، ڈھلتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں خاموش پٹریاں چمک رہی تھیں، مال گاڑی کا کوئی بے کار ڈبہ تک نظر نہ آ رہا تھا۔ اور اتنی گہما گہمی کے بعد اسٹیشن پر اب ایک گہری اداسی چھا رہی تھی۔ ابھی انکو پورے تین گھنٹے یہاں گزارنے تھے اور ایسے سڑے بھسے سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں اتنا لمبا عرصہ گزارنا ان کے لئے ایک بڑی مصیبت تھی۔ فرسٹ کلاس کا ویٹنگ روم مرمت ہو رہا تھا اور وہ سب کی سب فنائل کی بُو سے بے دم ہوئی جا رہی تھیں۔ سیاہ رنگ کے ریشمی برقعوں میں جورجٹ کا باریک نقاب چہروں پر ڈالے ہوئے وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ابھی ابھی اسی پلیٹ فارم پر رکتی ہوئی گاڑی کے سلاخوں لگے دریچوں سے تین خوبصورت خوبصورت بھولے بھالے سے معصوم چہرے انکو تکتے ہوئے چلے گئے تھے اور ننھے ننھے سے ہاتھ اور چھوٹی چھوٹی سی پیاری پیاری انگلیاں بہت دور تک ڈولتی چلی گئی تھیں۔ تینوں بچے ان کے ساتھ یہاں تک آئے تھے اور سارا راستہ انہوں نے ایک ادھم مچا رکھا تھا۔ ٹوفی کا بھرا ہوا ڈبہ جو ممی نے اپنے کو آپی کے ساتھ مارٹن کی فیکٹری سے جا کر خاص طور پر اپنے کونونٹ کے دوستوں کو کھلانے کیلئے لیا تھا۔ اُسی ڈبے پر مجی کی نظر گڑی ہوئی تھی۔ باسکٹ میں چیزوں کو سرکاتے ہوئے اس نے ٹوفی کے اس چمکیلے ڈبے کو دیکھ لیا تھا، اور اس برتھ سے اُس برتھ تک آتے آتے وہ معصومیت بھرے اور غمگین لہجے میں کہتا "امی۔ آپ کا اتنا چھوٹا سا بیٹا جا رہا ہے نا؟ تو پھر آپ اُس کو ٹوفی کیوں نہیں دے رہی ہیں؟ اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں کوثر کی آنکھوں پہ جم جاتیں۔

"تم میرا ٹوفی سب کا سب کر کھ نے جا رہے ہو مجی"؟ ممی کے چہرے کا گلاب بار بار لہک اٹھتا تھا۔ اور ممی کا خوبصورت چہرہ ان دونوں کے درمیان دمک رہا تھا۔ کونونٹ کی پڑھائی نے کوثر کی خوشیوں کو چھین لیا تھا۔ اتنے چھوٹے چھوٹے بچے اس سے جدا ہو گئے تھے گلاب کے پھول جیسا حسین اور بھولا بھالا سا ممی۔ اور پیچھے سے آ کر اس کی گردن میں جھولتا ہوا چھوٹا سا مجی۔ جس نے اپنے کلاس ورک میں ہر نا. بیٔے اور ہر ڈیزائن کے نیچے "اے"۔ اور "بی" لکھے تھے اور اوپر تلے بلبلوں کی طرح کے ٹوکریوں "او" کا بھرمار کر دیا تھا۔ مگر کوثر کو اسی خیال سے تسکین مل جاتی تھی کہ

ممی بے چارہ اُس کی منجھلی بہن کا اکلوتا بچہ بھی تو اپنی ماں سے اتنا دور رہ کر سینٹ زیویر میں پڑھ رہا تھا اور بچاری باجی کا تو ملنے آیا ہوا ہر ایک خط انیس کے مرثیہ سے بھی بعض اوقات بڑھا ہوا رہتا تھا۔ بچے اس کی آپا کے پاس ہی تو تھے ——— !

عذرا کے ساتھ لگی چلتے چلتے ننھی سیمیں اچانک زور سے چلائی " دیکھئے امی دیکھئے بجی کے ٹوفی کا کاغذ"۔ اور تینوں بہنوں کی نگاہیں ایک ساتھ لائن کے قریب پلیٹ فارم کے کنارے مونگ پھلی کے چھلکے اور ٹوفی کے رنگین چمکیلے کاغذ کے ٹکڑوں پہ پڑیں، کوثر نے جھک کر اُن بیلے ہوئے کاغذ کے پرزوں کو اٹھالیا' مونگ پھلی' اور کیلے کے چھلکے کو دیکھ کر بے اختیار اس کا جی چاہا کہ ان سب کو سمیٹ کر وہ اپنے کلیجے سے لگائے اسکو یاد آنے لگا کہ ننھی ننھی سی انگلیوں نے کتنی محنت سے انکو چھیلا تھا اور پھر اس کی نگاہوں میں وہ پیارے پیارے ناخن اُبھر آئے جن کو وہ بڑی دشواریوں اور خوشامد کے بعد قینچی سے تراشا کرتی تھی۔ کوثر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اس نے بڑے پیار سے دکھن کی طرف دیکھا دُور افق پہ گاڑی کے دھوئیں کا نشان تک نہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک اسی طرف دیکھتی رہی اس کے خیالوں میں ڈگ مگ ڈگ مگ کرتی ہوئی لال گاڑی چلی جا رہی تھی اور گنگا کا پانی دُور سے جھلملا رہا تھا۔ اُس نے سوچا سات بجے جب اُس کو یہاں پر گاڑی ملے گی اس وقت تک اس کے بچے گھر پہنچ جائیں گے' اور گیٹ کے اندر جاتے ہی ٹپ ٹپ دوڑتا ہوا گجی اپنے افسردہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بڑے پیار سے لپٹ کر کہے گا " بڑے آپی! آپ کے لئے میرا جی بہت گھبراتا تھا"۔ اور ممی منی ایک ہی ساتھ بڑے ابی کے آگے بجی کی شکایتوں کا دفتر کھول دیں گے۔

شام کا سایہ بڑھتا گیا اور دل کی اداسی کے ساتھ اس میلے وٹینگ روم کو یاد کر کے ان کو وہاں جانا عذاب لگ رہا تھا۔ اور شام کی چائے نہیں پینے کی وجہ سے اُن سب پر ایک سستی سی چھا رہی تھی، ریفرشمنٹ روم میں اردلی کو بھیج کر چائے منگوانے کا مطلب یہ تھا کہ انسپکٹر اور داروغہ جی بیروں کے ساتھ کئی تشتریوں میں بھرے بھرائے ناشتے چائے لئے اپنی ڈیوٹی پہ پہنچ جاتے اور وہ اس طرح سے اپنا تماشہ بنانا نہیں چاہ رہی تھیں اور اسٹیشن کے اسٹالوں پر کی اونٹی ہوئی بدمزہ چائے پینے کو اُن کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بے مقصد سامنے کھیتوں اور کوارٹروں کو تکتے تکتے سب سے بڑی بہن شائستہ نے سوچا کہ اس طرح کھڑے رہنا ان کے وقار کے خلاف تھا۔ اور جب وہ کمرے کے دروازے کی طرف مڑی' تو اُس نے کوثر کے اردلی کو بڑے احترام کے ساتھ قریب ہی کھڑا دیکھا' اب تک وہ اس کو بھولی ہوئی تھی' کیا خیال کرے گا وہ بھی ؟ اور شاہینہ کے چہرے پہ ندامت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

رات کے ہلکے اندھیرے میں گاڑی کی آتی ہوئی روشنی جب دُور سے چمکی' تو ان کے اکتائے ہوئے چہروں پر بھی تازگی آ گئی تھی' فسٹ کلاس کے ایک کوپے میں سوار ہونے ہوتے کوثر نے نقاب اُٹھا کر ایک بار پھر انہی پھاٹکوں کی طرف دیکھا اتنے چلتے ہوئے قدموں کے ہجوم میں اس کو کچھ بھی نظر نہ آیا' اور اس کا دل ایک بار پھر بُری طرح سے گھبرا گیا، وہ اپنے بچوں سے اور بھی دُور ہو جائے گی۔ اور جب اس کی آیا ننھے سے ہمک ہمک کر منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنستے ہوئے رومی کو لئے ہوئے اندر آئی تو کوثر نے اس کو لے کر بڑے پیار سے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ اپنے ریشمی برقعوں میں وہ تینوں بہنیں ایک ہی برتھ پہ ساتھ بیٹھ گئیں۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گھما گھما کر بڑھیا کی طرح باتیں کرنے والی چھوٹی سی بچی سیمیں کے چہرے پر بجی کی جدائی کا غم چھایا ہوا تھا۔ اور جنم سے محرمی صورت والی ننھی سی نشی عذرا کی گود میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی وہ ابھی ٹھیک کر بیٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ کوپے کے اندر ایک صاحب اپنا سامان لئے ہوئے داخل ہوئے اور دوسری سیٹ پر جم گئے۔ انہوں نے جب تکیہ پر آ کے کر ڈبے کا جائزہ لیا تو پھر اچانک سنبھل کر بیٹھ گئے " ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے" ؟ باریک نقاب کو ہلکی سی تھرتھری ہوئی " جی آپ فکر نہ کریں "۔ اور گاڑی چلنے سے پہلے بھاری بھر کم جستے کی ٹاپ کے ساتھ اردلی کی سیمل اور سرخ رنگ کی پگڑی کوپے کے اندر جھلک اُٹھی " حضور ذرا خیال رکھیں گے۔ ایس۔ پی صاحب کی فیملی جا رہی ہے۔ میں یہیں پر سرونٹ میں ہوں " اور وہ صاحب تکیہ پر لدے ہوتے ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھ گئے، اس دفعہ ان کے چہرے پر تنتناہٹ سی آ گئی تھی " جی۔ جی۔ میں خیال رکھوں گا۔ آپ اطمینان سے رہیں "۔ مگر ان سارے خلوص کے باوجود نقاب کے اندر عذرا کے چہرے پر ایک تلملاہٹ چھا گئی تھی " آج کا سفر ہی منحوس تھا۔ ٹھک ٹھک کر کے پچاس گھنٹوں میں چلنے والی گاڑی پر اس طرح سے نقاب ڈالے بیٹھے رہنا کتنا بڑا عذاب تھا"۔ رات کے اندھیرے میں ڈگ ڈگ ڈولتی ہوئی گاڑی چلی

جا رہی تھی اور مدھم سی لائٹ کا ایک ہلکا سا یہ کوپے میں روشنی کا بس اک احساس دلا رہا تھا۔ دریچے کے باہر منہ دیئے دیئے وہ اکتا گئی تھیں اچانک عذرا نے اپنے چہرے کا نقاب الٹ کر سیمیں کو دیکھا گاڑی کے جھٹکوں سے جھولا سا جھولتی ہوئی سیمیں کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سیمیں اور نشی کو اپنے قریب ہی سُلا کر وہ ڈبے کی دیوار سے آڑے کر بے پروائی سے بیٹھ گئی تھی۔ آپا نے سوئے ہوئے رُومی کو دوسرے برتھ پر تکیہ سے آڑ دے ہوئے صاحب کے پیروں کے پاس وائل کا تھان اور گدا بچھا کر سلا دیا تھا۔ کوثر اور شائستہ کے نقاب بھی اُلٹے جا چکے تھے اور اب وہ سیدھی ہو کر بڑے وقار کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں، سیاہ رنگ کے ریشمی برقعوں میں ان کے کھلے ہوئے چہروں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے رات کے اندھیروں میں روشنی سے جگمگاتے ہوئے کمروں کے دریچوں کو کھول دیا گیا ہے۔ کوپے کے اندر کی فضا اونگھ رہی تھی مگر ؛ ڈبے سے باہر پہیہ سے نکلتی ہوئی قسم قسم کی آوازیں طرح طرح کی چرمراہٹیں اندھیرے اور سناٹے میں شور مچا رہی تھیں۔ شائستہ نے اپنی بوجھل ہوتی ہوئی آنکھوں کا خمار دور کرنے کو دوسرے برتھ پر سوئے ہوئے رُومی کو دیکھا اور وہ صاحب اپنے تاروں پر اس کی آنکھوں کی خلش پا کر اٹھ بیٹھے۔ "جی! معاف کیجئے گا آپ لوگ ایک برتھ پر تکلیف سے ہیں اور میں اتنے آرام سے ہوں۔" "جی۔ میں جوڈیشل مجسٹریٹ ہوں یہیں سستی پور میں" اخلاقاً شائستہ کو اس کی باتوں کا جواب دینا پڑ رہا تھا اور وہ مجسم اخلاص بنا ہوا بولا "جی! آپ۔ آپ شاید ایس۔ پی صاحب کی ماں ہیں" ؟ شائستہ سُن ہو کر رہ گئی گھر سے آتے آتے اتنے سے راستے میں وہ اتنی بدل چکی تھی ؟ — عذرا اور کوثر کے چہروں پہ دبی دبی خاموش ہنسی لوٹ پوٹ گئی۔ اور شائستہ نے بڑی دھیمی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا "میں ان دونوں کی بڑی بہن ہوں۔" وہ اپنے غلط اندازے پہ ذرا سٹپٹایا۔ "اوہ۔ اوہ معاف کیجئے گا۔ یہ بچہ تو بڑا پیارا ہے۔" وہ کوپے کی خاموشی سے شاید گھبرا گیا تھا جو مسلسل بولے جا رہا تھا "آپ لوگ کہاں جا رہی ہیں ؟ مظفرپور — ؟ یا دربھنگہ ؟" اور شائستہ کا چڑچڑایا ہوا جی چاہا کہ ایک ہی ساتھ وہ اپنے خاندان کا شجرہ، ان کی عمریں، اور اُن کے عہدے سب کچھ بتا دے اور یہ بھی کہہ دے کہ مظفرپور کے اسٹیشن پر اس کے ماموں جان کی بیس ہزار روپے کی نئی شیورلٹ کار اُن کو لینے کے لئے آئے گی اور کلب روڈ پر بنی خوب صورت کوٹھی کے ڈرائینگ روم کے چمکتے ہوئے کھانے کی میز پر بھنے ہوئے مرغ، مچھلیوں کے کٹلٹ کے ساتھ اور بہت سی ان گنت چیزیں کھانے کو ملیں گی، اور پھر وہ خوب صورت گدے دار بستروں پر سفید جالی نیٹ کے پردے گرا کر سو رہیں گی اور تب وہ لطیف خوابوں کے درمیان کبھی کبھی مسکرائیں گی۔ اور تم جو جوڈیشل مجسٹریٹ ہو اور اردو کی قابلیت بگھارتے ہوئے "میں" کی جگہ "ہم" استعمال کر رہے ہو تم سستی پور کے میلوں سے دھک دھکاتے ہوئے اسٹیشن پر اتر کر کشتی والوں سے سستا ریٹ طے کرانے کے بعد جب اپنے گھر میں پہنچو گے تو ڈیوڑھی میں ہاتھ کا لمبا سا گھونگھٹ کھینچے ہوئے خود تمہاری ماں کے سن کی تمہاری بیوی پہلے تمہارے پاؤں کو اپنی انگلیوں سے چھوئے گی، پھر اس کو اپنے ماتھے سے لگائے گی اور تب زمین پر ٹاٹ کا ایک آسن بچھا کر پیتل کی ایک بڑی سی تھالی میں آدھ سیر اُبلے اُبلے بھات کے ساتھ بینگن کا چوکھا اور کالے پیلے رنگ کی ترکاریوں کا ایک ڈھیر تمہارے آگے لگا دے گی اور تم ہینگ اور سونف کی بو کے ساتھ اس کو بڑی رغبت کے ساتھ کھا کر زور کی ایک ڈکار لو گے اور پھر اپنے میلے دسلے بستر پر پڑ کر زور زور کے خراٹے لگاتے رہو گے" مگر نجانے کیوں اُس کے لب خاموش رہے اور ایک بیزاری کے ساتھ وہ دریچے کی طرف مڑ کر باہر تاریکیوں کو دیکھنے لگی تھی۔

سرائے اسٹیشن پر بڑی تہذیب سے کسی نے اندر آنے کی اجازت مانگی اور جواب ملنے سے پہلے ہی بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ کوثر اور عذرا ایک ہی ساتھ چونک اٹھیں۔ شائستہ نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اس کی اونچی سی کسی ہوئی پگڑی پر گئی، اُس کی داڑھی سیاہ تھی، اور لوہے کا پتلا سا کڑا پہنے ہوئے ہاتھ میں وہ کسی ایجنٹ کی طرح چمڑے کا بیگ تھامے ہوئے تھا۔ کوثر کی آنکھیں لرز اٹھیں اور اس نے رومی کے پاس بیٹھی ہوئی آپا کو پکار کر کہا "بے بی کو یہیں پہ لیتی آؤ" اس کی اتنی ہلکی سی آواز میں مشرقی پنجاب کی مٹی ہوئی سسکیوں کی تھرتھراہٹ نہ جانے کیوں اچانک بھر گئی تھی۔ سب سے چھوٹی بہن عذرا کی آنکھیں کٹی تراشوں والے نیلے شیشے کی عینک کے اندر سے بھی تلخیوں سے بھری ہوئی جھلک رہی تھیں۔ شائستہ نے باری باری اپنی دونوں بہنوں کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ صرف ایک کسی ہوئی پگڑی نے اتنے دور بٹے ہوئے مشرقی پنجاب کو ان سے اتنا قریب کر دیا تھا۔ ؟ اور ہندی

زبان بولنے کا عادی یہ بہاری جوڈیشیل مجسٹریٹ جو اتنی دیر سے بڑے اخلاص کے ساتھ فصیح اردو زبان بولنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، اس کو دیکھ کر اس وقت اس اکیلے کمپارٹمنٹ کی مدھم سی روشنی میں بہار کی ڈوبتی ہوئی چیزوں کی تڑپ کیوں نہ ان کی آنکھوں میں ہراساں ہوئی تھی؟ —

ایک عجیب سی بے گانگی کا اثر کوپے کے اندر چھا گیا تھا، گاڑی اسی انداز سے لڑکھڑاتی اور ڈگمگاتی جا رہی تھی اور کوپے کی مدھم لائٹ کبھی کبھی بھڑک کر تیز ہو جاتی تھی۔ دونوں نے اپنے برقعوں میں سمٹی ہوئی دو نیچے پہاڑ لئے ہوئے خاموشی سے آنکھیں بند کئے تھیں۔ تاریک رات کا اداس سناٹا اور میلوں تک اندھیرے کھیتوں کی سرسراتی ہوئی ہلکی سی گونج میں پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور انجن کے جھٹکے شور مچا رہے تھے۔ جوڈیشیل مجسٹریٹ نے پڑھتے پڑھتے اخبار کا ورق الٹا ہی تھا کہ وہ جیسے منتظر بنے رہتے اچانک بول اٹھا "میں آپ کا ہاتھ دیکھے بنا بتا سکتا ہوں جی! کہ آپ کی لک کیا اور کیسی ہے!" جوڈیشیل مجسٹریٹ چونک کر بیٹھ گئے "اچھا!" اور برقعے کے اندر اونگھتی ہوئی عذرا کو یہ گھسی گھسائی باتیں اور بھی بری لگیں۔

"آپ کوئی افسر ہیں جی۔ اور ابھی ٹور سے واپس آ رہے ہیں۔ اور یہ۔ یہ کہ آپ سوچنے کا وقت گزار کر سوچتے ہیں اور پھر آپ کو افسوس ہوتا ہے کہ یہ کام آپ پہلے ہی کیوں نہ کر سکے تھے۔ یہ پامسٹری کا شوق بھی بڑا ہی مزے کا ہوتا ہے جی"

عذرا ایک بار کھول اٹھی "کیا مصیبت ہے یہ فرسٹ کلاس بھی اور لیڈیوں کو زنان کے لئے سرونٹ میں بیٹھنے کو سیٹ مل جاتی ہے اور یہ دفعہ ہیں کہ ایک طرح سے بیٹھے بیٹھے اپنا کچھ مرنکل جاتا ہے ایسی آفیسری شان سے انٹر کا زنانہ ڈبہ ہزار درجہ بہتر تھا۔"

"آپ کا شبھ نام" ؟ جوڈیشیل صاحب آخر اپنی اوقات پر اتر آئے تھے۔ بھلا اردو کا جھنجھٹ کچھ آسان تھوڑا ہی تھا۔

میرا نام بلونت سنگھ ہے جی — بلونت سنگھ راگھی۔ میں اسٹوری رائٹر ہوں" اپنے ہاتھوں کے حلقے پر سر کو جھکائے ہوئے شائستہ نے چونک کر دیکھا "بلونت سنگھ" ؟ اور پھر اس کی نگاہیں پھسلتی چلی گئیں۔ بے حد حسین اور خمار سے بھری ہوئی آنکھیں، خوبصورت اور بولتے ہوئے لب، ترشا ہوا ستاروں کی طرح دمکتا ہوا چہرہ، داڑھی کے ہلکے بالوں کو سنوار کر بڑے مزے میں تھوڑی کے نیچے گرہ لگایا گیا تھا۔ وہ مغل آرٹ کا بہترین شاہکار تھا یا جہانگیر کے خاندان کا کوئی بھٹکا ہوا شہزادہ"۔ کوثر اور عذرا کی نگاہیں بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

"تو آپ نے اپنی پامسٹ نگاہوں سے بہار کی ریکھاؤں میں کیا کیا دیکھا؟" جوڈیشیل صاحب موڈ میں آ گئے تھے۔

"کچھ نہ پوچھو جی۔ کیا کیا نہیں دیکھا۔ گندگی، فاقہ اور جہالت بس یہی ہے تمہارا بہار۔ بری آب و ہوا۔ اور بیماریوں کی کثرت"۔ بلونت سنگھ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

"تب تو آپ کا تجربہ ابھی کچھ کچا معلوم پڑتا ہے۔ آپ نے پٹنہ کی بعض گندی گلیوں میں گھوم کر غلطی سے پورے بہار کا چکر سمجھ لیا ہے" جوڈیشیل صاحب کے خون میں تھوڑا سا ابال آ گیا تھا۔

بلونت سنگھ کے لب بہت ہی دھیرے سے مسکرائے "نہیں جی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ یہی دیکھئے جی اسی ڈبے میں اس برقعہ کے اوپر وہ تینوں چہرے پیلے رنگ کے اور اداس نہیں ہیں؟ اور اس اچانک حملے سے وہ تینوں بہنیں تلملا کر رہ گئیں "آخر یہ کون سا بلونت سنگھ تھا شائستہ کے دل میں ایک کرید سی لگی ہوئی تھی اس وقت تک اس نے اردو کے ادیب بلونت سنگھ کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ آخر اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی ڈالا "آپ کے افسانے کون سے پرچوں میں چھپتے رہے ہیں؟ —

میں پرچوں میں نہیں لکھتا۔ فلموں کا اسٹوری رائٹر ہوں جی۔ آپ نے شاید دیکھے ہوں گے سنگدل، شگوفہ، اور پرچھائیاں، یہ میری ہی لکھی ہوئی کہانیاں تھیں۔ اور میں نے اس بات کی کوشش کی ہے جی کہ ہماری کہانیوں میں کچھ وسعتیں ہوں کچھ گہرائیاں ہوں اور کچھ بلندیاں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہمارے بنائے ہوئے تمام کی فلمیں اور دوسری فلمی کہانیوں سے اپنا ایک علیحدہ اور اونچا مقام رکھتی ہیں"۔ بلونت سنگھ بڑے فخر سے بولا۔ تب اچانک شائستہ کو اپنا مقام اونچا نظر آیا۔ یہ ننگی فلموں کی گندی کہانیاں لکھنے والا ابھی ہمارے بہار کے منہ آ رہا تھا۔ جو پنجاب کے گندے

جو برسوں میں برسوں کے بعد نہاتا ہے وہ بہار کے ہریالے کھیتوں اور چھوٹا ناگپور کے دولت بھرے حسن کو جھٹلا رہا تھا۔ اور شائستہ ایک وقار کے ساتھ پھیل کر بیٹھتی ہوئی بولی " معاف کیجئے گا بلونت سنگھ جی۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری بے حیائیوں کی آڑھت بن چکی ہیں، اور فلمی کہانیاں لکھنے والے اس بلیک مارکٹ میں اپنا وہی مال کامیابی کے ساتھ بکتا ہوا دیکھتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ فحش اور عریانی کا اشتہار دیا گیا ہو۔" شائستہ نے بہار پر کئے گئے غلط الزام کا بدلہ لے لیا تھا۔

"آپ جس چیز کو عریانی کہہ رہی ہیں آرٹسٹ اس کو ایک آرٹ سمجھ کر پیش کرتا ہے۔ یہ تو جی۔ اپنا اپنا خیال ہے، ہم اجنتا کے تراشے ہوئے بتوں کے عضو عضو کو دیکھ کر آرٹسٹ کے کمال پہ پھڑک اٹھتے ہیں —— اور جی بہت سے لوگ ایسے بھی تو ہوا کرتے ہوں گے جن کی آنکھیں انہیں دیکھ کر بند ہو جانا پسند کرتی ہوں گی۔" شائستہ ذرا کسمسائی "مگر دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اجنتا کے تراشے ہوئے بت خاموش ہیں، اور فلموں کی عریانی میں آرٹسٹ کا آرٹ مسلسل ایک پکار ہے۔"

جوڈیشیل مجسٹریٹ پھڑک اٹھے۔ "جی ہاں۔ جی ہاں آپ نے بہت ٹھیک کہا، آرٹ وارٹ کچھ بھی نہیں، یہ فلموں والے بس ایک بیوپار کرنا جانتے ہیں۔"

بلونت سنگھ بڑی سنجیدہ ہنسی ہنسا۔ "میں دواؤں کا ایجنٹ بھی ہوں جی اور اپنی عمر کے اتنے چھوٹے سے تجربے میں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کون کون سی دوائیں کس کس بیماریوں میں شفا دے سکتی ہیں۔ اسی طرح سے ایک فلمی اسٹوری رائٹر اپنی کہانی میں آپ کے دل کے اندر کی چھپی ہوئی اس مانگ کو پوری کر دیتا ہے جس کا اظہار آپ کھلے طور پہ کرنا نہیں چاہتے ہیں اور یہی ایک آرٹسٹ کا کمال ہے۔"

گفتگو کا رخ جس موڑ پہ آگیا تھا شائستہ ایک خاموش تماشائی کی طرح وہاں اب صرف تماشا دیکھ رہی تھی۔

جوڈیشیل مجسٹریٹ کی آنکھیں مسکرائیں۔ کوثر اور عذرا نے اپنے اپنے نقاب کو ذرا آگے پیشانی پہ کھینچ لیا تھا۔ اور بلونت سنگھ کے مسکراتے ہوئے لب پہ بہت سی ان کہی باتیں پھڑک رہی تھیں۔

"تو صاحب یہ ساری دنیا ہی عریانیوں سے بھری پڑی ہے اور یہ چکر بڑا لمبا سا چلتا چلا گیا ہے۔ ہماری اور آپ کی ہستی ہی ایک عریانی کی داستان ہے جی۔ وہ سکون کے ساتھ بڑے بھولے پن سے بولا۔ "آپ ہمیں معاف کریں گی جی۔" وہ اچانک دوسری برتھ کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھا —— میں اتنی شرابیں پیتا ہوں جس کا کوئی اینڈ نہیں۔ اور میرا باپ بھی اتنی شرابیں پیتا ہے اتنی شرابیں پیتا ہے اس کا بھی کوئی اینڈ نہیں۔ اور کبھی کبھی ہم ایک ہی میز پہ ساتھ ساتھ مل کر پیتے ہیں اس وقت وہ ہمارا باپ نہیں ہوتا اور نہ میں اس کا بیٹا ہی ہوتا ہوں۔ بس ہم دو شراب پینے والے نشے میں جھوم اٹھنے والے دو میخوار ہوتے ہیں اور ہماری بادہ نوشیوں کی یہی انتہا، یہی عریانی اس حد تک پہنچ کر ایک آرٹ بن جاتی ہے۔"

اچانک کوثر کی سہمی ہوئی سیاہ پلکیں بلونت سنگھ کی طرف اٹھیں اور عذرا نے بڑی گھبرائی ہوئی بے کل نظروں سے اس کو دیکھا۔ وہ سچ مچ جیسے نشے میں بہک رہا تھا۔ "سینما کے پردے پہ رقص کرتی ہوئی عریانی سے کہیں زیادہ ہماری آنکھوں کی پتلیوں میں ہمارے خاموش لبوں کی تھرتھراہٹ میں۔ اور ہماری پلکوں کی ایک ایک نوک پہ خود ہماری گزری ہوئی زندگی کی عریانی ناچ رہی ہے۔ آپ نے ہماری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں میں چھپی ہوئی ان ہلکی شکنوں پہ کبھی غور نہیں کیا ہے"؟

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ کسی پلیٹ فارم سے لگ کر ٹھہر گئی۔ دروازہ کھول کر اردلی جب اندر آگیا تو ایک دفعہ تینوں بہنوں نے اطمینان کی لمبی سانس لیتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر کر سوچا کہ اگر مظفر پور کا اسٹیشن اتنا جلدی نہ آجاتا تو نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں نہ جانے کتنی دیر تک رقص کرتی رہتیں۔

پہنچیاں

صادق حسین

ازدواجی زندگی کے ابتدائی دنوں میں فریداں نے پہنچیوں کی فرمائش کی اور مستری خداداد خاں نے تہیہ کر لیا کہ وہ فریداں کی کلائیوں میں چار تولے سونے کی دو پہنچیاں پہنا کر ہی دم لے گا۔

فریداں ایک خوبصورت بچی کی ماں بن گئی۔

ایک عرصۂ دراز گزر گیا۔

مستری خداداد خاں کو اپنی اکلوتی بیٹی سکینہ سے بے حد محبت تھی اور وہ اپنی رفیقۂ زندگی فریداں پر جان چھڑکتا تھا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ اور سردیوں کی برفانی ہواؤں میں وہ برسوں اینٹ گارے کی دنیا سے جنگ آزما رہا۔ سکینہ دیکھتے ہی دیکھتے اتنی لانبی ہو گئی کہ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو دونوں چھوٹی بڑی بہنیں معلوم ہوتیں۔ اب سکینہ پانی سے بھرے دو گھڑے سر پر رکھ کر بات کی بات میں کنوئیں سے گھر پہنچ جاتی۔ بھوری بھینس کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی۔ چارہ ڈالتی۔ دودھ دوہتی۔ اسی دودھ کی فراوانی ہی سے تو ماں بیٹی کے گال انگارے کی طرح سرخ تھے۔ خداداد کے بازوؤں کی طاقت جوں کی توں قائم۔

جب فریداں دہی کی مٹکی کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر مدھانی کی ڈوری کے سرے ہاتھوں سے باری باری کھینچتی، سل بٹے سے مسالہ پیستی یا توے کے پاس کھڑی ہو کر روٹیاں لگاتی تو اس کی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں شور مچانے لگتیں۔ یہ شور سن کر خداداد خاں کا چوڑا چکلا سینہ ابھر کر آہنی دیوار بن جاتا اور اس آہنی دیوار کے تلے صرف ایک آرزو، صرف ایک تمنا، صرف ایک ارادہ کروٹیں لینے لگتا۔ اسی ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خداداد خاں ایک مشین بن گیا تھا۔ نور پور سے راولپنڈی اور راولپنڈی سے نور پور، گرمی ہو یا سردی، وہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں کرنی اور بسولی لے کر صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور رات کو لوٹ کر آتا۔ بانسوں کی اونچی پاڑ پر کھڑے ہو کر چنائی کرتے ہوئے جب اسے کوئی بات یاد آجاتی تو وہ ہاتھ روک کر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ نیچے سڑک پر تانگے، لاریاں، کاریں، سائیکلیں رواں دواں نظر آتیں۔ اجلی اجلی پوشاکیں پہنے ہوئے شہری چلتے پھرتے دکھائی دیتے۔ ہوٹلوں اور سینماؤں سے گراموفون ریکارڈ بجتے سنائی دیتے۔ زیرِ تعمیر عمارت کی بلند ہوتی ہوئی دیوار سے ساہول لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ یہ سب دولت ہی کے تو کرشمے ہیں۔ لیکن اسے دھن دولت کی ضرورت نہیں۔ اسے تو صرف چار تولے سونا مہیا کرنا ہے۔

خیالوں میں کھویا ہوا وہ پھر کرنی چوٹے سے چکلے ہاتھ کی گرفت میں لے لیتا اور پھر اُسی تیزی سے ردّے پر ردّا رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔

ہر روز کام پر جانے سے پہلے خداداد خاں گرم تنوری کی روٹی پر مکھن ڈال کر کھاتا، پھر لسّی کے دو بڑے بڑے پیالے پی کر چلم کے دو چار بڑے کش لگاتا۔ دھوئیں کے مرغولے اُڑ اُڑ کر کارنس پر رکھے ہوئے مٹی کے پیالوں، رکابیوں اور صحنکوں پر منڈلانے لگتے۔ پھر طاق پر رکھے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے جب وہ صافے کا شملہ درست کرتا تو اُس کے ماتھے پر چھوی کا ایک بڑا سا نشان عہدِ رفتہ کی یاد تازہ کر دیتا۔ اُس وقت وہ جھک کر کھڑکی سے اُس پگڈنڈی کی طرف دیکھتا جو کھیتوں کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی پہاڑی کے دامن تک چلی گئی تھی۔ وہی راستہ سید پور کو جاتا تھا۔ اُسی راستے سے وہ فریداں کو پالکی میں بٹھا کر لایا تھا۔ اُسی پگڈنڈی پر پہاڑی کی اوٹ میں اُس نے چھویوں کے وار روکے تھے۔ وہیں ایک چھوی چمک کر اُس کے ماتھے میں پیوست ہو گئی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ کرنی اور بسولی لے کر باہر نکل جاتا۔ برسوں پہلے دنداسے سے رنگے ہوئے ہونٹوں سے نکلی ہوئی گنواری فرمائش پھر اُس کے کانوں میں گونجنے لگتی اور زندگی کی ہر سانس کے ساتھ اُس کا ارادہ پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا۔

شام کے وقت کام ختم ہونے پر جب ٹھیکیدار راجوں اور مزدوروں کو اُجرت بانٹتا تو خداداد خاں کی روزانہ مزدوری سے آنہ دو آنے کاٹ لیتا اور پھر مخلصانہ انداز میں خداداد خاں سے مخاطب ہو کر کہتا "یہ تمہاری امانت ہے۔ یہ پیسے کبھی تمہارے کام آئیں گے" اور خداداد خاں جو کوڑی کوڑی دانتوں سے پکڑنے کی فکر میں رہتا، اپنے پُرانے ٹھیکیدار کا یہ جملہ سن کر مُنہ سے کچھ نہ بولتا مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا اور پھر اپنے اوزار سنبھال کر صرافوں کے بازار کی طرف چل دیتا اور وہاں کے شوکیسوں میں سجی ہوئی پہنچیوں کو دیکھتا ہوا، ہزاروں باتیں سوچتا ہوا نور پور کی سمت نکل جاتا۔

روپیہ بڑی کاوشوں سے آہستہ آہستہ اکٹھا کیا جاتا اور پھر اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خرچ ہو جاتا۔ ہر چار چھ مہینے کے بعد کوئی نہ کوئی بپتا آن ہی پڑتی۔ بچے بچائے پیسے اُڑ جاتے۔ بات پھر از سرِ نو شروع ہوتی۔ اُمیدوں کی کونپلیں پھوٹنے لگتیں۔ پھر خوابوں کے محل یک بیک ڈھے پڑتے۔ زندگی یونہی چکر کاٹتی رہی۔

ہر سال موسمِ بہار میں شاہ لطیف کی درگاہ پر میلہ لگتا۔ بڑی دھوم دھام سے پشاور سے چراغی آتی۔ جگہ جگہ خیمے تن جاتے۔ مُلک کے گوشے گوشے سے آنے والے زائرین کا تانتا بندھ جاتا۔ چند دنوں کے لئے سارے نور پور میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ رات کے وقت پہاڑیوں کے دامن میں، ندی کے کنارے، نوری باغ میں، غرضیکہ چپّے چپّے پر پٹرومیکس لیمپ روشن ہو جاتے۔ سارنگی اور طبلے کی سنگت میں سنہری آوازوں کی تڑپ دلوں میں ہلچل مچا دیتی۔ بری بری کے نعروں سے فضائیں گونج اُٹھتیں۔ سکّوں اور نوٹوں کا مینہ برسنے لگتا۔ برسوں پہلے میلے کے دنوں ہی میں خداداد خاں نے فریداں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اُس وقت خداداد خاں کی کبڈی کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ ڈھائی من کا پتھر اُٹھا کر ہوا میں یوں پھینک دیتا تھا جیسے روئی کا گالا ہو۔ ہر سال موسمِ بہار کا یہ میلہ بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کر دیتا۔ نہ جانے کیوں اُن دنوں خداداد خاں عجیب طور پر جذباتی ہو جاتا۔

ایک دن میلے کے دنوں میں، خداداد خاں جب شہر سے گھر لوٹ کر آیا تو سکینہ کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ فریداں اکیلی چٹائی پر آلتی پالتی مارے لحاف میں ڈورے ڈال رہی تھی۔ خداداد خاں اُس کے بالکل قریب بیٹھ گیا اور پھر فریداں کے کانوں میں لٹکتے ہوئے چاندی کے جھمکوں کو اُنگلی سے چھوتے ہوئے بولا "پھر میلے کے دن آ گئے"

"اُوں ہوں کام کرنے دو نا" فریداں نے ہاتھ جھٹک کر کہا اور اُس کی کلائی میں کانچ کی چوڑیاں بج اُٹھیں۔

"پہلے ایک آدھ چپت کھا لو پھر کام کرنا" یہ کہتے ہوئے خداداد خاں نے صافے کے کونے میں بندھے ہوئے اَلوچے دھپ دھپ لحاف پر گرا

میٹھے اور پھر ایک آدھ اُٹھا کر فریداں کے مُنہ میں ڈال دیا - فریداں کے رخساروں میں گلاب کی سُرخی دوڑ گئی -

" یہ تمہارے ماتھے پر کیا ہے ؟" فریداں نے سرگیں آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے پُوچھا -

"ایک نشانی "

"کس کی ؟ "

" سید پور کی شہزادی کی "

اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے - اِتنے میں سکینہ آنگن میں داخل ہوئی - خداداد خاں اُٹھ کر چارپائی کی ادوائن کسنے لگا -

اُس رات خداداد خاں ندی کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا - سوچتے سوچتے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں - آہنی دیوار کے تلے دھائیں دھائیں ہونے لگی - صرافوں کے بازار کے بڑے بڑے شوکیس اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور اُن شوکیسوں میں سجی ہوئی پہنچیوں کے ننھے ننھے طلائی گنبد اُبھر کر ندی کے پانی میں تیرنے لگے - گوشے گوشے سے نغمہ و ساز کے چشمے پھوٹ رہے تھے - آس پاس سے برّی برّی کے نعرے بلند ہو رہے تھے - آسمان پر ماہِ کامل چمک رہا - ایک چاند ندی کے پانی میں لرز رہا تھا - خداداد خاں نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صافے کے کونے سے خشک کر ڈالے - پھر وہ چھوی سنبھال کر گھر کی جانب چل دیا -

زندگی یونہی چکر کاٹتی رہی -

آخر ایک دن خداداد خاں کی کائنات مُسکرا اٹھی - اُس دن حجازِ مقدس روانہ ہونے سے پہلے ٹھیکیدار نے چار سو روپے کی رقم خداداد کی جھولی میں ڈال دی -

" یہ تمہاری امانت ہے " ٹھیکیدار نے معنی خیز مُسکراہٹ کے ساتھ کہا -

خداداد خاں کا دل بلیوں اُچھلنے لگا - فریداں کی فرمائش پُرانی ہو چکی تھی مگر اُس کا عزم ابھی تک جوان تھا - اُس دن وہ کام پر نہ گیا بلکہ سیدھا صرافوں کے بازار میں چلا گیا - اُس راستے سے وہ ہزاروں بار گزر چکا تھا - اُس کی آنکھیں وہاں کے ایک ایک شوکیس سے مانوس تھیں - پُرانے قلعہ کی طرف جاتی ہوئی چھوٹی گلی کے نکڑ والے نلکے سے اُس نے سینکڑوں بار اوک سے پانی پیا تھا - بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑے ہو کر نہ جانے کتنی مرتبہ اُس نے شوکیسوں میں سجی ہوئی پہنچیوں کو نظروں میں سمیٹا تھا - نلکے اور بجلی کے کھمبے کے درمیان والی دُکان میں پہنچیوں کے ان گنت جوڑے تھے ، ہر نمونے ، ہر وزن اور ہر مذاق کی پہنچیاں - خداداد خاں نے اُسی دُکان سے چار تولے سونے کی دو پہنچیاں خریدیں - اُنہیں سُرخ ٹشو پیپر میں لپیٹ کر اپنی کالی واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور پھر تانگے میں بیٹھ کر نُور پور کی سمت چل پڑا -

تانگے میں جُتا ہوا سفید گھوڑا مری روڈ پر قدم چال جا رہا تھا - سڑک کے دونوں طرف شیشم کے پیڑوں کی قطاریں تھیں اور اُن سے پرے کھیتوں میں سرسوں کے پھولوں کی پیلی پیلی ردائیں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھیں - کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چند دیہاتنیں گھڑے سر پر اُٹھائے ایک قطار میں چل رہی تھیں - اُن کے اُوپر ، بہت اُوپر ، آسمان کی بلندیوں میں کُونجوں کی ایک ڈار اُڑتی ہوئی پہاڑوں کی سمت جا رہی تھی - کیکر کے زرد زرد پھولوں کے نیچے بیٹھا ہوا نوجوان دیہاتی مخصوص غیر فانی لے میں وارث شاہ کی ہیر گا رہا تھا اور پگڈنڈی پر چلتی ہوئی گوریوں کے ننگے پاؤں رُکے جا رہے تھے -

" فریداں ابھی تک جوان معلوم ہوتی ہے - یہاں تک کہ وہ اور سکینہ بہنیں جان پڑتی ہیں " یہ سوچتے ہوئے خداداد خاں نے صافہ کھول کر پھر نئے سرے سے باندھا -

" تیز چلو تانگی " اُس نے تانگہ والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا - پہلوانی ڈیل ڈول والے چھاچھی تانگہ بان نے مڑ کر خداداد خاں کی طرف دیکھا -

اور پھر باگ ڈھیلی کر دی۔

گھوڑا دُلکی چلنے لگا۔

"چابک لگاؤ تانگی" خداداد خاں نے بے تاب ہو کر کہا۔

تانگہ بان نے نشست سے اُٹھ کر چابک ہوا میں گھمایا۔ تڑاخ تڑاخ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گھوڑے کی دُم میں تناؤ پیدا ہُوا اور پھر وہ کنوتیاں بدل کر سرپٹ بھاگ پڑا۔ ٹاپوں کی کٹ کٹ فضا میں گونجنے لگی۔ گھوڑے کے پاؤں میں جڑے ہوئے نعل تارکول کی سڑک کا سینہ کوٹ کوٹ کر چنگاریاں پیدا کرنے لگے۔ گھوڑے کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھرو بج بج کر راہگیروں کو خبردار کرنے لگے۔

اوجڑیاں کے قریب پہنچ کر تانگہ والے نے باگ کھینچ لی۔ پسینے میں شرابور، ہانپتے ہوئے گھوڑے نے کچھ دیر دم لے کر چوبچہ سے پانی پیا اور پھر تازہ دم ہو کر سڑک پر دوڑنے لگا۔ سڑک کے دائیں جانب ایک زیارت پڑتی تھی۔ جس کے آنگن میں بیٹھے ہوئے مجاور نے تانگہ دیکھ کر نوبت بجائی۔ خداداد خاں نے چوّنی ہوا میں اُچھال کر مجاور کی طرف پھینک دی۔

نُورپور پہنچتے ہی خداداد خاں اُچک کر تانگے سے نیچے اُترا۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے کی ریشم جیسی ایال پہ ہاتھ پھیرا، اُس کی گردن تھپتھپائی۔ تین روپے تانگے والے کی ہتھیلی پر رکھ کر اپنی مونچھوں کو دو چار تاؤ دیئے۔ پکّی سڑک کی آخری بلندی پر رُک کر اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کائنات کے ذرّے ذرّے نے ایک نیا روپ دھار لیا۔ ہر شے حسین نظر آنے لگی۔ سنبلوں سے لدی ہوئی پہاڑیاں مُسکرا اُٹھیں۔ گول گول پتھروں سے ٹکراتا ہوا ندی کا صاف و شفاف پانی میٹھے میٹھے گیت گانے لگا۔ اُس نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ڈھلوان راستہ طے کیا۔ ندی کے اُس پار پہنچ کر وہ پگڈنڈی پہ ہو لیا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ آج اُس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو برآئی تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہ جھٹ پہنچیاں واسکٹ کی جیب سے نکال کر فریداں کی کلائیوں میں پہنا دے گا۔ آج فریداں کی فرمائش پوری ہو جائے گی۔ یک بیک پہنچیاں دیکھ کر فریداں کا دل دھک دھک کرنے لگے گا۔ اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئیں گے۔ سارے نُورپور میں یہ دوسرا پہنچیوں کا جوڑا ہوگا۔ پہلا نمبردار کے بیٹے کی دُلہن کا تھا اور اب دوسرا فریداں کی کلائیوں میں ہوگا۔

"ابّا جی یہ سُرخ کاغذ میں کیا ہے؟" دفعتہً ایک آواز آئی۔

خداداد خاں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ سکینہ دو خالی گھڑے سر پر اُٹھائے ہوئے بیچ راستے میں کھڑی تھی۔

"ابّا جی یہ سُرخ کاغذ میں کیا ہے؟" قریب آ کر سکینہ نے کالی واسکٹ کی جیب سے باہر نکلے ہوئے سُرخ ٹشو پیپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ پُوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں"۔ خداداد خاں نے سُرخ ٹشو پیپر کو جیب کے اندر کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کچھ تو ہے ابّا جی" سکینہ نے گھڑے زمین پر رکھ دیئے۔

"اچھا تو پہلے تم پانی بھر لاؤ پھر گھر آ کر دیکھنا کہ اِس کاغذ میں کیا ہے"۔ خداداد خاں نے دایاں ہاتھ جیب پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"اوں ہونہہ" سکینہ نے دائیں بائیں سر جھٹک کر ضد کی۔

"دیکھو بیٹا"۔

"نہیں ابّا جی، میں ابھی، یہیں دیکھوں گی کہ اِس سُرخ کاغذ میں کیا ہے" سکینہ نے بات کاٹ کر کہا اور پھر جھٹ ایک ہاتھ کالی واسکٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔

"سکینہ!" خداداد خاں یہ کہتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ابا جی" بچی چل گئی۔

"تم بڑی ضدی ہو" باپ نے جیب پر رکھا ہوا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"بابل" سکینہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور پھر گھڑے وہیں چھوڑ کر پہنچیاں ہاتھوں میں لئے گھر کی طرف بھاگ پڑی۔ گلے میں منقش والی کالی چنری ڈالے سکینہ پگڈنڈی پر دوڑتی چلی جارہی تھی۔ خداداد خاں کی محبت بھری آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں حتیٰ کہ وہ ایک پہاڑی کے دامن کو چھوتی ہوئی لوکاٹ اور شہتوت کے پیڑوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ خداداد خاں خالی گھڑے ہاتھوں میں لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ کہیں دور کوئی چرواہا بانسری پر مرزا صاحباں کے بول الاپ رہا تھا۔ جنگلی کبوتر ہوا میں اڑانیں بھر رہے تھے۔ آگ کی خود رو جھاڑیوں کے سائے مشرق کی طرف پھیل رہے تھے۔

جب خداداد خاں نے اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو پلنگڑی پر بیٹھی ہوئی سکینہ نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیئے۔ اس کی بھری بھری کلائیوں کو پہنچیوں نے نکھار دیا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ پہنچیوں کے چمکتے ہوئے ننھے ننھے طلائی گنبدوں نے اس کی کلائیوں میں اک نئی آب و تاب پیدا کر دی تھی۔ جیسے کسی برفانی چوٹی کے بلوریں ماتھے پر یک بیک سورج چمک پڑے۔ سکینہ ایک معصومانہ شوخی کے ساتھ سر کو دائیں بائیں جھٹکتی ہوئی پلنگڑی پر یوں اچھلنے لگی جیسے دلکی چلتی ہوئی گھوڑی پر سوار ہو۔ اس کے پہلو میں اس کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کی ممتا بھری آنکھوں سے سچ مچ خوشی کے آنسو نکل رہے تھے۔

حاجی پور گوجراں

منظور الٰہی

پہاڑوں کے سائے میں بہتا ہوا شرمیلا چشمہ ڈوبتے سورج کی لالی سے زرنگار ہے، سرمئی بادلوں کے کنارے خون سے رنگے ہوئے دکھ رہے ہیں۔ بھیڑوں کے ریوڑ گھر کی جانب رواں ہیں، گندم کی فصلیں اٹھان پر ہیں۔ ہری بھری کھیتوں پر جیسے تا حدِ نظر مخملیں فرش بچھ رہا ہو اطراف میں آموں کے باغ رہ رہ کر جھومے جا رہے ہیں، یہ لطیف منظر یہ روح پرور موسم ——— کون کہہ سکتا ہے کہ دو ماہ ہوئے دھرتی کے سینے کو چیرتا ہوا سیلاب اسی راہ سے گزرا تھا، گہرے زخم کھا کے بھی زندگی رواں دواں رہتی ہے، گھاؤ مندمل ہو جاتے ہیں، زندگی کا دھارا جانے بوجھے رستے بہتا رہتا ہے۔

شکستہ حال دہقان ریلیف لے کر جا چکے، حرماں نصیب مائیں، غلیظ بچوں کو گود میں اٹھانے والی مائیں کپڑے اور رضائیاں لے چکیں، حاجت مندوں کا ہجوم غفیر چھٹ گیا، ھل من مزید کی صدائیں اب خاموش ہیں، لیکن خیالات کا ریلا رہ رہ کر ذہن کے دریچوں پر دستک دیتا ہے، خدا کے بندوں پر نت نئی آفت کیوں ہے؟ لوگ کیوں نانِ شبینہ اور دو کپڑوں کے لئے محتاج ہو جاتے ہیں؟

حاجی پور گوجراں

ایک خواب، ایک افسانہ، ایک آنسو،

برسوں بعد جب گاؤں کے بوڑھے اپنے اجڑنے کا قصہ چھیڑیں گے تو ان کی پلکوں پر ستارے تھرتھرائیں گے اور بھرائی ہوئی آواز ان کے گلے میں اٹک جائے گی، اس وحشتناک خواب کو لفظوں میں پرونا دل گردے کا کام ہوگا — شام تک دریا کا کنارا تھا لہلہاتی کھیتیاں تھیں اور مہکتے ہوئے بچے، مسکراہٹیں تھیں اور اپنی دنیا میں مگن دہقان، لیکن راتوں رات یہ ہنستی ہوئی بستی بپھرے ہوئے طوفان کی آغوش میں تھی۔ موضع اور دریا کا حجاب اٹھ چکا تھا۔ پانی اور زمین کی تمیز مٹ چکی تھی، پختہ مکان گڑیا کے گھروندے بن گئے اور کڑیل جوان اک پر کاہ، تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی کہ مجھ سے بچ نکلو تو جانوں۔

"میرے سرتاج مجھے نہیں لے جاؤ گے، مجھ سے خفا ہو گیا؟" اُس نے خط میں دلبرانہ گلہ کیا تھا، اُسے میکے آئے دو ماہ ہو گئے تھے، ماسٹر خیردین کا آبائی مکان حاجی پور میں تھا۔ وہاں سے دو میل ایک دیہات میں وہ پڑھاتا تھا اور وہیں چھوٹے ڈاکخانے کا پوسٹ ماسٹر بھی تھا، نہیں جان! میں خفا نہیں۔ میں دُنیا کے دھندوں میں لگا تھا، سکول کا کام، مکان کی مرمّت، اب میں اپنی دُلہن کو لے جاؤں گا۔ میرا سنسان گھر پھر آباد ہو جائے گا، ننّو کے نقرئی قہقہوں سے گوشہ گوشہ جگمگا اُٹھے گا، لیکن تو نہیں جانتی سُہاگ کی رات قیامت خیز ہو گی۔

خوشی کے شادیانے بجے، گھر آباد ہو گیا لیکن یہ مسرّت گریز پا تھی، ماسٹر خیردین اپنی بیٹھک کی چھت سے سیلاب کی ہولناکیوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ایک درخت بہتا ہوا آیا اور چھت کو ریزہ ریزہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا،

وہ عہدِ پارینہ کی ہندو استری نہ تھی جس سے خاوند کی چتا پر جل مرنے کی توقع کی جائے نہ ہی ازمنۂ وسطیٰ کی راجپوتنی جس کے لیے سومنبر منا گزر ہو، اُس نے ایک دیہاتن کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ مگر جان کی بازی لگاتے وقت اکلوتی بچی کی محبت بھی اُس کے قدم متزلزل نہ کر سکی۔ ہونے کا "نام" اُستار کر اپنی نند کو دیا کہ جب بڑی ہو ننّو کو میری نشانی دے دینا، میں وہیں جاتی ہوں جہاں میرا سرتاج گیا۔ یہ کہہ کر وہ مہرووفا کی پتلی اتھاہ پانی کی پہنائیوں میں گم ہو گئی۔

اپنا بیگانہ نہ ہو گا جب کہ پاس   لوگ جس کو کہتے ہیں جلوے کی رات
میں کنول بن کے کھلوں گی رات میں   اپنے مالک سے ملوں گی رات میں

"لالو اُس بہتی ہوئی عورت کو تم ہی بچا سکتے ہو"۔ "اچھا تو میں چلا" ـــ لالو کی مسیں بھیگ رہی تھیں، حاجی پور کا مشہور پیراک، لالو کوندے کی طرح لپکا، طوفانوں کو زیر کرتا لہروں کے تھپیڑے کھاتا وہ بہتی ہوئی عورت تک جا پہنچا اور اُسے اچھال کر ایک درخت پر دے مارا۔

"پھر کیا ہوا؟"

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اِک شعلۂ پُرپیچ و تاب
شمع تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

پانی نے ایک دفعہ اُچھال کر اُسے بلند کیا اور وہ ہمیشہ کے لئے آنکھ سے اوجھل ہو گیا، لالو تو ہمیشہ سربلند رہے گا، تو اَمر ہے۔

"کوئی گرم کپڑا دے جائے سَو روپیہ دونگا"۔ اُس کی آواز کرب سے بھرپور تھی، بچّوں کو دو روز کا فاقہ تھا، اُس کا مختصر خاندان تھا اور مکان کا کھنڈر، روشن نے سوچا چند گز کا فاصلہ ہے میں جا کر آگ ہی لے آؤں، یہ فاصلہ پاٹ لینا کوئی ایسی بات نہیں لیکن اُس کا اندازہ غلط نکلا اور تیز دھارا اُسے بہا لے گیا، اُس نے آم کے درخت پر پناہ ڈھونڈی تھی، آم کا درخت کچھ ایسا دُور بھی نہیں تھا لیکن درخت اور اُجڑی بستی کے مابین ایک سمندر حائل تھا، ارض و سما کا بُعد، زندگی اور موت کی تفاوت،

اندھیرا ہو چکا تھا، سردی بڑھ رہی تھی، روشن تھا اور آم کا درخت جس کی ٹہنی پر وہ گھنٹوں اکڑوں بیٹھا رہا، چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ "خُدا کے لئے کوئی گرم کپڑا دے جاؤ"۔ اُس کی درد انگیز چیخیں عزیزوں کے دل پر آہنی ہتھوڑے کی طرح لگتیں۔ لیکن وہ بے بس تھے، کوئی بے پایاں پانی میں اُترنے کی جرأت نہ کر سکا۔ وہ ننگا دھڑنگا درخت پر ٹھٹھرتا رہا اور سردی کی تاب نہ لا کر بالآخر دھڑام سے نیچے آ رہا پختہ ثمر کی طرح، جیسے اُس کا گرنا لابدی تھا، ایک قدرتی تقاضہ کی تکمیل۔

حاجی پور گوجراں حسرت و یاس کا مرقع ہے! بڑ کا قدیم تناور درخت سربسجود ہے، اُس کی جڑیں ان گنت ناگوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر رہ گئی ہیں، شکستہ مسجد کے سہارے اُس کی قدامت اور ثابت قدمی کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور کھوکھلی جڑیں جیسے مُنہ چڑا رہی ہوں، یا اُس کی میت پر ماتم کر رہی ہوں۔

کوہِ ویسوویس کی چوٹی جب گرم لاوا اُگلنے لگی تو پومپیائی کے عالیشان محل اور حسین معبد نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ EXCAVATORS نے صدیوں پرانی راکھ جھاڑ دی، آج پومپیائی کے کھنڈرات عظمتِ پارینہ کی یاد دلاتے ہیں، حاجی پور گوجراں کا نام تاریخ میں جگہ نہیں پائے گا نہ ہی ہمیں صدیوں کا جما ہوا تہہ بہ تہہ غازہ جھاڑنے کی ضرورت ہو گی۔ سہ روزہ سیلاب نے اِس دیہات کو ایک وسیع قبرستان میں تبدیل کر دیا ہے، کتے بھونک رہے ہیں۔ مکانوں کی چھتیں زمین میں دھنس گئی ہیں۔ اور غموں سے نڈھال دہقان مٹی کھود کے اپنی چھتوں کی شہتیریاں تلاش کر رہے ہیں۔

گاؤں کے لوگ بڑے صاحب کی آمد پر میدان میں جمع ہو گئے تھے۔ بڑے صاحب خود یاس کی تصویر تھے، سوچتے تھے اس آفت رسیدہ مجمع کو کیا کہیں کیا نہ کہیں، اِس گاؤں نے سیلاب میں بہاسی جانوں کا بلیدان دیا تھا، اشک شوئی بے سود تھی اور وعظ طنز سے بدتر۔ دفعتاً ایک جوان نے للکار کر کہا "ہم دریا کے کنارے رہنے والے دریا کا مقابلہ کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئے تھے، ہم کئی بار اُجڑے اور کئی بار بسے، ہم نے دریا کے طمانچے کھائے اور ہمت نہ ہاری، اگر آج بھی ہماری مزروعہ زمین بچ رہتی تو ہم یہ اُجڑی بستی بسا کے دکھلاتے لیکن کیا کریں زمین دریا کی نذر ہو گئی اور اب .....

"ہمیں کہیں بھجوا دیں ہم پھر اپنے گاؤں کی بنا ڈالیں گے۔" پسِ منظر میں بازوؤں کی مچھلیاں اُبھریں اور کُشادہ سینے غرور سے تن گئے اُس جوان کا مقام کتنا بلند تھا، بڑے صاحب کی نظریں زمین میں گڑ گئیں جیسے اُس شجیع کو خراج ادا کر رہی ہوں۔

نئی کتابیں

فکر و نظر انسانی ارتقاء کی بنیاد ہے اور اسی لئے کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم کی میراث نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس خاک دانِ فطرت میں جتنے تمدن ظہور پذیر ہوئے ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو سابق و لاحق سے بے نیاز رہ کر پنپ سکا ہو جس نے اپنے پیش رو تمدن کے فکری سرمایہ سے استفادہ نہ کیا ہو اور اس میں اپنی ہمت اور سوجھ بوجھ کے مطابق اضافہ کر کے اپنے بعد آنے والے تمدن کے حوالے نہ کر دیا ہو۔ انسانیت کی پوری تاریخ اسی لین دین اور اسی قبول و عطا کی ایک مسلسل کہانی ہے جس کا سلسلہ اگر کہیں بیچ میں ٹوٹ جاتا تو غاروں میں رہنے بسنے والا انسان آج ہوائی جہازوں میں اڑتا نظر نہ آتا اور وحوش و بہائم کے خوف سے لرزہ براندام مخلوق تسخیر کائنات کی دھن میں آج ایٹم کی ایجاد کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکتی۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ دوسری قوموں کے ذہنی کارناموں کو اپنی زبان میں منتقل کر کے اسے دامن دار بنائیں اور اپنی قوم کے لئے فکر و نظر کی نئی نئی راہیں کھولیں۔ اس سلسلہ میں آج ہم جن دو کتابوں پر گفتگو کرنے والے ہیں وہ درحقیقت ایک خاص نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی مالک ہیں اور اس قابل بھی کہ اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات انہیں شوق و توجہ سے پڑھیں، ان میں پہلی کتاب "حکمتِ قرآن" ہے جو دراصل ترکیہ کے ایک صاحب السیف والقلم جرنیل محمود مختار پاشا مرحوم کی قابل قدر تالیف WISDOM OF THE QURAN کے مقدمہ کا ترجمہ ہے۔ مؤلف علّام ترکیہ کے ایک ممتاز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ "علومِ جدیدہ" و "انکشافاتِ حاضرہ" کی مادہ پرستانہ فضا میں رہ کر بھی ان کے دینی و اخلاقی تصورات وقت کے غالب اثرات سے محفوظ رہے۔ اس مقدمہ میں جس کا ترجمہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے، صاحبِ تالیف نے اپنے گراں قدر افکار بڑے دل نشیں اسلوب میں سپردِ قلم کئے ہیں اور قرآن پاک کے آیات و مطالب نئی ترتیب و تدوین کے ساتھ اس طرح ہمارے سامنے پیش کر دئے ہیں کہ اسلامی تعلیمات اور اسلام کا نظامِ اخلاق کما حقہ زیر بحث آ جاتا ہے اور ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں رہتی کہ اسلام محض ذہن و فکر ہی کے لئے سامانِ تسکین نہیں، عملی طور پر بھی اپنے اندر اتنی وسعتیں رکھتا ہے کہ دنیا کا اور کوئی نظام اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔ جزوی طور پر ممکن ہے کہ مصنف کے نظریات سے اختلاف کا پہلو نکل آئے لیکن بحیثیت مجموعی ان کی یہ کوشش عالمانہ و مخلصانہ ہے اور اس لئے ہم سب کے شکریہ و قدر افزائی کی مستحق! اس کا ترجمہ صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم نے کیا ہے جو ہمارے ملک کے خوش فکر شعراء کی صفِ اول میں شمار کئے جاتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ ترجمہ سلیس، رواں اور معنی خیز ہونا ہی چاہئے ——— اور ہے!

دوسری کتاب ڈاکٹر صبحی محمصانی کی تالیف "فلسفۃ التشریع فی الاسلام" کا ترجمہ ہے۔ صاحب موصوف دورِ حاضر کے مشہور ماہرِ قانون ہیں اور اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نفسِ قانون پر بالعموم اور اسلامی قانون پر بالخصوص بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنی اس تالیف میں انہوں نے جہاں اسلامی فقہ کا تاریخی جائزہ لیا ہے وہاں قانونی امور کے اکثر پہلوؤں کی توجیہہ و تعلیل اور ان پر فلسفیانہ اسلوب میں تبصرہ بھی کیا ہے۔

کتاب پانچ مفید ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں متعلقہ مسائل پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس دور میں کہ اسلامی قانون کو جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مقابلہ میں ناقص سمجھ کر نظر انداز کرنا گویا فیشن میں داخل ہو گیا ہے، یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کا ترجمہ مولوی محمد احمد صاحب رضوی نے کیا ہے اور سلیقہ کے ساتھ کیا ہے۔

یہ دونوں کتابیں بانگِ درا سائز کے علی الترتیب ۱۴۷ اور ۳۲۶ صفحات پر مشتمل ہیں اور اردو ٹائپ میں خوبصورت چھاپی گئی ہیں۔ مجلس ترقی ادب نرسنگھ داس گارڈن۔ کلب روڈ، لاہور سے طلب کی جا سکتی ہیں۔


فوراً جھاگ دینے والا سن لائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اُجلے دھوتا ہے
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن
کپڑا بچاتا ہے • محنت بچاتا ہے • پیسہ بچاتا ہے


"بالکل سفید، بالکل خالص لکس ٹائیلٹ صابن
کے استعمال سے یہ تازگی محسوس ہوتی ہے"
مینا شوری کہتی ہے
خالص و سفید لکس ٹائیلٹ صابن کو، جو
کہ بالائی دار جھاگ سے مالامال اور تازہ پھول کی
طرح خوشبودار ہوتا ہے، پاکستان کی حسین عورتیں
اپنے حُسن کی خاطر روزانہ استعمال کرتی ہیں۔
LUX
TOILET SOAP
LUX
TOILET SOAP
لکس ٹائیلٹ صابن
فلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن


آپ کو ہر روز گندگی کے جراثیم
سے بیماری کا خطرہ
رہتا ہے
لائف بوائے سے ان جراثیم کو اپنے
جسم سے دھو کر ہر روز اپنی حفاظت
کیجئے
لائف بوائے کا
محافظ جھاگ آپکی تندرستی
کی حفاظت کرتا
ہے
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے
آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP


دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
کیڈل★ آمیز رکسونا
سے اپنے اصلی حُسن کو
نکھرنے دیجیے
رکسونا کے کیڈل سے مالامال جھاگ کو اپنی جلد پر نرمی سے ملیے
اور پھر دھو ڈالیے، پھر دیکھیے، آپ کی جلد دِن بدِن نرم
اور ملائم ہوتی جائے گی جس سے آپ کا حُسن درخشاں
ہو جائے گا۔
★ جلد کو ملائم کرنے اور
مقوی جڑی بوٹیوں کے ایک
خاص مرکب کا تجارتی نام ہے
رکسونا
کیڈل آمیز واحد صابن

مدیر نقوش کے اسکیچوں کا مجموعہ ' جو وقتاً فوقتاً نقوش میں چھپے - انہیں ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے - اب یہ اسکیچ نقوش میں چھپنے والے اسکیچوں سے بڑی حد تک مختلف ہیں - اس لئے کہ ان میں ضروری باتیں بڑھائی گئی ہیں اور غیر ضروری حذف کر دی گئی ہیں ــــ اور اس میں ایک غیر مطبوعہ مضمون بھی شامل ہے -



صاحب کے چند مطبوعہ اجزا دیکھ کر بڑا لطف آیا - یہ صرف "چہرہ نمائی" نہیں بلکہ گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی ہے - جس میں پطرس کا مزاح ' شا کا نشتر آسکر وائلڈ کا PARADOX اور چسٹرٹن کی چٹکیاں سبھی کچھ موجود ہے -

نیاز فتحپوری